اصلاحی مواعظ

حضرت مولانا محمد یوسف لدھیانوی شہید رحمہ اللہ تعالیٰ

قرابت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا فائدہ
مہاجرینؓ وانصارؓ کی فضیلت
خواجہ معین الدین چشتیؒ
آداب تعلیم وتربیت
جھگڑے کے اسباب
صبر، تمام مسائل کا علاج ہے
جھوٹی گواہی، بدترین سود اور شرک
ظلم وستم اور حرص کے نقصانات
کمزور اور مظلوم کی مدد کرنا
عذاب الٰہی سے بچاؤ کی صورت

جلد ششم

مکتبہ لدھیانوی

اصلاحی مواعظ

شہیدِ اسلام

حضرت مولانا محمد یوسف لدھیانوی نور اللہ مرقدہ

باہتمام : محمد طلحہ طاہر

نبیرہ شہیدِ اسلام حضرت مولانا محمد یوسف لدھیانوی نور اللہ مرقدہ

ناشر

مکتبہ لدھیانوی

سلام کتب مارکیٹ بنوری ٹاؤن کراچی

03212115502

اصلاحی مواعظ

تالیف: شہیدِ اسلام حضرت مولانا محمد یوسف لدھیانویؒ

بسم اللہ الرحمن الرحیم
الحمد للہ وسلام علی عبادہ الذین اصطفی!

ہمارے دادا جان شہیدِ اسلام حضرت مولانا محمد یوسف لدھیانوی نور اللہ مرقدہ جہاں تصنیف و تالیف اور تحریر و انشاء کے امام تھے وہاں اللہ تعالیٰ نے آپؒ کو وعظ وتقریر اور زبان و بیان کے میدان میں بھی غیر معمولی صلاحیتوں سے نوازا تھا، آپؒ کے مواعظ و بیانات نہایت سادہ، موثر، عام فہم اور مسحور کن ہوتے تھے۔ اندازِ بیان میں ناصحانہ و مشفقانہ رنگ غالب ہوتا، مسلمانوں کی خیرخواہی کے جذبہ سے سرشار اور دل کی گہرائیوں سے نکلنے والے وہ موثر مواعظ و بیانات جن سے ہزاروں لوگوں کی زندگیوں میں انقلاب برپا ہوا، انہیں کیسٹ میں محفوظ کرلیا گیا تھا جسے بعد میں ڈیجیٹائز کیا گیا۔ جو کہ ''شہیدِ اسلام پورٹل'' کے پلیٹ فارم پر دستیاب ہیں۔ ان میں سے تقریباً ۱۳۵ کیسٹوں سے ۸ ضخیم جلدیں ''اصلاحی مواعظ'' کے نام سے مرتب کی گئیں۔ جن میں تخریج کے ساتھ ساتھ قرآنی آیات اور احادیثِ مبارکہ پر اعراب کا خاص اہتمام کیا گیا ہے۔ اس طرح آٹھ جلدوں پر مشتمل یہ خوبصورت گلدستہ تیار ہوگیا ہے جو کہ علماء، طلبا، خطبا، مقررین، واعظین اور عوام الناس کے لیے بیش بہا خزانہ ہے۔

حضرت شہیدِ اسلامؒ کی دیگر تصانیف کی طرح ''اصلاحی مواعظ'' (آٹھ جلدوں) پر مشتمل اس گلدستے کو بھی ''شہیدِ اسلام پورٹل'' کے پلیٹ فارم سے عام کرنے پر ہم

اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے حضور سر بسجود ہیں۔ اللہ تعالیٰ اس کو شرفِ قبولیت عطا فرمائے، ہمارے اکابر کے علوم و فیوض کو عام فرمائے ، خلقِ خدا کے لیے نافع اور ہمارے اکابرین کے لیے صدقہ جاریہ بنائے۔آمین

جن حضرات کی دعاؤں،توجہات اور سرپرستی سے اس اہم کام کی تکمیل ہو پائی،میں ان کا بے حد شکرگزار ہوں،خصوصاً میرے والد ماجد مولانا حافظ محمد سعید لدھیانوی دامت برکاتہم ،شاہینِ ختمِ نبوت حضرت مولانا اللہ وسایا دامت برکاتہم اور شیخ ڈاکٹر ولی خان المظفر حفظہ اللہ، جن کی بھرپور سرپرستی حاصل رہی۔اللہ تعالیٰ ان کے علم وعمر میں برکت عطا فرمائے اور صحت و عافیت کے ساتھ اپنے حفظ و امان میں رکھے۔اسی طرح حافظ محمد طلحہ طاہر (ناظم مکتبہ لدھیانوی) جناب امجد رحیم چوہدری سمیت تمام معاونین کہ جن کا کسی بھی طرح تعاون حاصل رہا،تہہ دل سے شکرگزار ہوں۔اللہ سبحانہ وتعالیٰ ہم سب کو اپنی رضا و رضوان سے نوازے۔آمین

محمد الیاس لدھیانوی
بانی ومنتظم ”شہیدِ اسلام پورٹل“
www.shaheedeislam.com
info@shaheedeislam.com
+92 321 9264592
۱۵/۹/۱۴۴۷ھ - ۵/۳/۲۰۲۶ء

نوٹ: Mobile اور iPad وغیرہ میں بہتر طور پر دیکھنے کے لیے Adobe Acrobat کو PDF Reader کے طور پر استعمال کریں۔

پیش لفظ

بسم اللہ الرحمن الرحیم
الحمدللہ وسلام علی عبادہ الذین اصطفیٰ!

۱۳ر صفر ۱۴۲۱ھ مطابق ۱۸ر مئی ۲۰۰۰ء کی گرم دوپہر بظاہر ہمارے لئے نہایت مایوس کن اور خزاں رسیدہ تھی، اس دن ہمارے ابرِ گوہر بار، شجرِ سایہ دار، مشفق و مربی حضرت اقدس حکیم العصر مولانا محمد یوسف لدھیانویؒ ہم سب کو اس دنیا کے لق ودق صحرا میں یکہ وتنہا چھوڑ کر عالم بالا کو تشریف لے گئے تھے۔ اس دن ایسا محسوس ہوا کہ اب ہم سے کوئی کام نہیں ہوسکے گا اور حضرتؒ کے علوم و معارف کی امانت کی اشاعت وترویج اور تدوین و تحقیق کا کام معرضِ التوا میں پڑجائے گا۔ ہم پریشان تھے کہ اس راہ کی مشکلات کا حل کس سے پوچھیں گے؟ ہماری راہ نمائی کون کرے گا؟ ہم اپنے مسائل کس کے سامنے پیش کریں گے؟ اور آئندہ کے منصوبوں کی تکمیل کیونکر ہوگی؟ لیکن حضرت جی مولانا محمد یوسف دہلویؒ کے ارشاد: ''لینے والا ہاتھ بدلا ہے، دینے والا تو وہی ہے!'' کے مصداق دینے والے نے اپنے فضل وکرم اور منت و احسان میں کوئی کمی نہیں آنے دی۔

بلاشبہ یہ ہمارے حضرت شہیدؒ کی کرامت اور مقبولیت عنداللہ کی علامت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرتؒ کی لاج رکھی اور ہم ایسے ضعفأ اور جہلائے مطلق خدام کی

ایسی دستگیری فرمائی کہ اس نے حضرتؒ کے جاری فرمودہ تمام امور میں ہماری بھرپور مدد فرمائی، بلا کسی ایک لمحہ کے تعطل کے وہ سارے کام ٹھیک اسی طرح چلائے رکھنے کی توفیق عطا فرمائی، جس طرح حضرتؒ کی حیاتِ مبارکہ میں چل رہے تھے۔ چنانچہ یہ محض اسی ذاتِ کبریا کا فضل وکرم ہے کہ آج ہم اپنے حضرت شہیدؒ کی روح کے سامنے شرمندہ ہونے کے بجائے، بحمداللہ سرخرو ہیں، اور آپ کی دوسری تصانیف کی اشاعت و ترویج کے ساتھ ساتھ آپ کے اصلاحی مواعظ کی جلد ششم کی تکمیل کی سعادت بھی حاصل کر رہے ہیں۔ حضرتؒ کی حیات میں اگرچہ اس سلسلہ کی صرف جلد اول ہی معرضِ وجود میں آسکی تھی، لیکن آج اس کی چھٹی جلد ٹھیک اسی آب و تاب اور معیاری تحقیق وتخریج کے ساتھ قارئین کے ہاتھوں میں ہے، جس کی بنیاد حضرت شہیدؒ نے رکھی تھی۔

نہایت بے انصافی اور بخل ہوگا اگر میں اپنے رفیقِ کار برادرِ عزیز مولانا محمد اعجاز صاحب کی شبانہ روز محنت اور انتھک کوشش کا تذکرہ نہ کروں، جنہوں نے اصلاحی مواعظ کی تحقیق وتخریج میں میرے دست و بازو کا کردار ادا کیا۔ اسی طرح بھائی عبداللطیف طاہر صاحب اور عزیز حافظ عتیق الرحمٰن لدھیانوی صاحب کا تعاون بھی قابل ذکر ہے، جنہوں نے اس کی تصحیح، پیسٹنگ اور طباعت کے مراحل کو نہایت خوش اسلوبی سے نبھایا۔

اللہ تعالیٰ کی بارگاہِ عالی میں درخواست ہے کہ وہ ہماری اس ناچیز سعی وکوشش کو قبول فرماکر ہماری مغفرت ونجات، قارئین کی ہدایت وراہ نمائی اور ہمارے حضرت شہیدؒ کی بلندیٔ درجات کا ذریعہ بنائے، آمین!

خاکپائے حضرت لدھیانوی شہیدؒ

سعید احمد جلال پوری

۲۷/۸/۱۴۲۴ھ

فہرست مقالات

تفصیلی فہرست

قرابت نبوی ﷺ کا فائدہ

خلفائے اربعہ کا انتخاب اور عدل و انصاف

مہاجرینؓ و انصارؓ کی فضیلت

مؤمن کی صفات، یعنی اصلاحِ نفس و اصلاح کے زریں اصول

فرائض کی ادائیگی

معاشرہ کی اچھائی اور برائی کا معیار

آدابِ تعلیم وتربیت

قلوب کی اقسام

جھگڑے کے اسباب

”صبر“ تمام مسائل کا علاج ہے

جھوٹی گواہی، بدترین سود اور شرک

مسلمان کی عزت وحرمت

ظلم وستم وحرص کے نقصانات

کمزور اور مظلوم کی مدد کرنا

عذابِ الٰہی سے بچاؤ کی صورت

قرابتِ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فائدہ

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے کہ:

''اللہ سے محبت رکھو، اس لئے کہ وہ تم کو غذا دیتا ہے، اور مجھ سے محبت رکھو اللہ کی محبت کی وجہ سے (کیونکہ میں اللہ کا رسول ہوں)۔''

یہاں پر یہ بات بھی ذہن میں رکھنی چاہئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے احسان کا حوالہ نہیں دیا، حالانکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ عالی کے ہم پر بے شمار احسانات ہیں، لیکن اپنی محبت کے لئے اللہ کی محبت کا حوالہ دیا۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم
الحمدللہ وسلام علی عبادہ الذین اصطفی!

”عَنْ اَبِیْ سَعِیْدٍ الْخُدْرِیِّ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ قَالَ: سَمِعْتُ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَقُوْلُ عَلَی الْمِنْبَرِ: مَا بَالُ رِجَالٍ یَقُوْلُوْنَ اَنَّ رِحْمَ رَسُوْلِ اللّٰہِ لَا تَنْفَعُ قَوْمَہٗ، بَلٰی وَاللّٰہِ! اِنَّ رِحْمِیْ مَوْصُوْلَۃٌ فِی الدُّنْیَا وَالْآخِرَۃِ، وَاِنِّیْ اَیُّھَا النَّاسُ فَرَطٌ لَّکُمْ عَلَی الْحَوْضِ فَاِذَا جِئْتُمْ قَالَ رَجُلٌ: یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ! اَنَا فُلَانُ بْنُ فُلَانٍ، وَقَالَ اَخُوْہُ: اَنَا فُلَانُ بْنُ فُلَانٍ، قَالَ لَھُمْ: اَمَّا النَّسَبُ فَقَدْ عَرَفْتُہٗ وَلٰکِنَّکُمْ اَحْدَثْتُمْ بَعْدِیْ وَارْتَدَدْتُّمُ الْقَھْقَرٰی۔“ (مسند احمد ج:۳ ص:۱۸)

ترجمہ:......”حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس منبر پر یہ فرماتے ہوئے سنا کہ: کیا حال ہے ان لوگوں کا جو یہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا رشتہ قیامت کے دن نفع نہیں

دے گا، کیوں نہیں؟ اللہ کی قسم! بے شک میرا رشتہ ابد تک ملایا گیا ہے، دنیا میں اور آخرت میں، اور بے شک میں اے لوگو! تمہارا پیشوا ہونگا قیامت کے دن حوض پر، اور بے شک جب تم آؤ گے، ایک آدمی کہے گا: یا رسول اللہ! میں فلاں بن فلاں ہوں، اور دوسرا کہے گا: میں فلاں بن فلاں ہوں۔ میں کہوں گا کہ نسب کو تو میں جانتا ہوں، لیکن تم نے میرے بعد نئی نئی باتیں ایجاد کیں اور تم الٹے پاؤں لوٹ گئے تھے۔“

یہ مسند احمد کی روایت ہے، اس حدیث شریف میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا خطبہ ذکر کیا گیا ہے، اور اس میں دو مضمون ہیں۔

دنیا و آخرت میں آپ ﷺ کا رشتہ کام آئے گا:

پہلا مضمون: یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ اطلاع پہنچی کہ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا رشتہ قیامت کے دن کام نہیں دے گا۔ اس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خطبہ ارشاد فرمایا اور فرمایا کہ: کیا بات ہے کہ بعض لوگ یوں باتیں کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا رشتہ قیامت کے دن کام نہیں دے گا۔ حالانکہ میرا رشتہ دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی ملایا گیا ہے۔ جس کو ہم ”صلہ رحمی“ کہتے ہیں۔

”رحم“ کہتے ہیں رشتہ کو، اور ”صلہ“ کے معنی ہیں ملانا، رشتہ کو جوڑنا، یا یہ کہ رشتہ کی رعایت کرنا، اس کے حقوق بجا لانا، اس کو ”صلہ رحمی“ کہتے ہیں، تو مطلب یہ ہوا کہ میرے رشتے کے حقوق کی دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی رعایت رکھی جائے گی اور ان کو بجا لایا جائے گا۔

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے رشتہ کے کام نہ آنے کا مطلب:

جن حضرات نے یہ کہا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا رشتہ قیامت کے دن کام نہیں دے گا، ان کی بات اپنے اعتبار سے ٹھیک تھی، چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صفا پر خطبہ ارشاد فرمایا تھا جس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو دعوت دی تھی، اور اس میں فرمایا تھا کہ: ”لَا أُغْنِیْ عَنْكُمْ مِنَ اللّٰہِ شَیْئًا۔“ یعنی میں قیامت کے دن تمہارے کوئی کام نہیں آؤں گا، اور اپنی پھوپھی حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا تھا کہ: ”اے صفیہ بنت عبدالمطلب! قیامت کے دن میں تیرے کام نہیں آؤں گا۔“

حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا تھا کہ:

”وَیَا فَاطِمَةَ بِنْتَ مُحَمَّدٍ! سَلِیْنِیْ مَا شِئْتِ مِنْ مَّالِیْ، لَا أُغْنِیْ عَنْكِ مِنَ اللّٰہِ شَیْئًا۔“ (مشکوٰۃ ص:۴۶۰)

ترجمہ:......”اے فاطمہ بنت محمد! جو کچھ مانگنا چاہتی ہے، مجھ سے مانگ، میں دوں گا، لیکن قیامت کے دن میں تیرے کام نہیں آؤں گا۔“

تو اس حدیث شریف کا یہی مقصد ہے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا رشتہ قیامت کے دن کام نہیں دے گا، اور یہ بات اپنی جگہ صحیح ہے، لیکن مطلقاً نہیں، بلکہ ایک قید کے ساتھ۔

وہ یہ کہ جو شخص اپنے عمل یا کفر کی وجہ سے مستحق نار ہو، اس کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا رشتہ کوئی کام نہیں دے گا، جو شخص کافر مرا، وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا رشتہ دار تھا یا آپ کی فرض کرو اولاد میں سے تھا (نعوذ باللہ!) ایمان پر خاتمہ نہیں ہوا، اس کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا رشتہ کوئی کام نہیں دے گا۔

اسی طرح جو شخص بدکردار ہو، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا رشتہ دار ہو، تو اس کے بارے میں بھی مسئلہ کچھ گڑبڑ ہی ہے، مسلمان ہو، لیکن بدکردار ہو، اللہ تعالیٰ اس کو معاف کردیں تو دوسری بات ہے۔ اس کے علاوہ جو شخص مسلمان ہو اور اپنے طور پر نیکی کی بھی کوشش کرتا ہو، اس کو قیامت کے دن انشاءاللہ، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا رشتہ کام دے گا۔

صرف نسب سے نہیں ایمان و عمل سے مغفرت ہوگی:

یہاں پر دو چیزوں کی اصلاح ضروری ہے:

ایک یہ کہ بعض لوگوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے رشتہ کے معاملہ میں اتنا غلو کیا ہے کہ اس کے بعد وہ کسی عمل کی ضرورت نہیں سمجھتے، اگر سید نہ ہوں تو زبردستی سید بن بیٹھتے ہیں اور شیطان نے یہ پٹی پڑھا رکھی ہے کہ بس تم آلِ رسولؐ ہو، تمہیں عمل کی کیا ضرورت ہے؟ بخشے بخشائے ہو، یہ نہایت غلط بات ہے، اور بہت سے لوگوں میں تو یہ چیز گمراہی کا سبب بنی ہوئی ہے۔

شیعہ داڑھی کیوں نہیں رکھتے؟

شیعوں کو سنت سے عداوت ہے، یہ اکثر جو اپنے آپ کو ''شیعہ'' کہتے ہیں وہ ''سید'' بن جاتے ہیں۔ عقائد ان کے صحیح نہیں، اعمال ان کے صحیح نہیں، رَوِش ان کی صحیح نہیں، سنتِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا ان کو اہتمام نہیں، لیکن فخر کرتے ہیں کہ ہم ''آلِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم'' ہیں۔ میری ایک کتاب ہے ''شیعہ سنی اختلافات اور صراطِ مستقیم'' جو دراصل میں نے محسن اجتہادی صاحب کے خط کے جواب میں لکھی ہے، اس میں میں نے چلتے چلتے یہ بات لکھ دی ہے کہ آپ لوگوں کو دعویٰ تو ہے ائمہ اہل بیت کی محبت کا، لیکن تم نے شکل تو ان جیسی بنائی نہیں، اس پر میں نے مُلّا باقر مجلسی کی کتاب سے یہ واقعہ بھی نقل کیا ہے۔

ملا باقر مجلسی:

ملا باقر مجلسی دسویں صدی کا شیعوں کا بہت بڑا مجتہد اعظم ہے، اس نے ''بحار الانوار'' کے نام سے ۲۵ جلدوں میں ایک کتاب لکھی تھی، اتنی موٹی موٹی جلدیں پرانے زمانے کی اور جہازی سائز کی، اب وہ ایران سے نئے انداز میں چھپ گئی ہے، لیکن شیعہ اس میں سے آٹھویں جلد غائب کرگئے ہیں، اس نے ''فتن'' کے نام سے لکھی تھی، یعنی ان حالات پر جو بقول اس کے حضرت ابوبکر، حضرت عمر اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہم کے زمانے میں فتنہ ہوئے، باقی ۲۴ جلدیں ہیں، یہ ۲۴ جلدیں ۱۰۷ جلدوں میں آئی ہیں، اور ۳ جلدیں اس کی صرف فہرست کی آئی ہیں، ۱۰۸، ۱۰۹، ۱۱۰۔ اور یہ مکمل ۱۱۰ جلدوں کا سیٹ ہے، جیسا کہ میں نے کہا کہ اس کی آٹھویں جلد جو بڑی تھی، اس کو وہ ہضم کرگئے ہیں، اس کی کم از کم ۸ جلدیں الگ سے تو بنتیں۔

داڑھی منڈے ایرانیوں سے آپ ﷺ کا اعراض:

چنانچہ میں نے ملا باقر مجلسی کے حوالہ سے یہ واقعہ لکھا ہے کہ ایران کے سفیر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے، ان کی داڑھی مونڈھی ہوئی تھی، یہ بات ہماری کتابوں میں بھی موجود ہے، ''البدایہ والنہایہ'' میں اور سیرت کی دوسری کتابوں میں موجود ہے، اور میرا چھوٹا سا رسالہ ہے ''داڑھی کا مسئلہ'' اس میں بھی میں اپنی کتابوں کے حوالے سے نقل کرچکا ہوں، لیکن یہاں شیعوں سے گفتگو ہو رہی تھی، تو میں نے مُلّا باقر مجلسی کی کتاب سے یہ ہی واقعہ نقل کیا کہ ایران کے دو سفیر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آئے تھے، یہ اصل میں ایرانی نہیں تھے، بُصریٰ کے تھے، جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا گرامی نامہ شاہِ ایران پرویز کو پہنچا ہے، تو اس نے بُصریٰ کے گورنر کو خط لکھا کہ: میرے پاس (یثرب) مدینہ سے ایک صاحب کا خط آیا ہے اور اس نے میری شان میں یہ گستاخی کی ہے۔ میں تم کو حکم دیتا

ہوں کہ دو آدمی بھیجو اور اس کو پکڑ کر لاؤ، گرفتار کر کے لاؤ۔ تو بُصریٰ کے گورنر نے دو آدمی بھیجے، جب یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے تو ان کی داڑھیاں مونڈھی ہوئی تھیں اور مونچھیں بڑی بڑی تھیں، جیسے ہمارے ہاں خان صاحبوں کی ہوتی ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا کہ: ’’وَیْلَکُمَا!‘‘ تمہارا ناس ہوجائے! یہ تم نے اپنی شکل کیوں بگاڑ رکھی ہے؟ انہوں نے کہا: ’’قَدْ اَمَرَنَا رَبُّنَا!‘‘ یعنی کسریٰ ہمارے رب نے یعنی شاہِ کسریٰ نے اس کا حکم دیا ہے کہ داڑھی صاف کرکے رکھا کرو اور مونچھیں بڑی بڑی رکھا کرو۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: ’’لیکن میرے رب نے مجھے یہ حکم دیا ہے کہ میں داڑھی بڑھاؤں اور مونچھیں کٹواؤں۔‘‘ پھر فرمایا کہ: ’’میری مجلس سے اٹھ جاؤ، میں تم سے بات نہیں کرتا، میرا نمائندہ تم سے بات کرے گا، بالواسطہ بات کروں گا۔‘‘

شیعہ عوام کیا خواص بھی حضرات حسنینؓ کی شکل نہیں اپناتے:

تو میں نے محسن اجتہادی کو لکھا کہ تمہارے شیعہ عوام نہیں، بلکہ مولوی بھی دیکھے ہیں، کوئی ایسا ہوگا جس نے داڑھی رکھی ہوئی ہو؟ اور جس کی شکل حضرات حسن و حسین رضی اللہ عنہما جیسی ہو؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بات تو وہ نہیں کرتے، صرف حسن و حسین اور مولا علی، بس! کبھی ان کی مجلس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے واقعات، یا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا طرزِ عمل بہت کم اس کا حوالہ ملے گا۔

شیعوں کے ہاں بھولے سے بھی حدیث رسول ﷺ کا تذکرہ نہیں ہوتا:

میں نے ان کی کتابیں پڑھی ہیں، دفاتر کے دفاتر پڑھے ہیں، کہیں کوئی بھولے سے رسول اللہ کی بات آجائے تو آجائے، ورنہ ضرورت ہی نہیں، اور اگر کوئی بات آ بھی گئی تو وہ بھی گھڑی ہوئی بات ہوتی ہے، اِلَّا ماشاءَ اللہ! جھوٹ میں کچھ سچ بھی

چل جاتے ہیں، سو جھوٹ میں ایک سچ بھی ہو جاتا ہے۔

شیعہ بناوٹی سید ہیں:

تو میں عرض کر رہا تھا کہ یہ بناوٹی ''سید'' ہیں، نہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سی شکل، نہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ عقیدت، نہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے تعلق، نہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت، نہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے الفت!

کسریٰ و پرویز کا قتل:

اب یہ بات بیچ میں آگئی تو اس قصہ کو بھی پورا کردوں، یہ دونوں صاحب واپس آگئے کسریٰ کے پاس، گرفتار انہوں نے کیا کرنا تھا، جب انہوں نے کہا کہ ہمیں آپ کو گرفتار کرکے لے جانے کا حکم دیا گیا ہے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کل جواب دوں گا، اگلے دن آئے تو ارشاد فرمایا کہ: رات تمہارا طاغیہ ختم کردیا گیا ہے، اس کو اس کے لڑکے شیروے نے قتل کردیا ہے، تو یہ دونوں واپس آگئے۔

شاہِ بُصریٰ کا ایمان لانا:

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے شاہِ بُصریٰ کے نام جو شاہِ ایران کا گورنر تھا، خط لکھا کہ وہ تو مردار ہوگیا ہے، میں اللہ کا رسول ہوں، تم ایمان لے آؤ! اور یہ علاقہ تمہارے سپرد رہے گا، تم اس کے گورنر رہو گے، اور اگر تم مسلمان نہ ہوئے تو تمہیں معلوم ہونا چاہئے کہ یہ تمہاری سب کی سب سلطنت ختم ہوجائے گی۔ یہ دونوں قاصد واپس شاہ بُصریٰ کے پاس گئے، انہوں نے حالات بتلائے، اس نے کرید کرید کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات معلوم کئے، اور وہ مسلمان ہوگیا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عریضہ لکھا کہ: یا رسول اللہ! مجھے آپ کا گرامی نامہ ملا ہے، میں آپ پر ایمان لاتا ہوں اور اللہ تعالیٰ مجھے توفیق عطا فرمائے تو میں حاضر خدمت ہونے کی بھی کوشش کروں گا۔

آپ ﷺ کی رشتہ داری کے کام نہ آنے پر دلائل:

الغرض ایک طرف تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رشتہ داری کے معاملہ میں یہ غلو کیا جارہا ہے اور دوسری طرف ردعمل ہے، اس کی خشکی، وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے رشتہ کو کوئی اہمیت ہی نہیں دیتے، اور دلائل بڑے مضبوط پیش کرتے ہیں کہ قرآن کریم میں ہے:

''اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقَاکُمْ۔'' (الحجرات:۱۳)

ترجمہ:...... ''بے شک اللہ کے نزدیک معزز متقی ہے۔''

وہ کہتے ہیں کہ اس آیت کی رُو سے رشتہ داری کا کوئی اعتبار نہیں ہے، اللہ پاک نے خود اصول بیان فرمایا ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے کہ:

''کُلُّکُمْ بَنُوْ اٰدَمَ وَاٰدَمُ مِنْ تُرَابٍ۔''

(مجمع الزوائد ج:۸ ص:۸۶)

ترجمہ:...... ''تم سب آدم علیہ السلام کی اولاد ہو اور آدم علیہ السلام مٹی سے پیدا ہوئے ہیں۔''

یہ دونوں باتیں اپنی اپنی جگہ صحیح ہیں، اللہ اور رسول کا فرمان ہے، لیکن دیکھنا یہ ہے کہ ایک شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اولاد میں سے ہے، ہمیں یہ بات محقق طور پر معلوم ہے تو کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت سے ہمارے دل میں اس کی کچھ قدر ہوگی یا نہیں؟ یقیناً ہوگی!! مقتضائے عقل ہے، عقل یہی کہتی ہے۔

آنحضرت ﷺ سے محبت کی وجہ؟

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے کہ:

''اَحِبُّوا اللّٰہَ لِمَا یَغْذُوْکُمْ مِنْ نِّعَمِہٖ، وَاَحِبُّوْنِیْ بِحُبِّ اللّٰہِ تَعَالٰی۔'' (اتحاف ج:۹ ص:۵۴۸)

ترجمہ:......''اللہ سے محبت رکھو، اس لئے کہ وہ تم کو غذا دیتا ہے، اور مجھ سے محبت رکھو اللہ کی محبت کی وجہ سے (کیونکہ میں اللہ کا رسول ہوں)۔''

یہاں پر یہ بات بھی ذہن میں رکھنی چاہئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے احسان کا حوالہ نہیں دیا، حالانکہ آنخضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ عالی کے ہم پر بے شمار احسانات ہیں، لیکن اپنی محبت کے لئے اللہ کی محبت کا حوالہ دیا، اس لئے کہ آنخضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہم پر جو احسانات ہیں، ان کی وجہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت ہوگی ہی، لیکن یہ اپنے نفس کے لئے ہوگی کہ ہم پر احسان ہے۔

آنخضرت ﷺ کی گستاخی پر غصہ کی وجہ؟ اکابرؒ کا ذوق:

حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ کی مجلس میں ایک دفعہ تذکرہ آیا، حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی، حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی، مفتی کفایت اللہ صاحب رحمہم اللہ بلکہ حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ ان سب کے حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن صاحب رحمہ اللہ استاذ ہیں، تذکرہ آیا، حضرتؒ نے پوچھا کہ: میاں! اگر کوئی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں گستاخی کرے، تم لوگوں کو غصہ کیوں آتا ہے؟ کہنے لگے کہ: حضرت! یہ بات بھی کوئی پوچھنے کی ہے؟ غصہ آنا چاہئے! فرمایا: آنا تو چاہئے، مگر میں وجہ پوچھتا ہوں کہ کیوں آتا ہے؟ پھر فرمایا کہ: ہمیں غصہ اس لئے آتا ہے کہ ہمارے رسول کی گستاخی کر رہے ہیں، یہ تو اپنی طرف نسبت ہوگئی، یہ تو اخلاص نہ ہوا، غصہ اس لئے آنا چاہئے کہ اللہ کے رسول کو کہہ رہے ہیں، اور پھر فرمایا کہ: آنخضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں کوئی آدمی ایسا لفظ کہے تو ہمیں غصہ آتا ہے، اگر ایسا ہی غصہ ہمیں دوسرے انبیا علیہم الصلوٰۃ والسلام کی توہین و بے ادبی سن کر آئے تو پھر یہ دلیل ہے اخلاص کی، اور اگر دوسرے انبیا علیہم السلام کے بارہ میں تو

سن کر کوئی غصہ نہیں آتا، اپنے نبی کے بارہ میں سن کر غصہ آتا ہے تو معلوم ہوا کہ یہ بھی پارٹی بازی ہوئی، اخلاص تو نہ ہوا۔ بہت ہی دقیق بات ہے۔

آنحضرت ﷺ کے احسانات:

تو میں نے کہا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بے شمار احسانات ہیں، ہمارا ایک ایک بال آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے احسانات میں جکڑا ہوا ہے، اور یہ راز ہے کہ جب ہم ''التحیات'' پڑھتے ہیں، ''التحیات'' میں بیٹھتے ہیں (پہلے قعدہ میں) تو حکم ہے کہ ''عبدہ ورسولہ'' پڑھ کر اٹھ جاؤ، ابھی تمہارے ذمہ کچھ کام باقی ہے، لیکن اگر آخری قعدہ ہو تو ''التحیات'' پڑھ کر پھر درود شریف پڑھو، اور پھر دعائیں پڑھو، مانگو کیا مانگتے ہو؟ تم نے اللہ کی عبادت کرلی، اللہ کو سجدہ کرلیا، اللہ سے تعلق قائم کرلیا، اللہ کی بارگاہ سے رخصت ہو رہے ہو، ''السلام علیکم ورحمۃ اللہ'' کہہ کر نماز سے باہر نکل رہے ہو، گویا کمرے سے باہر جارہے ہو، اب ذرا اطمینان سے بیٹھو، مانگو کیا مانگنا چاہتے ہو؟ بولو! اللہ میاں تم سے پوچھ رہے ہیں: کیا مانگتے ہو؟ مانگو! اب مانگ لو جو مانگنا ہے، میری عبادت تو عبادت ہی کیا ہے، پوری کائنات کی عبادت وہ اللہ کے لئے ہے، ''اَلتَّحِیَّاتُ لِلّٰہِ وَالصَّلَوَاتُ وَالطَّیِّبَاتُ'' تحیات کا معنی زبانی عبادتیں، صلوات کا معنی بدنی عبادتیں، اور طیبات کا معنی مالی عبادتیں، یہ سب اللہ کے لئے ہیں، نظر پڑی اُوہ! آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تشریف فرما ہیں، وہی تو پکڑ کر لائے تھے ہمیں اللہ کے دربار میں، کہ چلو، اللہ کے دربار میں پہنچو، بے ساختہ ہماری زبان سے نکلا: ''اَلسَّلَامُ عَلَیْکَ اَیُّھَا النَّبِیُّ وَرَحْمَۃُ اللّٰہِ وَبَرَکَاتُہٗ۔'' اور پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے طفیل میں: ''اَلسَّلَامُ عَلَیْنَا وَعَلٰی عِبَادِ اللّٰہِ الصَّالِحِیْنَ۔'' سلام ہو ہم پر اور اللہ کے تمام نیک بندوں پر۔

صحیح مسلم کی حدیث ہے کہ:

”..... فَاِذَا قَالَهَا اَصَابَتْ كُلَّ عَبْدٍ لِّلّٰهِ صَالِحٍ فِي السَّمَاءِ وَالْاَرْضِ......“ (صحیح مسلم ج:۱ ص:۱۷۳)

ترجمہ:.....”جب تم کہو گے: ”اَلسَّلَامُ عَلَيْنَا وَعَلٰى عِبَادِ اللّٰهِ الصَّالِحِيْنَ۔“ تو اللہ کے جتنے نیک بندے ہیں آسمان میں یا زمین میں زندہ ہیں یا فوت ہوچکے ہیں، سب کو سلام پہنچ جائے گا۔“

یہ چھوٹا سا لفظ سب کو پہنچ جائے گا، سب کو حصہ مل جائے گا، اب اپنی بندگی کا اقرار کیا: ”اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ۔“ یہ اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا کی، اپنی عبدیت کا اقرار کیا اور بیچ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی آگئے تھے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی سلام کردیا، اور چونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے طفیل میں باقیوں کو بھی محروم نہیں رکھنا چاہیے، لہٰذا تمام نبی، صحابی، تابعی، اولیأ، اتقیأ اور آسمان والے، زمین والے سب کو شامل کرکے کہہ دیا: ”اَلسَّلَامُ عَلَيْنَا وَعَلٰى عِبَادِ اللّٰهِ الصَّالِحِيْنَ۔“ اندازہ کرو کیسے جامع الفاظ رکھے گئے ہیں نماز میں، معمولی نہیں ہیں۔

اب اس کے بعد عبدیت کا اقرار کرلیا، اللہ کی حمد و ثنا کرلی، تمہیں مانگنا ہے اللہ تعالیٰ سے، اس لئے سب سے پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر درود شریف پڑھو۔

حدیث شریف میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: ”جو شخص یہ چاہے کہ ہم پر یعنی آلِ محمد ﷺ پر پیمانہ بھر کر درود بھیجے، بھرے ہوئے پیمانہ سے، بڑے سے بڑا پیمانہ اور وہ بھی بھر کر، اس کو چاہیے یہ درود ابراہیمی پڑھے۔“ اب تم نے درود شریف پڑھ لیا، اب مانگو جو مانگنا ہے، لیکن یاد رکھو کہ حدیث شریف میں ہے کہ:

”اِنَّ اللّٰہَ لَا یَسْتَجِیْبُ دُعَاءً مِّنْ قَلْبٍ غَافِلٍ لَاہٍ۔“
(مشکوٰۃ ص:۱۹۵)

ترجمہ:......”اللہ تعالیٰ غافل اور لہو ولعب میں مبتلا دل کی دعا کو قبول نہیں فرماتے ہیں۔“

زبان سے کہہ رہے ہو، لیکن یہ معلوم نہیں کہ کہاں پھر رہے ہو؟ تم اللہ کی بارگاہ میں حاضر ہوئے ہو، اللہ کی طرف متوجہ ہو، مانگو کیا مانگنا ہے؟ مگر اللہ کی طرف متوجہ ہوکر مانگو، غفلت کے ساتھ نہیں۔

حدیث شریف میں ہے:

”قَالَتْ کَانَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَسْتَحِبُّ الْجَوَامِعَ مِنَ الدُّعَاءِ وَیَدَعُ مَا سِوٰی ذٰلِکَ۔“
(مشکوٰۃ ص:۱۹۵)

ترجمہ:......”ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم چن چن کر جامع دعائیں کیا کرتے تھے، اور یہ جو دوسری دعائیں ہوتی تھیں اس کو چھوڑ دیا کرتے تھے۔“

جامع دعائیں کرو (تو خیر یہ درمیان میں بات آئی تھی)۔

التحیات میں آپ ﷺ کے تذکرہ کی حکمت!

میں نے یہ عرض کیا کہ ”التحیات“ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا تذکرہ لانے کا کیا مطلب ہے؟ اس کا راز بزرگ یہ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں حاضر ہوکر اللہ کی حمد وثنا کر رہے تھے کہ اچانک نظر پڑی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر، اُوہ! ہمارا ہاتھ پکڑ کر تو آپ لائے ہیں، بڑی قدر ناشناسی ہوگی، بڑی بے مروتی ہوگی کہ ہم اللہ تعالیٰ سے باتیں کریں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا وسیلہ نہ ڈھونڈیں

اور آپ کا تذکرہ نہ کریں اور آپ کو سلام بھی نہ کریں، اس لئے بے ساختہ کہا: ”اَلسَّلَامُ عَلَیْکَ اَیُّھَا النَّبِیُّ وَرَحْمَةُ اللهِ وَبَرَکَاتُهٗ۔“ حالانکہ کسی کے ساتھ بات کرنے سے نماز ٹوٹ جاتی ہے، نماز میں بھی صرف اللہ سے بات ہوتی ہے کسی اور سے نہیں، مگر یہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بات کردی، اس لئے کہ یہ بات اس جہاں کی نہیں ہورہی، یہ بات بارگاہِ الٰہی کی ہورہی ہے، اس وقت گویا معنوی طور پر آپ اللہ کی بارگاہ میں حاضر ہیں اور اللہ تعالیٰ سے راز و نیاز میں محو ہیں، درمیان میں کوئی نہیں ہے، ترجمان نہیں ہے، آپ خود باتیں کر رہے ہیں، کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم وہاں پہلے سے تشریف فرما ہیں اور ہمارے محسن ہیں، لازم ہوا کہ ان کا تذکرہ کیا جائے اور ان کو بھی یاد کیا جائے اور ان کو بھی سلام ہو۔

میں نے کہا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہم پر بے شمار احسانات ہیں، لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان احسانات کا حوالہ نہیں دیتے، بلکہ حوالہ کیا دیتے ہیں کہ مجھ سے محبت رکھو، اللہ کی محبت کی وجہ سے، اس لئے کہ میں اللہ کا رسول ہوں، اور میری آل سے محبت رکھو میری محبت کی وجہ سے۔

قرابت نبوی ﷺ کی پاسداری:

صحیح بخاری شریف میں (غالباً ج:۱ ص:۵۲۶) حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا مقولہ نقل کیا گیا ہے، انہوں نے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا سے گفتگو کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ:

”وَالَّذِیْ نَفْسِیْ بِیَدِهٖ! لَقَرَابَةُ رَسُوْلِ اللهِ صَلَّی اللهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اَحَبُّ اِلَیَّ اَنْ اَصِلَ مِنْ قَرَابَتِیْ۔“

(ج:۱ ص:۵۲۶)

ترجمہ:......”اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے، مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اہل قرابت کے

ساتھ صلہ رحمی کرنا اپنے اہل قرابت سے زیادہ محبوب ہے۔“

یہ مؤمن کا ایمان ہے، اور اسی صفحہ پر امام بخاری رحمہ اللہ نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا یہ قول بھی نقل کیا ہے:

”اِرْقَبُوا مُحَمَّدًا (صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ) فِيْ اَهْلِ بَيْتِهٖ۔“

ترجمہ:...... ”آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی آل کے معاملہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا لحاظ رکھا کرو۔“

یہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ فرما رہے ہیں، تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا لحاظ نہ رکھنا یہ بڑی بے مروتی کی بات ہے، اُدھر اگر غلو ہے تو اِدھر کوتاہی ہے۔

گناہ گار سید بھی قابل احترام ہے:

ہمارے حضرت حکیم الامت قدس سرہٗ ارشاد فرماتے تھے کہ: ”بھائی! سید اگر گناہگار بھی ہو تب بھی واجب الاحترام ہے۔“ حضرتؒ نے عجیب مثال دی، فرمایا کہ: اگر کوئی قرآن کریم کا نسخہ غلط چھپ گیا ہو، تو اس کو پڑھنا تو جائز نہیں، مسجد میں تو نہ رکھیں گے، کیونکہ لوگ غلط پڑھیں گے، بے چارے انجان ہیں، لیکن اس کی بے ادبی بھی جائز نہیں، بلکہ ادب کے ساتھ اس کو دفن کروادیں گے۔ فرمایا کہ سید اگر غلط راہ ہو اس کی اقتدا جائز نہیں ہے، اس کے پیچھے مت چلو، لیکن توہین بھی درست نہیں، کیونکہ نسبت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے۔ تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا رشتہ اور آپ کا تعلق یہ دنیا میں بھی کام دیتا ہے اور آخرت میں بھی کام دے گا، انشاءاللہ!

نکاح ام کلثومؓ سے شیعہ کا اضطراب:

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا واقعہ مشہور ہے، آپ نے ام کلثوم رضی اللہ عنہا سے نکاح کیا تھا ناں! شیعہ نہیں مانتے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا پتا تو کاٹنا چاہتے ہیں،

لیکن کٹتا ہے نہیں، کیا کریں مشکل یہ ہے، اب ناخن کو گوشت سے کیسے جدا کریں؟ خلفائے ثلاثہ: حضرات ابوبکر و عمر و عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہم، ان کا رشتہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ تو وہ ہے جو خون اور گوشت کا رشتہ ہوتا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرمایا کرتے تھے: ''هُمَا بِمَنْزِلَةِ سَمْعِی وَبَصَرِی۔'' یہ ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما میرے کان اور آنکھیں ہیں۔ تو یہ کاٹنا چاہتے ہیں مگر کٹتا نہیں، مجبور ہیں، بے چارے پریشان ہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت علی و فاطمہ رضی اللہ عنہما کی صاحبزادی حضرت ام کلثومؓ سے عقد کیا تھا، اور ان سے حضرت کے صاحبزادے زیدؒ بن عمرؓ پیدا ہوئے۔

ایک صاحب میرے پاس ایک دن آئے تھے، میں نے شیعہ کتابوں میں سے نکال کے دکھلایا کہ دونوں ماں بیٹے کا ایک ہی وقت میں انتقال ہوا تھا، اور ان دونوں کا اکٹھا جنازہ پڑھا گیا۔

ام کلثومؓ سے نکاح عمرؓ کی وجہ؟

غرض یہ کہ حضرت عمرؓ نے خطبہ دیا، فرمایا کہ: لوگو! مجھے تم جانتے ہو، میں بوڑھا ہوگیا ہوں، موت کے قریب ہوں، مجھے شادی کی ضرورت نہیں ہے، مجھے بیوی کا شوق نہیں ہے، میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد سنا ہے، آپ نے بھی سنا ہے:

''كُلُّ سَبَبٍ وَّنَسَبٍ يَّنْقَطِعُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ اِلَّا سَبَبِی وَنَسَبِی۔''
(مجمع الزوائد ج:۴ ص:۲۷۱)

ترجمہ:......''تمام کے تمام رشتے اور تمام کے تمام علاقے نسبی رشتہ ہو یا دامادی رشتہ ہو، یعنی بیوی کی طرف سے جو رشتے آتے ہیں، یہ سارے کے سارے کٹ جائیں گے سوائے

میرے رشتہ کے۔“

تو میں چاہتا ہوں کہ میرا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے رشتہ رہے، صرف یہ لالچ ہے۔

تو قیامت کے دن بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے رشتہ کا لحاظ رکھا جائے گا، اور لحاظ رکھنا بھی چاہیئے، اس لئے مطلقاً نفی کرنا غلط ہے، اعتدال کا راستہ اختیار کرنا چاہیئے۔

آنخضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے یہ تعلق والے ہیں، ان سے محبت رکھنا، ان کا اکرام کرنا آنخضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وجہ سے لازم ہے، خاتونِ جنت آنخضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صاحبزادی حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کا اکرام لازم ہے۔

حضور ﷺ کی چار صاحبزادیاں:

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی چار صاحبزادیاں تھیں، حضرت زینبؓ یہ حضرت ابوالعاص رضی اللہ عنہ سے بیاہی گئی تھیں۔ حضرت رقیہ اور حضرت ام کلثوم رضی اللہ عنہما یکے بعد دیگرے دونوں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے عقد میں آئیں، اور اسی بنا پر ان کو ”ذوالنورین“ کہا جاتا ہے، یعنی دو نور والے۔

حضرت عثمانؓ سے آپ ﷺ کی محبت:

جب حضرت رقیہ رضی اللہ عنہا کا انتقال ہوا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ: عثمان! یہ جبرائیل کھڑے ہیں (حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو نظر آرہے تھے ان کو نہیں)، اور مجھے کہہ رہے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے حکم فرمایا ہے کہ میں تم سے ام کلثوم کا عقد کردوں، اسی مہر پر جس مہر پر رقیہ کا عقد کیا تھا۔ وہ عقد اللہ کے حکم سے ہوا، جبرائیل امین کی آمد سے ہوا، وحی سے ہوا، اور جب حضرت ام کلثوم رضی اللہ عنہا کا بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی ہی میں انتقال ہوگیا تو آنخضرت صلی اللہ علیہ

وسلم نے خطبہ ارشاد فرمایا اور فرمایا کہ: عثمان کی بیوی کا انتقال ہوگیا ہے۔ لوگوں سے کہا کہ عثمان کو اپنی لڑکیاں دو، اللہ کی قسم! اگر میرے پاس اور لڑکی ہوتی تو وہ بھی عثمان سے بیاہ دیتا، وہ مرجاتی اور لڑکی ہوتی تو وہ عثمان سے بیاہ دیتا۔ ان کو کیا کمی تھی، یہ صرف حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اظہارِ محبت فرمایا۔

شیعہ مذہب کی بنیاد ہی انکارِ اہل بیت پر ہے:

تو بہرکیف یہ چار صاحبزادیاں ہیں، شیعہ تینوں کا انکار کرتے ہیں، اہل بیت کا انکار کرتے ہیں، شیعوں کی بنیاد ہی انکارِ اہل بیت پر ہے، عداوتِ اہل بیت اور انکارِ اہل بیت، اور ایک حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا رہ گئی تھیں، ان کے ساتھ انہوں نے جو کچھ کیا ہے اس کو چھوڑتا ہوں۔

حضرات فاطمہؓ، علیؓ اور حسنینؓ ہمارے اکابر ہیں:

بہرحال ہمارے بہت سے سنی مسلمان حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کا وہ اکرام نہیں کرتے، جیسا کہ کرنا چاہئے، کیوں شیعوں کی اجارہ داری ہے اس پر؟ یہ تو ہمارے اکابر ہیں، حضرات حسن و حسین رضی اللہ عنہما ہمارے ہیں، حضرت علی رضی اللہ عنہ ہمارے ہیں، ان کا دعویٰ محبت غلط ہے، حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہمارے ہیں، عیسائیوں کے نہیں، عیسائیوں کا دعویٰ غلط ہے۔

ہمارے دل کا سرور:

اسی طرح حضرت علی اور حضرات حسنین رضی اللہ عنہم اور دوسرے بزرگ جن کو یہ حضرات ''ائمہ معصومین'' کہتے ہیں، وہ ہمارے اکابر ہیں، آنکھوں کا نور، دل کا سرور، ایمان کا جزو اور ان کی محبت عین ایمان ہے۔

حضرت علیؓ اور حسنینؓ کے فضائل:

حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:

"اَلْحَسَنُ وَالْحُسَيْنُ سَيِّدَا شَبَابِ اَهْلِ الْجَنَّةِ۔"

(مشکوٰۃ ص:۵۷۰)

ترجمہ:......"حسن و حسین جوانانِ جنت کے سردار ہوں گے۔"

اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بارے میں فرمایا کہ:

"يُحِبُّ اللهَ وَرَسُوْلَهٗ وَيُحِبُّهُ اللهُ وَرَسُوْلُهٗ۔"

(مشکوٰۃ ص:۵۶۳)

ترجمہ:......"وہ اللہ اور اس کے رسول سے محبت رکھتے ہیں، اور اللہ اور اس کا رسول ان سے محبت رکھتے ہیں۔"

حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے میرے بارہ میں فرمایا کہ:

"لَا يُحِبُّنِىْ اِلَّا مُؤْمِنٌ، وَلَا يُبْغِضُنِىْ اِلَّا مُنَافِقٌ۔"

(مشکوٰۃ ص:۵۶۳)

ترجمہ:......"مجھ سے صرف مؤمن محبت رکھے گا، اور مجھ سے صرف منافق بغض رکھے گا۔"

شیعوں کو حضرت علیؓ اور اولادِ علیؓ سے بغض ہے:

بالکل صحیح فرمایا ہے! شیعوں کو حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بغض ہے، زبان سے کہتے ہیں کہ ہمیں محبت ہے، بالکل جھوٹ بولتے ہیں، یہ منافق ہیں۔

تم بتلاؤ کہ یہ کہا جائے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے پچیس سال تک منافقوں اور مرتدوں کے پیچھے نماز پڑھی، یہ ان سے محبت ہے یا ان پر لعنت ہے؟

سوچو ذرا...! ایک آدمی کو تم مرتد کہتے ہو اور پھر علیؓ شیر خدا کو کہتے ہیں کہ وہ ڈر کر پچیس سال تک ان کے پیچھے نماز پڑھا کرتا تھا، کیا بے ایمان کے پیچھے نماز ہو جاتی ہے؟ کسی کافر کے پیچھے، منافق کے پیچھے نماز ہو جائے گی؟ جب ہمیں پتا ہے کہ یہ مشرک ہے، منافق ہے، مرتد ہے، اس کے پیچھے کسی کی نماز ہو جائے گی؟ میری نماز نہیں ہوتی تو حضرت علی رضی اللہ عنہ کی کیسے ہوگئی؟ معلوم ہوا کہ شیعوں میں محبت نہیں ہے۔ یہ دشمن ہیں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے، ''شیعہ'' علی اور اولادِ علی کے سب سے بدترین دشمن ہیں، اس لئے میرے آقا صلی اللہ علیہ وسلم نے صحیح فرمایا کہ: ''لَا یُحِبُّکَ اِلَّا مُؤْمِنٌ، وَلَا یُبْغِضُکَ اِلَّا مُنَافِقٌ۔'' علیؓ سے مجھے محبت ہے، اہل سنت کو محبت ہے، ہم حضرت علی رضی اللہ عنہ کے اس کمال کے معترف ہیں، جو واقعی اللہ نے ان کو کمال عطا فرمایا تھا۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے تین بزرگوں کو اپنا امام سمجھا اور ان کے ہاتھ پر بیعت کی، اس زمانہ میں پرچیاں نہیں ڈالتے تھے، ہاتھ سے بیعت کرتے تھے، جب صحابہؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر بیعت کی تھی، حضرت علی رضی اللہ عنہ نے بھی اسی طرح تین حضرات کے ہاتھ میں ہاتھ دے کر بیعت کی تھی، حضرات ابوبکر، عمر، عثمان رضی اللہ عنہم، اور ان کو اپنا امام ومقتدا مانا ہے۔

خلفائے ثلاثہ اماموں کے امام ہیں:

یہ ''شیعہ'' کہتے ہیں حضرت علیؓ ہمارے امام ہیں، ہم کہتے ہیں کہ خلفائے ثلاثہ اماموں کے امام ہیں، ان کو کیوں نہیں مانتے ہو؟ جو مقتدی کو مانے ان کے امام کو نہ مانے وہ ماننے والا ہوتا ہے؟

اہل بدعت کو حضور ﷺ منہ نہیں لگائیں گے:

اس کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دوسری بات ارشاد فرمائی کہ

قیامت کے دن تم آؤ گے اور اپنا تعارف کراؤ گے کہ میں فلاں بن فلاں ہوں، میں کہوں گا کہ یہ تو میں بھی جانتا ہوں کہ تم فلاں بن فلاں ہو، نسب کو تو میں بھی جانتا ہوں، لیکن بات یہ ہے کہ تم نے میرے بعد دین بدل دیا تھا، بدعات ایجاد کردی تھیں اور تم کفر کی طرف لوٹ گئے تھے، اس کا کیا علاج ہے؟ یہ بات ارشاد فرمائی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حوضِ کوثر پر ہوں گے اور تمام لوگ اپنی پیاس کا علاج کرنے کے لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوں گے، لیکن اہل بدعت کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم منہ نہیں لگائیں گے، کیوں؟ خود فرمایا، صحیح بخاری، باب الحوض کی حدیث میں ہے کہ: کچھ لوگوں کو لایا جائے گا، ''ثُمَّ لَیُختَلَجُنَّ دُوْنِیْ'' فرشتے ان کو میرے آنے تک روک دیں گے کہ تم نہیں جاسکتے ہو، میں کہوں گا کہ یہ میرے لوگ ہیں! فرمایا جائے گا کہ: ''اِنَّکَ لَا تَدْرِیْ مَا اَحْدَثُوْا بَعْدَکَ۔'' آپ نہیں جانتے کہ انہوں نے آپ کے بعد کیا کیا، کیا ہے؟ اور کیا کیا بدعات گھڑی تھیں، تو میں کہوں گا کہ: ''فَسُحْقًا! سُحْقًا! لِمَنْ غَیَّرَ بَعْدِیْ۔'' (بخاری ج:۲ ص:۹۷۴) پھٹکار! پھٹکار! ان لوگوں پر جنہوں نے میرے بعد دین کو بدل دیا۔

دین کو نہ بدلو!

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دین کو نہ بدلو، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا دین جیسا آرہا ہے اس کو ویسے ہی آگے چلنے دو، لوگ ہمیں مشورہ دیتے ہیں کہ: جی! ''اجتہاد'' سے کام لینا چاہئے۔ ''اجتہاد'' کا معنی دین کو بدلو، لاحول ولاقوۃ الا باللہ!

خیر اس وقت اس پر گفتگو کرنے کا موقع نہیں، میرے کہنے کا مدعا یہ ہے کہ دین کو اسی طرح چلنے دو، دین تو کسوٹی ہے کہ کون صحیح ہے اور کون غلط ہے؟

دین بدلنے والوں پر اللہ کے نبی نے پھٹکار کی ہے:

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے دین کو اسی طرح چلنے دو، اس میں کوئی تغیر و

ترمیم مت کرو، اس میں بدعات کی پیوندکاری نہ کرو، باقی بھائی آپ مجھے دیکھتے ہیں کہ میں دین پر صحیح عمل نہیں کر رہا تو میں گناہگار ہوں، آپ صحیح عمل نہیں کر رہے تو آپ گناہگار ہیں، گناہگار تو ہم سارے ہی ہیں، دین پر عمل نہیں ہو رہا تو گناہگار ہیں، مگر اللہ کے لئے دین کو تو چلنے دو، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے گناہگاروں پر پھٹکار نہیں فرمائی، ان کے لئے فرمایا کہ: ”شَفَاعَتِیْ لِاَهْلِ الْکَبَائِرِ مِنْ اُمَّتِیْ۔“ (مشکوٰۃ ص:۴۹۴) میری شفاعت ملے گی میری امت کے اہل کبائر کو جو کبیرہ گناہوں کے مرتکب ہو کر آئے، ان کو بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دامن میں پناہ ملے گی، لیکن جو دین کو بدلنے والے ہیں، ان کو کہیں گے پھٹکار! پھٹکار! اللہ تعالیٰ حفاظت فرمائے، آمین ثم آمین!

وآخر دعوانا ان الحمدللہ رب العالمین

خلفائے اربعہؓ کا انتخاب اور عدل وانصاف

حضرت امیر المؤمنین اسد اللہ الغالب علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ ہمارے خلیفہ چہارم کوفہ کے منبر پر تشریف فرما تھے، کسی نے آکر کہا کہ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ آپ حضرات ابوبکر وعمر (رضی اللہ عنہما) سے افضل ہیں۔ کوفہ کے منبر پر خطبہ ارشاد فرمایا کہ: ''میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ اس امت میں سب سے افضل ابوبکرؓ ہیں، ان کے بعد عمرؓ اور اگر میں چاہوں تو تیسرے آدمی کا بھی نام لے سکتا ہوں۔'' منبر سے اترتے ہوئے ارشاد فرمایا: ''ثم عثمان، ثم عثمان'' پھر عثمان ہیں، پھر عثمان ہیں۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم
الحمد للہ وسلام علی عبادہ الذین اصطفی!

”عَنْ اَبِیْ سَعِیْدٍ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ قَالَ: خَطَبَنَا رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَقَالَ فِیْ خُطْبَتِہٖ: اَلَا! اِنِّیْ اُوْشِکُ فَاُدّٰعٰی فَاُجِیْبُ فَیَلِیْکُمْ عُمَّالٌ مِّنْ بَعْدِیْ یَعْمَلُوْنَ بِمَا تَعْلَمُوْنَ وَیَعْمَلُوْنَ مَا تَعْرِفُوْنَ، وَطَاعَۃُ اُوْلٰٓئِکَ طَاعَۃٌ، فَتَلْبَثُوْنَ کَذَالِکَ زَمَانًا فَیَلِیْکُمْ عُمَّالٌ مِّنْ بَعْدِھِمْ یَعْمَلُوْنَ بِمَا لَا تَعْلَمُوْنَ وَیَعْمَلُوْنَ بِمَا لَا تَعْرِفُوْنَ، فَمَنْ قَادَھُمْ وَنَاصَحَھُمْ فَاُوْلٰٓئِکَ قَدْ ھَلَکُوْا وَاَھْلَکُوْا وَخَالِطُوْھُمْ بِاَجْسَادِکُمْ وَزَایِلُوْھُمْ بِاَعْمَالِکُمْ وَاشْھَدُوْا عَلَی الْمُحْسِنِ اِنَّہٗ مُحْسِنٌ وَعَلَی الْمُسِیْءِ۔“

(مجمع الزوائد ج:۵ ص:۲۳۷)

ترجمہ:...... ”حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں خطبہ دیا اس خطبہ میں ارشاد فرمایا کہ: سنو! وہ وقت قریب آیا چاہتا ہے کہ

میرے پاس میرے رب کا بلاوا آئے گا، تو میں اس بلاوے پر لبیک کہوں گا، میرے بعد تم پر کچھ لوگ حاکم ہوں گے جو عمل کریں گے ایسی باتوں پر جن کو تم جانتے ہو اور کریں گے ایسے کام جو تمہارے نزدیک معروف اور نیکی کے کام ہیں، ان لوگوں کی فرماں برداری کرنا بندگی اور عبادت ہے، پھر تم ایک زمانے تک اسی طرح رہو گے۔ ان کے بعد پھر تم پر ایسے حاکم مقرر ہوں گے جو عمل کریں گے ایسی باتوں پر جو تم نہیں جانتے، اور جو کریں گے ایسے کام جو تمہارے نزدیک معروف نہیں، پس جو شخص ان کی قیادت کرے، اور ان سے خیر خواہی کرے، پس یہ لوگ خود بھی ہلاک ہوئے اور انہوں نے دوسروں کو بھی ہلاک کردیا۔ اور تم لوگ بدن کے اعتبار سے ان میں ملے جلے رہو، لیکن اپنے عمل کے اعتبار سے ان سے الگ رہو، اور نیکوکار پر گواہی دو کہ وہ نیکوکار ہے اور برا کرنے والوں پر گواہی دو کہ وہ برا کرنے والا ہے۔“

اسی طرح صحیح بخاری میں روایت ہے:

”عَنْ اَبِیْ حُمَیْدٍ السَّاعِدِیْ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ اَنَّہٗ اَخْبَرَہٗ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِسْتَعْمَلَ عَامِلًا فَجَاءَہُ الْعَامِلُ حِیْنَ فَرَغَ مِنْ عَمَلِہٖ فَقَالَ: یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ! ہٰذَا لَکُمْ وَہٰذَا اُہْدِیَ لِیْ۔ فَقَالَ لَہٗ: اَفَلَا قَعَدْتَّ فِیْ بَیْتِ اَبِیْکَ وَاُمِّکَ فَنَظَرْتَ اَیُہْدٰی لَکَ اَمْ لَا؟ ثُمَّ قَامَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ عَشِیَّۃً بَعْدَ الصَّلَاۃِ فَتَشَہَّدَ وَاَثْنٰی عَلَی اللّٰہِ بِمَا ہُوَ اَہْلُہٗ، ثُمَّ قَالَ: اَمَّا بَعْدُ فَمَا بَالُ

الْعَامِلِ نَسْتَعْمِلُهٗ فَيَأْتِيْنَا فَيَقُوْلُ: هٰذَا مِنْ عَمَلِكُمْ وَهٰذَا اُهْدِیَ لِیْ۔ اَفَلَا قَعَدَ فِیْ بَيْتِ اَبِيْهِ وَاُمِّهٖ فَنَظَرَ هَلْ يُهْدٰى لَهٗ اَمْ لَا؟ فَوَالَّذِیْ نَفْسُ مُحَمَّدٍ بِيَدِهٖ! لَا يَغُلُّ اَحَدُكُمْ مِنْهَا شَيْئًا اِلَّا جَاءَ بِهٖ يَوْمَ الْقِيَامَةِ يَحْمِلُهٗ عَلٰى عُنُقِهٖ، اِنْ كَانَ بَعِيْرًا جَاءَ بِهٖ لَهٗ رُغَاءٌ، وَاِنْ كَانَتْ بَقَرَةً جَاءَ بِهَا لَهَا خُوَارٌ، وَاِنْ كَانَتْ شَاةً جَاءَ بِهَا تَيْعَرُ، فَقَدْ بَلَغْتُ۔ فَقَالَ اَبُوْحُمَيْدٍ: ثُمَّ رَفَعَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَدَهٗ حَتّٰى اِنَّا لَنَنْظُرُ اِلٰى عَفْرَةِ اِبْطَيْهِ، قَالَ اَبُوْحُمَيْدٍ: وَقَدْ سَمِعَ ذٰلِكَ مَعِیَ زَيْدُ بْنُ ثَابِتٍ مِنَ النَّبِیِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَسْئَلُوْهُ۔" (صحیح بخاری ج:۲ ص:۹۸۲)

ترجمہ:......"حضرت ابوحمید ساعدی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک عامل مقرر کیا تھا، جب وہ اپنے کام سے فارغ ہوکر آیا تو کہنے لگا: یا رسول اللہ! یہ مال تمہارا ہے اور یہ مجھ کو ہدیہ کیا گیا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے فرمایا: پھر تو اپنے باپ کے گھر میں یا اپنی ماں کے گھر میں کیوں نہ بیٹھ گیا، پھر دیکھتے کہ تجھ کو ہدیہ ملتا ہے کہ نہیں ملتا؟ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے شام کو نماز کے بعد خطبہ دیا، اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا کے بعد فرمایا کہ: یہ کیا بات ہے کہ ہم ایک عامل کو مقرر کرتے ہیں وہ ہمارے پاس آتا ہے تو کہتا ہے کہ یہ تمہارے عمل کا نتیجہ ہے، اور یہ مجھ کو ہدیہ دیا گیا ہے، یہ شخص اپنے باپ کے یا اپنی ماں کے گھر کیوں نہ بیٹھا رہا پھر دیکھتے کہ اس کو ہدیہ ملتا ہے کہ نہیں، پس قسم ہے اس ذات کی

جس کے قبضے میں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی جان ہے! کہ تم میں سے کوئی شخص اس میں سے جو چیز بھی چھپائے گا، تھوڑی یا زیادہ، وہ قیامت کے دن اپنی کمر پر اور اپنی گردن پر لادے ہوئے آئے گا، اگر اونٹ تھا تو اس کو لائے گا اور وہ بولتا ہوگا، گائے ہوگی تو اس کو لائے گا اور وہ آواز نکال رہی ہوگی اور اگر بکری ہوگی تو اس کو لائے گا اس حال میں کہ وہ آواز نکال رہی ہوگی۔ دیکھو یہ بات میں نے تمہیں پہنچادی ہے۔ حضرت ابوحمید رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے بعد اپنا ہاتھ آسمان کی طرف اٹھایا یعنی اس طرح اشارہ کرنے کے لئے یہاں تک کہ ہم آپ کے بغل کی سفیدی دیکھ رہے تھے۔ (حضرت) ابوحمیدؓ کہتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ خطبہ میرے ساتھ زید بن ثابت رضی اللہ عنہ نے بھی سنا تھا، تم چاہو تو ان سے پوچھ لو۔"

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے یہ دو خطبے حکام کے بارے میں ہیں۔ پہلے خطبہ میں دو باتیں ارشاد فرمائی گئی ہیں:

نیک حکام کی طاعت نیکی ہے:

ایک یہ کہ عنقریب میرے پاس میرے رب کی طرف سے بلاوا آنے والا ہے، اور میں اس بلاوے پر لبیک کہتے ہوئے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں پہنچ جاؤں گا، دنیا سے رخصت ہوجاؤں گا، میرے بعد تم پر کچھ لوگ حاکم مقرر ہوں گے اور وہ حاکم ایسے ہوں گے کہ جو علم میں تمہیں دے کر جارہا ہوں، اس علم کے مطابق عمل کریں گے، اور جو کام تمہارے ہاں معروف یا نیکی کے سمجھے جاتے ہیں، وہ معروف اور نیکی کا کام

کریں گے، برائی کا کام نہیں کریں گے، ان لوگوں کی اطاعت تو عبادت ہے، ایسے حکام کا حکم ماننا اور ان کے حکم کی تعمیل کرنا اللہ تعالیٰ کی عبادت ہے۔

برے حکام کے بارے میں طرزِ عمل؟

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اس پر ایک زمانہ گزرے گا، اس کے بعد پھر دوسری قسم کے حاکم آئیں گے، وہ اس علم کے مطابق عمل نہیں کریں گے جو تمہیں دیا گیا ہے، اور ان کاموں کو نہیں کریں گے جو کہ معروف اور نیکی کے کام ہیں، یہ وہ لوگ ہیں کہ ان کے ساتھ ان کی قیادت کرنے والا، ان کے جلسے میں شریک ہونے والا اور ان کی خیرخواہی کرنے والا خود بھی ہلاک ہوا، دوسروں کو بھی ہلاک کیا۔ ان حکام کے بارے میں یہ طرزِ عمل اختیار کرو کہ اپنے جسموں کے اعتبار سے تو ان کے ساتھ مل کر رہو، مسلمانوں کے درمیان تفرقہ نہ ہو، پھوٹ نہ ڈالی جائے، ایسے حکام کے خلاف بغاوت نہ کی جائے، جس سے مسلمانوں کی قوت منتشر ہوتی ہو، لیکن اپنے اعمال کے ساتھ ان سے الگ تھلگ رہو، ان کے جیسے اعمال نہ کرو۔

صدیق اکبرؓ خلیفہ بلافصل تھے:

پہلی قسم کے حکام حضرات خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم تھے، اور خلفائے راشدینؓ کہا جاتا ہے چار خلفاءؓ کو، پہلے خلیفہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ہیں جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد خلیفہ بلافصل ہوئے۔

اس امت میں سب سے پہلا جھوٹ:

اس امت میں جو سب سے پہلا جھوٹ بولا گیا تھا وہ یہ تھا کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ خلیفہ بلافصل نہیں، بلکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ خلیفہ بلافصل ہیں، جھوٹ تو اور بھی بہت سارے بولے گئے، لیکن سب سے پہلا جھوٹ یہ تھا۔

پوری جماعت صحابہؓ نے صدیق اکبرؓ سے بیعت کی:

اس لئے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد پوری کی پوری جماعت صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو خلیفہ بنایا، ان کے ہاتھ پر بیعت کی اور ان کو خلیفہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا خطاب دیا گیا، ''امیر المؤمنین'' ان کا خطاب نہیں تھا، ''امیر المؤمنین'' کا خطاب سب سے پہلے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اختیار کیا، حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو ''یا امیر المؤمنین!'' کہہ کر لوگ نہیں بلاتے تھے، بلکہ ''یا خلیفۃ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم!'' اے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلیفہ! جماعت صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین میں سے ایک فرد بھی ایسا نہیں جس نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی بیعت نہ کی ہو اور ان کی خلافت پر متفق نہ ہوگیا ہو، (شروع میں چونکہ جس طرح دستور ہے کہ ایک خلیفہ کو مقرر کردیا جاتا ہے، ولی عہد بنادیا جاتا ہے، اس دستور کے مطابق نہیں بنایا گیا تھا) اس لئے ذرا سا تھوڑا سا اختلاف ہوا، اور یہ اختلاف تھا انصار اور مہاجرین کا۔

ثقیفہ بنی ساعدہ کے اختلاف کا قصہ:

ثقیفہ بنی ساعدہ (بنو ساعدہ انصار مدینہ کا ایک قبیلہ تھا) ان کا ایک چھپر تھا یعنی چوپال کہنا چاہئے جہاں لوگ بیٹھتے تھے، مجلس ہوتی تھی، اس میں حضرات انصار جمع ہوگئے اور اس پر غور کرنے لگے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد نظام کیسے چلے گا؟ ان میں حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ ان کے رئیس اور سردار بھی تھے، وہ کہنے لگے کہ بھائی! حضور صلی اللہ علیہ وسلم یہاں تشریف لائے تھے، آپ ہمارے مقتدا تھے، ہمارے رسول تھے، ہماری جان، ہمارا مال، ہماری بیوی، بچے، ہمارے گھربار آپ پر قربان تھے، لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد نظم ونسق تو مقامی لوگوں کے پاس ہونا چاہئے۔ حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ بیمار تھے کھڑے ہوکر تقریر بھی نہیں کرسکتے

تھے، بیٹھے تھے، انصار ان کے اردگرد جمع تھے اور قریب قریب اس پر متفق تھے کہ انہی کو خلیفہ بنائیں گے، ان حضرات کے پیش نظر صرف اتنی بات تھی کہ چونکہ یہ جگہ انصار کی جگہ ہے، لہٰذا یہاں کا حاکم بھی انصار میں سے ہونا چاہئے، لیکن اس پر ان کی نظر نہیں تھی کہ یہ قصہ صرف یہاں مدینے کا نہیں ہے، بلکہ پورے عرب کا اور اس سے بڑھ کر پوری دنیا کا ہے۔

حضرات شیخینؓ اور ابو عبیدہؓ کا ثقیفہ میں جانے کا قصہ:

حضرت ابو بکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما کو کسی شخص نے آکر اطلاع دی اور کہا کہ: ''اَدْرِكُوْا هٰذِهِ الْاُمَّةَ قَبْلَ اَنْ تَهْلِكَ۔'' اس امت کو سنبھالو اس سے قبل کہ یہ شروع ہی سے ہلاک ہوجائے، پہلے دن ان میں پھوٹ پڑ جائے، مہاجرین اور باہر کے لوگ انصار کو اپنا بڑا ماننے سے انکار کردیں، تو پہلے ہی دن سے اختلاف ہوجائے گا، یہ دونوں بزرگ اور تیسرے حضرت ابو عبیدہ بن الجراح رضی اللہ عنہ تھے، جن کے بارہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''لِكُلِّ اُمَّةٍ اَمِيْنٌ، وَاَمِيْنُ هٰذِهِ الْاُمَّةِ اَبُوْعُبَيْدَةُ بْنُ الْجَرَّاحِ۔''
(مشکوٰۃ ص:٥٦٦)

یعنی ہر امت کا ایک امین ہوتا ہے اور اس امت کے امین ابو عبیدہ بن الجراحؓ ہیں۔ عشرہ مبشرہ میں سے ہیں، یعنی وہ دس آدمی جن کو دنیا میں جنت کی بشارت دی گئی ہے، حضرات ابو بکر اور عمر رضی اللہ عنہما کی بات ہی کیا ہے؟

حضرت عمرؓ کی سوچ:

حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہم خاموشی سے جارہے تھے، آپس میں بات نہیں کر رہے تھے، وہاں جاکر دیکھیں گے کہ مجلس کا کیا رنگ ہے؟ اور میں اپنے ذہن میں ایک تخلیق سوچ رہا تھا کہ جاکر یہ تقریر کروں گا، حضرات انصار کو

سمجھاؤں گا، ہم وہاں پہنچے تو حضرات انصار کی گرما گرم تقریریں ہو رہی تھیں کہ بھئی اس خلافت میں تو صرف ہمارا ہی حق ہے، مہاجرین کا کوئی حق نہیں ہے، یہ تو مقامی لوگوں کی چیز ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی اور مہاجرین بھی ہمارے مہمان تھے، نظم ونسق کا حصہ تو انصار کے پاس ہونا چاہئے، جب یہ تینوں حضرات تشریف لے گئے، چونکہ بزرگ تھے، اس لئے حضرات انصار خاموش ہوگئے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں اٹھنے لگا کہ میں تقریر کروں، حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے میرا بازو پکڑ کر مجھے بٹھا دیا، جیسا کہ معلوم ہے حضرت عمر رضی اللہ عنہ ذرا تیز آدمی تھے اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نہایت حلیم تھے۔

حضرت صدیقؓ کی حکمت عملی:

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کھڑے ہوگئے، اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا کی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر درود شریف پڑھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سانحہ ارتحال پر تعزیت کی، پھر حضراتِ انصار کے فضائل بیان فرمائے اور انہوں نے اسلام کی خاطر جو جو جانفشانیاں کی تھیں، ان کو ذکر فرمایا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور مہاجرین کی جس طرح خدمت کی، اس کا تذکرہ فرمایا اور پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے انصار کے جو فضائل بیان فرمائے ہیں، وہ ذکر فرمائے، اس انداز سے تذکرہ کیا کہ تمام آنکھیں اشکبار تھیں اور سب کے سب رو رہے تھے، اس کے بعد فرمایا کہ بھائیو! تمہیں معلوم ہوگا اور آپ حضرات میں سے اکثر کو یاد ہوگا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا تھا:

”اَلنَّاسُ تَبعٌ لِقُرَیْشٍ فِیْ ھٰذَا الشَّانِ مُسْلِمُھُمْ تَبعٌ لِمُسْلِمِھِمْ وَکَافِرٌ تَبعٌ لِکَافِرِھِمْ۔“ (مشکوٰۃ ص:۵۵۰)

ترجمہ:......”لوگ ہمیشہ قریش کے تابع رہیں گے،

اس شان میں کہ ان کے مسلمان، مسلمان قریش کے تابع رہیں گے، اور کافر، کافر قریش کے تابع رہیں گے۔“

اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی فرمادیا تھا کہ: ”اَلْاَئِمَّةُ مِنْ قُرَيْشٍ۔“ یعنی امام قریش میں سے ہوں گے، یعنی حکام۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ قریش میں سے امام ہونا چاہئے یعنی خلیفہ اور حاکم اور آپ حضرات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں بھی دین کے انصار اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے وزیر تھے، اب بھی یہی منصب تمہیں ملے گا۔

ایک صاحب انصار میں سے اٹھ کر کہنے لگے، ایک اعرابی کا فقرہ ضرب المثل ہے وہ انہوں نے پڑھا اور کہا کہ میں اس کا فیصلہ کئے دیتا ہوں: ”مِنَّا اَمِيْرٌ وَمِنْكُمْ اَمِيْرٌ۔“ ایک امیر ہمارا اور ایک امیر تمہارا۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ بھائیو! کبھی ایک نیام میں دو تلواریں بھی سمائی ہیں؟ نہیں! بلکہ ”مِنَّا اَمِيْرٌ وَمِنْكُمْ وَزِيْرٌ“ امیر قریش میں سے ہوں گے اور وزیر تمہارے ہوں گے۔ یہ کہا تو اس کے بعد فرمایا: قریش کے یہ دو بزرگ تمہارے پاس موجود ہیں، حضرت عمر بن خطاب اور ابوعبیدہ بن الجراح رضی اللہ عنہما۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس حالت میں ان سے رخصت ہوئے ہیں کہ آپ ان سے راضی تھے، ان میں سے ایک کے ہاتھ پر بیعت کرلو۔

حضرت صدیق اکبرؓ سے صحابہؓ کی بیعت:

حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جو تقریر میں سوچتا ہوا گیا تھا، ساری باتیں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے کہہ ڈالیں، میری ایک بات بھی نہیں چھوڑی اور آپ کی پوری تقریر میں مجھے کوئی بات بری نہیں لگی، کسی بات سے مجھے

اختلاف نہیں تھا، سوائے اس بات کے کہ: ’’یہ دو بزرگ موجود ہیں، ان میں سے ایک کی بیعت کرلو‘‘ تو یہ بات مجھے بری لگی اور میں اٹھ کر کھڑا ہوگیا، میں نے کہا: اس قوم کو شرم نہیں آئے گی جن میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ موجود ہوں اور وہ کسی دوسرے کی بیعت کرے؟ میں نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر بیعت کرنے کے لئے ہاتھ بڑھایا تھا کہ ایک انصاری نے مجھ سے پہلے بیعت کرلی اور پھر تو وہاں جتنے آدمی تھے، سب کے سب نے بیعت کرلی۔ وہاں ثقیفہ بنی ساعدہ میں صرف اتنا اختلاف ہوا تھا۔

حضرت صدیقؓ کا قصور؟

مگر شیعہ لوگ آج تک اس بات کو معاف کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں کہ ابوبکر وعمر (رضی اللہ عنہما) نے امت پر یہ احسان کیوں کیا؟ ان کو ایک کلمہ پر متفق کیوں کردیا؟ ان کے درمیان اتحاد و اتفاق کیوں باقی رہ گیا؟ ان کو یہ اختلاف اور تکلیف ہے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے امت کی خدمت کیوں کی؟ فتنۂ ارتداد کو فرو کیوں کیا؟ اور فوجیں جاکر عراق و شام سے کیوں لڑائیں؟ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ جب خلیفہ ہوئے تو فوجیں افغانستان میں لڑ رہی تھیں اور ادھر مصر وغیرہ فتح ہوچکے تھے، اتنے ہزار مسجدیں بناکر دیں، اتنے لاکھوں انسان مسلمان ہوئے، قیصر وکسریٰ کے خزانے مسجد نبوی میں ڈھیر ہوئے اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے زمانے میں کوئی زکوٰۃ لینے والا نہیں ملتا تھا۔

پوری اسلامی آبادی میں مدت العمر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے کسی عزیز قریب رشتہ دار تک کو کسی جگہ کا حاکم مقرر نہیں کیا، حضرت سعید بن زید بن عمرو بن نفیل رضی اللہ عنہ جو عشرۂ مبشرہ میں ہیں اور حضرت فاطمہ بنت خطاب رضی اللہ عنہا کے شوہر ہیں، وہی فاطمہؓ جن کا چہرہ حضرت عمر

رضی اللہ عنہ نے زخمی کیا تھا، ان کو کبھی کسی علاقے کا گورنر مقرر نہیں کیا، ایک قریہ کا بھی، ایک بستی کا بھی اور کسی فوج کا سپہ سالار مقرر نہیں کیا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے بیٹے، اپنے بھتیجے اور اپنے کسی عزیز کو کوئی عہدہ نہیں دیا۔ دوسرے عزیزوں کی تو بات ہی چھوڑ دو۔

دو ہی قسم کی منفعتیں ہوتی ہیں یا مالی منفعت ہوتی ہے یا لوگ اثر ورسوخ کی وجہ سے اپنے رشتے داروں کو، اپنے عزیزوں کو بھرتی کروادیتے ہیں۔

میرا چیلنج ہے:

میں نے اس منبر پر پہلے بھی چیلنج کیا تھا اور آج پھر کرتا ہوں کہ حضرات ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما کے ذمہ اگر بیت المال کا کوئی پائی پیسہ باقی ہے تو میں دینے کے لئے تیار ہوں، اور ان کے زمانے میں ان کا کوئی عزیز وقریب حاکم مقرر ہوا ہو تو آکر میری گردن پکڑلو، اور اگر وہ بھی نہیں ہوا، یہ بھی نہیں ہوا، ایک پیسہ انہوں نے بیت المال کا استعمال نہیں کیا، جو استعمال کیا تھا وہ بھی واپس کردیا، اور ایک عزیز و قریب کو بھی انہوں نے کسی علاقے کا گورنر مقرر نہیں کیا، تو تم انصاف سے بتاؤ کہ بارہ سال خدمت کا صلہ یہ گالیاں ہیں؟ انہوں نے کیا مفاد اٹھایا ہے؟ مجھے یہ تو بتاؤ آج تک ''غصبِ خلافت، غصبِ خلافت'' کا شور مچارہے ہو، مجھے بتاؤ کہ خلافت کو غصب کرکے کہاں لے گئے تھے؟ انہوں نے ایک جھونپڑی بھی بنائی؟ چونکہ خلیفہ صاحب ہیں تو ان کا مکان اچھا بنادو، جو کچھ تھا اللہ تعالیٰ کی خاطر تھا، رضائے الٰہی کے لئے تھا

یہی قصہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا تھا، جس کو لوگ بدنام کرتے ہیں، پہلے بزرگوں نے تو بیت المال سے تنخواہ اور معمولی وظیفہ لیا تھا، لیکن وہ بھی بعد میں واپس کردیا، لیکن حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے شروع سے لی ہی نہیں، جو خدمت کی اللہ

تعالیٰ کے لئے کی، یہ چار ہمارے خلفائے راشدین ہیں، ان کی سیرت، ان کا عدل، ان کا انصاف، ان کی حکمرانی، رعایا پروری اس کے واقعات ریکارڈ میں محفوظ ہیں، گم نام نہیں ہیں۔ انبیاءؑ کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کے بعد ایسا پاکیزہ معاشرہ فلک نے کہیں دیکھا ہے تو مجھے بتاؤ؟ یہ وہ خلفاءؑ ہیں جن کے بارے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: میرے بعد کچھ حاکم ہوں گے جو اس علم پر عمل کریں گے جو میں تمہیں دے کر جارہا ہوں، اور ان اعمال کو بجالائیں گے جن پر میں امت کو چھوڑ کر جارہا ہوں، لہٰذا ان کی اطاعت اللہ تعالیٰ کی بندگی اور طاعت ہے۔ جس نے میرے مقرر کئے ہوئے امیر کی اطاعت کی، اس نے میری اطاعت کی، جس نے میری اطاعت کی، اس نے اللہ کی طاعت کی، ''وَمَنْ عَصٰی اَمِیْرِیْ فَقَدْ عَصَانِیْ، وَمَنْ عَصَانِیْ فَقَدْ عَصَی اللّٰہَ۔'' اور جس نے میرے مقرر کئے ہوئے امیر کی نافرمانی کی، اس نے میری نافرمانی کی اور جس نے میری نافرمانی کی، اس نے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کی۔

حضرت علیؓ کی گواہی:

حضرت امیر المؤمنین اسد اللہ الغالب علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ ہمارے خلیفہ چہارم کوفہ کے منبر پر تشریف فرما تھے، کسی نے آکر کہا کہ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ آپ حضرات ابوبکر وعمر (رضی اللہ عنہما) سے افضل ہیں۔ کوفہ کے منبر پر خطبہ ارشاد فرمایا (شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمہ اللہ کے بقول جس کو نقل کرنے والے اسّی آدمی ہیں) کہ: ''میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ اس امت میں سب سے افضل ابوبکرؓ ہیں، ان کے بعد عمرؓ اور اگر میں چاہوں تو تیسرے آدمی کا بھی نام لے سکتا ہوں۔'' منبر سے اترتے ہوئے ارشاد فرمایا: ''ثم عثمان، ثم عثمان'' پھر عثمان ہیں، پھر عثمان ہیں۔

ابوبکرؓ وعمرؓ سے افضل کہنے والے کو حد لگاؤں گا:

اور یہ بھی اسی خطبہ میں ارشاد فرمایا کہ: ''آئندہ مجھے کسی کے بارے میں اطلاع پہنچی کہ وہ مجھے ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما سے افضل کہتا ہے اس پر مفتری کی حد لگاؤں گا۔'' بہتان لگانے والے کی حد اسّی کوڑے ہے۔

حضرت علیؓ اپنی مرضی سے کوفہ گئے تھے:

ابن کوّا نے پوچھا کہ: امیر المؤمنین! ذرا اس کی وضاحت کریں۔ (اس خطبہ میں نہیں دوسرے موقع کی بات ہے) ذرا یہ تو وضاحت فرمائیں کہ یہ جو یہاں آپ تشریف لائے ہیں، مدینے سے چل کر کوفہ آئے ہیں، ذرا فرمایئے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کو حکم فرمایا تھا یا آپ اپنی رائے اور اجتہاد سے تشریف لائے ہیں؟ فرمایا: ''میں پہلا شخص نہیں بنوں گا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر جھوٹ بولے، حضور نے مجھے کوئی حکم نہیں دیا، یہ میری ایک رائے تھی، میں اپنی رائے سے آیا ہوں۔

حضرت علیؓ کی موجودگی میں صدیقؓ کو امام بنایا:

پھر قصہ بیان فرمایا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بیمار ہوئے اور کئی دن بیمار رہے اور ان دنوں میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مسجد میں تشریف لانے اور نماز پڑھانے سے بھی قاصر رہے، میں موجود تھا آپ کے سامنے، آپ کو میری موجودگی کا اور میری حاضری کا علم تھا، اس کے باوجود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں: ''ابوبکرؓ سے کہو کہ لوگوں کو نماز پڑھائے۔''

صدیقؓ کی موجودگی میں عمرؓ کی امامت بھی روا نہیں تھی:

ایک دفعہ ایسا ہوا کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کہیں پہنچے نہیں تھے، نماز کا وقت ہوگیا تو موذن صاحب (حضرت بلال رضی اللہ عنہ) نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ

سے کہہ دیا کہ آپ نماز پڑھا دیں، انہوں نے کہا اگر تم کہو تو پڑھا دوں گا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نماز پڑھانے کے لئے کھڑے ہوئے، آواز بہت اونچی تھی، بلند تھی، نر آدمی تھے (الحمدللہ! آج تک حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی آواز گونج رہی ہے)، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو جب آواز پہنچی، فرمایا: ''لَا! لَا! لَا!'' نہیں! نہیں! نہیں! ابوبکر کے سوا اللہ تعالیٰ بھی اور اہل ایمان بھی سب انکار کرتے ہیں۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جس کو ہماری نماز کا امام بنایا:

حضرت علی رضی اللہ عنہ فرمانے لگے کہ میں موجود تھا، غیر حاضر نہیں تھا، میرے ہوتے ہوئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو مصلّے پر کھڑا کیا تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم دنیا سے تشریف لے گئے تو ہم نے کہا کہ نماز دین کا سب سے اونچا عمل ہے، جب یہ کام حضور صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ابوبکرؓ کے سپرد کرکے گئے ہیں تو باقی دنیا کے معاملات بھی حضرت ابوبکرؓ کے سپرد کرکے گئے، چلو قصہ ختم! چنانچہ میں ان کے زمانے میں ان کے مخلص رفیق اور وزیر کی حیثیت سے رہا۔

حضرت عمرؓ کا انتخاب:

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اپنے رب کے پاس گئے تو جانے سے پہلے انہوں نے کہہ دیا کہ حضرت عمرؓ کو خلیفہ بناؤ، میں نے کہا: ''السمع و الطاعة!'' چنانچہ حضرت عمرؓ کے زمانہ میں میں ان کا بہترین رفیق اور وزیر رہا، مالِ غنیمت میں حصہ آتا تھا تو مجھے دیتے تھے، مجھے جہاد کے لئے بھیج دیتے تھے تو میں جاتا تھا، مجھ سے مشورہ طلب فرماتے تھے تو میں مشورہ دیتا تھا، جو کام میرے ذمہ لگاتے تھے بصد شوق، دل و دماغ کے پورے اتفاق کے ساتھ میں سرانجام دیتا تھا۔

حضرت عثمانؓ کا انتخاب:

اور جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ دنیا سے تشریف لے گئے تو ہمارے چھ

آدمیوں کی کمیٹی بناگئے اور یہ چھ آدمی عشرۂ مبشرہ میں سے تھے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ جس دن دنیا سے تشریف لے گئے، (عشرۂ مبشرہ جانتے ہو؟ جن کو جنت کی بشارت ملی) ان میں سے سات آدمی موجود تھے، تین رخصت ہوچکے تھے، حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ رخصت ہوچکے تھے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ خود رخصت ہو رہے تھے اور ایک اور بزرگ رخصت ہو رہے تھے، بلکہ ہوچکے تھے، باقی سات آدمی تھے ان سات آدمیوں میں ایک حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے بہنوئی تھے، فرمایا ان کو شامل نہیں کروں گا، عجیب بات ہے! ان کو شامل نہیں کروں گا وہ میرے بہنوئی ہیں، باقی چھ جو رہ گئے ہیں ان پر مشتمل کمیٹی بنادی اور فرمایا: یہ چھ آدمی وہ ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو جنت کی بشارت دی ہے، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دنیا سے اس حال میں رخصت ہوئے ہیں کہ ان سے راضی تھے، لہٰذا یہی فیصلہ کریں گے کہ کون خلیفہ بنے گا؟ جو یہ فیصلہ کریں پوری امت اس کو مانے۔ یہ ادارۂ انتخاب ہے اور تین دن تک ان حضرات کو اپنا فیصلہ سنانا ہوگا، اس زمانے میں حضرت صہیب رومی رضی اللہ عنہ مسجد میں نماز پڑھایا کریں گے، حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جب حضرت عمر ہم چھ آدمیوں کی جماعت تشکیل دے گئے، اس وقت مجھے نفس نے کہا تھا کہ اب تیرا موقع ہے، لیکن اس جماعت میں حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ تھے، انہوں نے کہا کہ بھائیو! میں تو اس سے دست بردار ہوتا ہوں، میں خلافت کا امیدوار نہیں، میں اپنا نام واپس لیتا ہوں، تم چاہو تو میں تمہارا فیصلہ کرسکتا ہوں، باقی پانچ آدمی ہیں فیصلہ کردیتا ہوں، اس سے پہلے تین آدمیوں نے تین آدمیوں کے معاملہ سپرد کردیا تھا، حضرت عبدالرحمٰن، حضرت عثمان اور حضرت علی رضی اللہ عنہم یہ ہی تین رہ گئے تھے، باقی تین نے اپنا معاملہ ان کے سپرد کردیا تھا، حضرت سعد بن ابی وقاصؓ نے حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ کے حق میں، حضرت زبیرؓ نے حضرت عثمانؓ کے حق میں اور حضرت طلحہؓ نے حضرت علیؓ کے حق میں اپنا معاملہ سپرد کردیا تھا (رضی اللہ

عنہم اجمعین) کہ یہ حضرات جو فیصلہ کریں گے ٹھیک ہے، اب تین آدمی درمیان میں رہ گئے، حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ نے کہا کہ میں خلافت سے دستبردار ہوتا ہوں اس شرط پر کہ ان دو آدمیوں میں سے جس کو مناسب سمجھوں اس کو مقرر کردوں، سب نے کہا کہ منظور ہے، چھ کے چھ نے کہا کہ منظور ہے، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے پوچھا کہ اگر علیؓ کو میں خلیفہ مقرر کردوں تو تم بیعت کرو گے؟ انہوں نے کہا: شوق سے! حضرت علی رضی اللہ عنہ سے پوچھا کہ اگر عثمانؓ کو مقرر کردوں، بیعت کرو گے؟ کہنے لگے کہ بالکل خوشدلی سے۔ یہ پہلے دن کے اجلاس کی کاروائی تھی چونکہ تین دن کے بعد فیصلہ سنانا تھا، حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ان تین راتوں میں میں سویا نہیں، پردہ نشین عورتوں کے پاس جاکر بھی میں نے پوچھا کہ ان دو بزرگوں میں سے کس کو مقرر کیا جائے؟ سب نے یہ ہی رائے دی کہ حضرت عثمانؓ کو مقرر کرو، گویا ووٹ بھی لئے گئے لیکن خفیہ، چنانچہ تیسرے دن جب اجلاس ہوا، حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اس دن میرے نفس میں کچھ خواہش پیدا ہوئی تھی کہ مجھے خلیفہ بنایا جائے، لیکن جب میں نے دیکھا تو ''عَهْدٌ فِیْ عُنُقِیْ'' حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ نے جو عہد مجھ سے لیا تھا وہ میری گردن میں پہلے پڑچکا تھا، اب میں اس کی خلاف ورزی نہیں کرسکتا تھا، چنانچہ حضرت عثمانؓ خلیفہ ہوگئے، اور حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جب تک وہ خلیفہ رہے میں ان کا ناصح وزیر رہا، مشیر رہا جس طرح کہ حضرت ابوبکرؓ وعمرؓ کا تھا، اور جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو شہید کردیا گیا تو میں نے دیکھا کہ حضرت ابوبکرؓ وعمرؓ کا عہد پورا کرچکا ہوں، عثمانؓ کا عہد جو میری گردن میں تھا پورا کرچکا ہوں اب پیچھے کون رہ گیا؟ موٹی سی بات ہے کہ وہ ادارۂ خلافت جو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے قائم کیا تھا، اس میں ایک ہی آدمی پیچھے رہ گیا، وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ تھے۔ یہ ساری تفصیلات میری کتاب ''شیعہ سنی اختلافات اور صراطِ مستقیم'' میں آگئی ہیں، اس میں یہ ساری تفصیلات ذکر کردی گئی ہیں۔

بہرکیف! یہ خلفائے راشدینؓ ہیں اور جیسا کہ میں نے کتاب کا حوالہ دیا ہے، ہمارے اکابر اور ان کی اقتدأ کرتے ہوئے میں نے بھی قرآن کریم کی چار آیات سے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے چار ارشادات سے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے چار اقوال سے ان حضرات کا خلیفہ راشد ہونا ثابت کیا ہے، چوتھے میں تو کوئی اختلاف ہی نہیں ہے، یہ حضرات خلیفہ راشد تھے تو ان کے بارے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ ان کی اطاعت بجا لانا عبادت ہے۔ اور اس کے بعد پھر اور خلفأ ہوئے ان میں کچھ عادل تھے، کچھ جائر تھے۔

حضرت معاویہؓ خلیفہ عادل تھے:

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ خلیفہ عادل تھے اور اسی طرح حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ خلیفہ عادل تھے، حافظ ابن تیمیہ رحمہ اللہ کا فقرہ میں نے اس کتاب میں نقل کیا ہے کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ رضی اللہ عنہم کی صف کے آدمی نہیں تھے، لیکن ان کے بعد ایسا خلیفہ اور ایسا حاکم کبھی پوری امت میں نہیں ہوا، ایسا عادل خلیفہ امت میں نہیں ہوا، حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کے عدل کا چرچا ہے، لیکن حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے عدل کے ساتھ ان کا کوئی جوڑ نہیں۔ اور کچھ حاکم جائر بھی ہوئے ہیں، ظالم بھی ہوئے، منحرف تھے، ان کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ جو ان کے ساتھ ان کی قیادت کرے گا وہ خود بھی ہلاک ہوگا، لوگوں کو بھی ہلاک کرے گا، تم ان سے مل کر رہو لیکن اپنے اعمال الگ رکھو اور وہ قصہ آگے چلتے چلتے اب ہمارے ہاں پہنچ چکا ہے اور جو حال ہے وہ آپ کے سامنے ہے، اور دوسری حدیث میں یہ ایک مستقل موضوع ہے، یعنی حکام کو جو نذرانے پیش کئے جاتے ہیں اس کا کیا حکم ہے؟ اللہ تعالیٰ نے توفیق دی تو پھر اس پر عرض کروں گا۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

مہاجرین وانصار کی فضیلت

امیرالمؤمنین کا لفظ جو ہے ناں! یہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں ایجاد ہوا، امیرالمؤمنین کی اصطلاح خلیفۃ المسلمین کے لئے حضرت عمرؓ کے زمانے میں ایجاد ہوئی، صحابہؓ نے حضرت عمرؓ کو امیرالمؤمنین کہنا شروع کیا، حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو امیر المؤمنین نہیں کہتے تھے، ان کو امیرالمؤمنین نہیں کہا جاتا تھا، ان کو جب بھی بلاتے یا خلیفۃ رسول اللہ! کہہ کر بلاتے تھے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلیفہ، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مسند کی جانشینی انہی کو زیبا تھی۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم
الحمدللہ وسلام علی عبادہ الذین اصطفی!

الف:......"اَخرَجَ الطَّبرَانِیُّ عَنْ مُعَاوِیَۃَ بْنِ اَبِیْ سُفْیَانَ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُمَا قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ: صُبُّوْا عَلَیَّ مِنْ سَبْعِ قِرَبٍ مِنْ آبَارٍ شَتّٰی، حَتّٰی اَخْرُجَ اِلَی النَّاسِ فَاَعْھَدَ اِلَیْھِمْ۔ قَالَ: فَخَرَجَ عَاصِبًا رَأْسَہٗ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ حَتّٰی صَعِدَ الْمِنْبَرَ، فَحَمِدَ اللّٰہَ وَاَثْنٰی عَلَیْہِ، ثُمَّ قَالَ: اِنَّ عَبْدًا مِنْ عِبَادِ اللّٰہِ خُیِّرَ بَیْنَ الدُّنْیَا وَبَیْنَ مَا عِنْدَ اللّٰہِ، فَاخْتَارَ مَا عِنْدَ اللّٰہِ۔ فَلَمْ یَلْقَنْھَا اِلَّا اَبُوْبَکْرٍ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ، فَبَکٰی فَقَالَ: نَفْدِیْکَ بِآبَائِنَا وَاُمَّھَاتِنَا وَاَبْنَائِنَا! فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ: عَلٰی رِسْلِکَ۔ اَفْضَلُ النَّاسِ عِنْدِیْ فِی الصُّحْبَۃِ وَذَاتِ الْیَدِ ابْنُ اَبِیْ قُحَافَۃَ، اُنْظُرُوْا ھٰذِہِ الْاَبْوَابَ الشَّوَارِعَ فِی الْمَسْجِدِ فَسُدُّوْھَا، اِلَّا مَا کَانَ مِنْ بَابِ اَبِیْ بَکْرٍ، فَاِنِّیْ رَأَیْتُ عَلَیْہِ نُوْرًا۔" (حیاۃ الصحابۃ ج:۳ ص:۴۲۸)

ب:......’’وَاَخرَجَ الْبَیْهَقِیُّ عَنْ اَیُّوْبَ بْنِ بَشِیْرٍ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ فِیْ مَرَضِهٖ: اَفِیْضُوْا عَلَیَّ۔ فَذَکَرَهٗ بِنَحْوِهٖ وَزَادَ، فَکَانَ اَوَّلُ مَا ذَکَرَ بَعْدَ حَمْدِ اللّٰهِ وَالثَّنَاءِ عَلَیْهِ، ذِکْرُ اَصْحَابِ اُحُدٍ فَاسْتَغْفَرَ لَهُمْ وَدَعَا لَهُمْ، ثُمَّ قَالَ: یَا مَعْشَرَ الْمُهَاجِرِیْنَ! اِنَّکُمْ اَصْبَحْتُمْ تَزِیْدُوْنَ وَالْاَنْصَارُ عَلٰی هَیْئَتِهَا لَا تَزِیْدُ، وَاِنَّهُمْ عَیْبَتِی الَّتِیْ اَوَیْتُ اِلَیْهَا، فَاَکْرِمُوْا کَرِیْمَهُمْ، وَتَجَاوَزُوْا عَنْ مُسِیْئِهِمْ۔ ثُمَّ قَالَ عَلَیْهِ السَّلَامُ: اَیُّهَا النَّاسُ! اِنَّ عَبْدًا مِنْ عِبَادِ اللّٰهِ..... فَفَهِمَهَا اَبُوْبَکْرٍ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُ مِنْ بَیْنِ النَّاسِ فَبَکٰی۔‘‘ (حیاۃ الصحابۃ ج:۳ ص:۴۲۹)

ج:......’’وَعِنْدَ اَحْمَدَ عَنْ اَبِیْ سَعِیْدٍ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: خَطَبَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ النَّاسَ فَقَالَ: اِنَّ اللّٰهَ عَزَّ وَجَلَّ خَیَّرَ عَبْدًا بَیْنَ الدُّنْیَا وَبَیْنَ مَا عِنْدَهٗ، قَالَ فَاخْتَارَ ذَالِکَ الْعَبْدُ مَا عِنْدَ اللّٰهِ۔ قَالَ: فَبَکٰی اَبُوْبَکْرٍ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُ، فَعَجِبْنَا لِبُکَائِهٖ اَنَّ خَبَرَ رَسُوْلِ اللّٰهِ عَنْ عَبْدٍ خُیِّرَ، وَکَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ هُوَ الْمُخَیَّرُ، وَکَانَ اَبُوْبَکْرٍ اَعْلَمَنَا بِهٖ۔ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ: اِنَّ اَمَنَّ النَّاسِ عَلَیَّ فِیْ صُحْبَتِهٖ وَمَالِهٖ اَبُوْبَکْرٍ، وَلَوْ کُنْتُ مُتَّخِذًا مِنَ النَّاسِ خَلِیْلًا غَیْرَ رَبِّیْ لَاتَّخَذْتُ اَبَابَکْرٍ، وَلٰکِنْ خُلَّةُ الْاِسْلَامِ اَوْ مَوَدَّتُهٗ، لَا یُبْقٰی بَابٌ فِی الْمَسْجِدِ اِلَّا سُدَّ، اِلَّا بَابَ اَبِیْ بَکْرٍ۔‘‘ (مسند احمد ج:۳ ص:۱۸)

الف:......ترجمہ:......" حضرت معاویہ بن ابی سفیان رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مجھ پر مختلف کنوؤں کے پانی کے سات مشکیزے ڈالو، تاکہ میں لوگوں کی طرف نکلوں اور ان کو کچھ وصیتیں کروں۔ چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے، سر مبارک پر پٹی بندھی ہوئی تھی، منبر پر تشریف لے گئے، اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا کی، اس کے بعد فرمایا کہ: ایک بندے کو اللہ کے بندوں میں سے دنیا کے درمیان اور جو چیز کہ اللہ کے پاس ہے اختیار دیا گیا ہے، پس اس نے اللہ کے پاس کی چیز کو اختیار کرلیا۔ اس بات کو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے سوا کسی نے نہیں سمجھا، وہ رو پڑے اور کہا کہ ہم آپ پر قربان کرتے ہیں اپنے باپوں کو، اپنی ماؤں کو اور اپنے بیٹوں کو یا رسول اللہ! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ٹھہرو! تمام لوگوں سے افضل میرے نزدیک رفاقت میں اور اپنے مال میں ابوبکر بن ابی قحافہؓ ہیں، دیکھو یہ دروازے جو کھل رہے ہیں مسجد کی طرف ان سب کو بند کردو، صرف ایک ابوبکر کا دروازہ باقی رہے، کیونکہ میں اس پر نور دیکھتا ہوں۔"

ب:......ترجمہ:......" بیہقی کی روایت حضرت ایوب بن بشیر رضی اللہ عنہ سے ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے مرض الوفات میں فرمایا کہ مجھ پر سات مشکیزے مختلف کنوؤں کے ڈالو، باہر تشریف لائے تو اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا کے بعد اصحاب احد کا، شہدائے احد کا تذکرہ کیا، ان کے لئے استغفار فرمایا، ان کے لئے دعائیں فرمائیں، پھر فرمایا کہ: اے

مہاجرین کی جماعت! تم زیادہ ہوتے رہوگے اور انصار اپنی حالت پر رہیں گے، یہ زیادہ نہیں ہوں گے، یہ میرے مخصوص لوگ ہیں اور میری پناہ گاہ ہے، جن کی طرف میں نے پناہ لی تھی، اس لئے ان کے شرفا کی عزت کرو اور ان میں سے کسی سے غلطی ہو جائے تو اس سے تجاوز کرو۔ پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ: لوگو! ایک بندے کو اللہ تعالیٰ کے بندوں میں سے اللہ تعالیٰ نے اختیار دیا۔ آگے وہی بات فرمائی، تو حضرت ابوبکرؓ اس بات کو سمجھے اور رو پڑے۔''

ج:...... ''حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کی حدیث مسند احمد میں ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے ایک بندے کو اختیار دیا ہے دنیا کے درمیان اور اس چیز کے درمیان جو اس کے پاس ہے، اس بندے نے اللہ کے پاس کی چیز کو اختیار کرلیا۔ تو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ رو پڑے، ہمیں ان کے رونے پر تعجب ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تو ایک بندے کے بارے میں خبر دے رہے ہیں، اور یہ (بوڑھا شخص) رو رہا ہے، لیکن ہمیں بعد میں پتہ چلا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہی اختیار دیا گیا تھا، اور حضرت ابوبکرؓ ہم میں سب سے بڑے عالم تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ: مجھ پر سب سے بڑھ کر احسان رفاقت میں اور مال میں ابوبکر کا ہے، اگر میں اپنے رب کے سوا کسی کو خلیل بناتا تو ابوبکر کو بناتا، لیکن اسلام کی دوستی اور اسلام کی محبت باقی ہے، مسجد میں کوئی دروازہ باقی نہ رکھا جائے

سوائے ابوبکر کے دروازے کے۔“

یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا آخری خطبہ شریفہ ہے، اس کے بعد کبھی منبر پر رونق افروز نہیں ہوئے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ سات مختلف کنوں کا پانی لاؤ اور وہ مجھ پر ڈالو، مجھے نہلاؤ، چنانچہ حکم کی تعمیل کی گئی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم غسل فرماکر دو آدمیوں کے سہارے باہر تشریف لائے، سر مبارک پر پٹی بندھی ہوئی تھی، اور صحیح بخاری کی روایت میں ہے کہ:

”عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْهُ یَقُوْلُ خَرَجَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ وَعَلَیْهِ مِلْحَفَةٌ مُنْعَطِفًا عَلٰی مَنْکِبَیْهِ وَعَلَیْهِ عِصَابَةٌ دَسْمَاءَ حَتّٰی جَلَسَ عَلَی الْمِنْبَرِ ..... الخ۔“ (بخاری ج:۱ ص:۵۳۶)

ترجمہ:......”حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم گھر سے باہر تشریف لائے آپ پر ایک چادر تھی جو آپ نے دونوں کندھوں پر ڈالی ہوئی تھی اور آپ کے سر پر ایک پٹی تھی جو میلی ہو رہی تھی آپ منبر پر تشریف فرما ہوئے .....“

اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا کے بعد ارشاد فرمایا کہ: اللہ کے بندوں میں سے ایک بندے کو دنیا میں رہنے کا اور اللہ تعالیٰ کے پاس جانے کا اختیار دیا گیا، اس نے اللہ تعالیٰ کے پاس جو نعمتیں ہیں ان کو اختیار کرلیا، دنیا میں رہنا پسند نہیں کیا۔ صحابہ کرامؓ فرماتے ہیں کہ ہم بات کو نہیں سمجھے، حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ یہ سن کر رونے لگے، اور کہنے لگے کہ: ”بِاٰبَائِنَا وَاُمَّهَاتِنَا وَاَبْنَائِنَا!“ یا رسول اللہ! ہمارے باپ، ہماری مائیں اور ہمارے بیٹے آپ پر قربان ہوں! صحابہؓ فرماتے ہیں کہ ہمیں بڑا تعجب ہوا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تو ایک آدمی کے بارے میں بتا رہے ہیں، اللہ کے ایک بندے کو دنیا میں رہنے کا یا یہاں سے رخصت ہونے کا اختیار دیا گیا اور یہ بوڑھا

کیوں رو رہا ہے؟ لیکن اصل بات یہ تھی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خود اپنے بارے میں ارشاد فرمارہے تھے، تب ہمیں معلوم چلا کہ ابوبکر ہم سے بڑے عالم تھے۔

وفات سے پہلے انبیاءٔ علیہم السلام سے استفسار:

یہاں یہ بات یاد رکھو کہ حضرات انبیاءٔ کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کے بارے میں تو اللہ تعالیٰ کی مستقل سنت چلی آتی ہے کہ ان کو وقت سے پہلے آگاہ کردیا جاتا ہے اور پھر پوچھا جاتا ہے کہ: یہاں رہنا چاہتے ہو تو مزید تاخیر کردی جائے، یا چلنا چاہتے ہو تو وقت مقررہ آچکا ہے، حضرات انبیاءٔ کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام جن کی نظر دنیا تک محدود نہیں ہے، بلکہ ان کو اس آڑ اور پردہ کے پار کی چیزیں بھی ویسی ہی نظر آرہی ہوتی ہیں جیسے یہاں کی چیزیں نظر آتی ہیں، وہ اس اختیار ملنے پر دنیا میں رہنا کب پسند کریں گے؟ تمام انبیاءٔ کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کا جواب ایک ہی رہا کہ چلنا ہے، یعنی یہاں نہیں رہنا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کا عزرائیل کو مارنا:

صحیح بخاری شریف میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کا قصہ آتا ہے کہ:

”عَنْ اَبِیْ ہُرَیْرَۃَ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ قَالَ: اُرْسِلَ مَلَکُ الْمَوْتِ اِلٰی مُوْسٰی فَلَمَّا جَاءَہٗ صَکَّہٗ فَرَجَعَ اِلٰی رَبِّہٖ فَقَالَ: اَرْسَلْتَنِیْ اِلٰی عَبْدٍ لَا یُرِیْدُ الْمَوْتَ! قَالَ: اِرْجِعْ اِلَیْہِ فَقُلْ لَّہٗ یَضَعُ یَدَہٗ عَلٰی مَتْنِ ثَوْرٍ فَلَہٗ بِمَا غَطَّتْ یَدَہٗ بِکُلِّ شَعْرَۃٍ سَنَۃٌ۔ قَالَ: اِیْ رَبِّ ثُمَّ مَاذَا؟ قَالَ: ثُمَّ الْمَوْتُ! قَالَ: فَالْاٰنَ! قَالَ: فَسَأَلِ اللّٰہَ عَزَّ وَجَلَّ اَنْ یُّدْنِیَہٗ مِنَ الْاَرْضِ الْمُقَدَّسَۃِ رَمْیَۃً بِحَجَرٍ.....الخ۔“ (صحیح بخاری ج:۱ ص:۴۸۴)

ترجمہ:...... ”حضرت ابی ہریرہ رضی اللہ عنہ سے

روایت ہے کہ حضرت عزرائیل علیہ السلام حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس بھیجے گئے، جب ملک الموت ان کے پاس آئے تو انہوں نے حضرت عزرائیل علیہ السلام کو تھپڑ رسید کردیا، جس سے ان کی آنکھ نکل گئی، انہوں نے جاکر شکایت کی کہ یا اللہ! آپ نے ایک ایسے بندے کے پاس بھیجا ہے جو دنیا میں رہنا چاہتا ہے، فرمایا: (تم نے پہلے اجازت نہیں لی، آنکھ تو تمہاری بنادیتے ہیں) دوبارہ جاؤ جاکر ان سے پہلے پوچھو اور ان سے کہو اگر دنیا میں رہنا چاہتے ہیں تو ایک بیل کی پشت پر ہاتھ رکھ دیں، جتنے بال ہاتھ کے نیچے آئیں گے، اتنے سال ان کی عمر مزید بڑھادیں گے۔ اب حضرت عزرائیل علیہ السلام دوبارہ تشریف لائے، سلام عرض کیا اور حق تعالیٰ شانہ کا پیغام دیا کہ وقت تو آپ کا آچکا ہے، لیکن اگر آپ یہاں رہنا چاہتے ہیں تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ایک بیل کی پشت پر ہاتھ رکھیں، اس کے نیچے جتنے بال آئیں گے اتنے سال آپ کی عمر بڑھادی جائے گی۔ حضرت موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کو پیغام ملا تو ارشاد فرمانے لگے کہ اس کے بعد کیا ہوگا؟ کہنے لگے کہ: پھر چلیں گے! فرمایا: پھر ابھی کیوں نہ چلیں! چنانچہ فرمانے لگے کہ: مجھے ذرا وہاں تک پہنچادو، (رمیۃ بحجر) بیت المقدس کے قریب وہاں پہنچے تو جان قبض ہوگئی۔“

تو حضرات انبیائے کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کا اکرام کیا جاتا ہے کہ بغیر اجازت کے فرشتہ ان کے پاس نہیں آتا۔

بعض اولیاءُ اللہ کا اکرام:

ہمارے شیخ نور اللہ مرقدہٗ فرماتے تھے کہ ایک دفعہ حضرت عزرائیل علیہ السلام سے ملاقات ہوئی، ایک دفعہ تو جوانی کے زمانے میں ہوئی تھی تو میں نے کہا کہ: چلیں؟ تو فرشتے نے کہا کہ: نہیں! ابھی بہت وقت ہے۔ پھر فرمانے لگے کہ: بیماری کے زمانے میں کوئی تین ماہ پہلے ملاقات ہوئی، میں نے کہا: چلیں؟ کہنے لگے کہ: وقت تو اب نزدیک ہی ہے، لیکن ابھی وقفہ ہے۔ وفات سے چند دن پہلے فرمانے لگے کہ: آج عزرائیل علیہ السلام سے ملاقات ہوئی تو میں نے کہا کہ: چلیں؟ کہنے لگے کہ: بس اب چلیں گے انشاءاللہ! کہتے ہیں کہ میں نے ان سے پوچھا کہ یہ اجازت تو انبیاءِ کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام سے لی جاتی ہے، تو عزرائیل علیہ السلام نے جواب دیا کہ: انبیاءِ کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کے بارے میں تو اللہ کا قانون ہے، لیکن اللہ تعالیٰ کے بعض بندے ایسے ہیں کہ ان سے بھی اجازت لی جاتی ہے، ان کے بارے میں قانون نہیں، حق تعالیٰ شانہ کی جانب سے اکرام کا معاملہ ہوتا ہے۔ تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد ہے کہ ایک بندے کو اللہ کے بندوں میں سے دنیا کے رہنے کے درمیان اور جو کچھ اللہ کے پاس ہے، اس کے درمیان اختیار دیا گیا ہے کہ دونوں میں سے کس چیز کو اختیار کرتے ہو؟ انہوں نے ما عند اللہ کو اختیار کرلیا۔

رفیق اعلیٰ کی طرف:

ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا ارشاد فرماتی ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم آخری وقت میں ہاتھ آسمان کی طرف اٹھائے ہوئے تھے اور فرما رہے تھے: ”اَللّٰھُمَّ الرَّفِیْقَ الْاَعْلٰی۔“ یا اللہ! اوپر والے رفیق کو پسند کرتا ہوں۔ فرماتی ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سن رکھا تھا کہ انبیاءِ کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کو اختیار دیا جاتا ہے، تو جب آپ کی یہ بات میں نے سنی کہ: ”اَللّٰھُمَّ الرَّفِیْقَ الْاَعْلٰی“

میں نے کہا: "اذًا لَا یَخْتَارُنَا!" (مشکوٰۃ ص:۵۴۸) اب یہ ہمارے پاس نہیں رہیں گے، اب ہمارے پاس رہنا یہ پسند نہیں کریں گے۔

سات کنوؤں کے پانی ڈالنے کی حکمت:

دوسری بات یہ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ: سات کنووں کے مشکیزے لاؤ، اور وہ مجھ پر ڈالو۔ یہ چیز صحت کے لئے مفید ہے، لیکن بھائی! علاج کسی طبیب کے مشورے کے بغیر نہیں ہوتا، قاعدہ نہیں ہے، بسااوقات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس تدبیر سے علاج فرماتے تھے، کوئی بیمار ہوتا تو فرماتے کہ سات کنووں کا پانی لاؤ اور مریض کو غسل کرواتے، تو اس موقع پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ضعف بہت تھا اور آپ ﷺ کی خواہش تھی کہ باہر تشریف لاکر ایک دفعہ سب کو زیارت بھی کروادیں اور کچھ نصائح بھی فرمادیں۔ اس لئے فرمایا کہ مجھے سات کنووں کے پانی کے ساتھ غسل دو تاکہ ذرا تھوڑی قوت آجائے تو میں لوگوں کی طرف نکلوں اور ان کو کچھ وصیتیں کروں، کچھ نصیحتیں کروں، چنانچہ غسل فرمانے کے بعد تشریف لائے، سر درد کی وجہ سے سر پر پٹی بندھی ہوئی تھی۔

آخری بدھ کو مٹھائی بانٹنا، منافقوں کی چال:

سر درد سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا آخری مرض شروع ہوا، مرض الوفات، اور ہمارے ہاں جاہلوں نے صفر کا آخری بدھ اس کو بہت بابرکت بنادیا، آخری بدھ کو بیماری شروع ہوئی تھی اور یہ ہمارے دوست اس دن مٹھائیاں تقسیم کرتے ہیں، کارخانوں میں، فیکٹریوں میں اور اداروں میں باقاعدہ مٹھائیاں تقسیم کی جاتی ہیں۔

معلوم نہیں کس شیطان نے ان کے کان میں یہ بات ڈال دی ہے کہ اس دن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے غسل صحت فرمایا تھا، مطلب یہ ہے کہ جس دن

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بیماری شروع ہوئی، منافقوں نے، زندیقوں نے تم سے جھوٹ بول کر اس دن مٹھائیاں تقسیم کروائیں، اور یہ تحقیق کرنے کی تم نے بھی ضرورت محسوس نہیں کی کہ جاکر کسی عالم سے پوچھ لیں کہ اس کی حقیقت کیا ہے؟ یہ خالص جھوٹ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی آخری بدھ کو غسل صحت فرمایا ہو، خالص جھوٹ اور اس کی بنیاد پر مٹھائیاں تقسیم کرنا خالص جہالت۔

صفر کے آخری بدھ کو مرض الوفات کی ابتداٗ:

صفر کا آخری بدھ تھا جس دن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بیماری شروع ہوئی اور بیماری شروع ہوئی تھی سر درد سے، چنانچہ حدیث شریف میں ہے:

”عَنْ عَائِشَةَ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْھَا قَالَتْ: رَجَعَ اِلَیَّ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ ذَاتَ یَوْمٍ مِنْ جَنَازَۃٍ مِنَ الْبَقِیْعِ فَوَجَدَنِیْ وَاَنَا اَجِدُ صُدَاعًا وَاَنَا اَقُوْلُ وَا رَأْسَاہُ قَالَ بَلْ اَنَا یَا عَائِشَۃُ وَا رَأْسَاہُ قَالَ وَمَا ضَرَّکِ لَوْ مُتِّ قَبْلِیْ فَغَسَلْتُکِ وَکَفَنْتُکِ وَصَلَّیْتُ عَلَیْکِ وَدَفَنْتُکِ۔ قُلْتُ: لَکَاَنِّیْ بِکَ وَاللّٰہِ لَوْ فَعَلْتَ ذَالِکَ لَرَجَعْتَ اِلٰی بَیْتِیْ فَعَرَسْتَ فِیْہِ بِبَعْضِ نِسَائِکَ، فَتَبَسَّمَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ ثُمَّ بُدِیَٔ فِیْ وَجَعِہِ الَّذِیْ مَاتَ فِیْہِ۔“

(مشکوٰۃ ص:۵۴۹)

ترجمہ:......”ام المؤمنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا ارشاد فرماتی ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایک جنازہ سے فارغ ہوکر گھر تشریف لائے، ادھر اتفاق کی بات کہ میرے سر میں درد تھا، میں لیٹی ہوئی تھی، میں نے کہا: ”وا رأساہ!“ کہ سر میں درد ہو رہا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرمانے لگے:

اے عائشہ! سر میں درد تو میرے ہو رہا ہے، پھر ارشاد فرمایا کہ: (اے عائشہ!) تجھے کیا نقصان ہے، اگر تو میرے سامنے مر جائے تو میں تجھے اپنے ہاتھ سے غسل دوں اور کفن پہناؤں، تیری نماز جنازہ پڑھوں اور اپنے ہاتھ سے دفن کروں۔ میں نے کہا کہ: جی ہاں! آپ تو یہ ہی چاہیں گے کہ یہ مرجائے تاکہ میرے بعد اور کسی اچھی بیوی کو لائیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم مسکرائے۔ تو اس دن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بیماری سر درد سے شروع ہوئی (اور یہ حقیقت میں زہر کا اثر تھا، جو آپ کو خیبر میں دیا گیا تھا)۔‘‘

ابوبکرؓ سب سے بڑے عالم تھے:

بہرکیف! باہر تشریف لائے، منبر پر تشریف لے گئے تو یہ بات ارشاد فرمائی کہ اللہ کے ایک بندے کو اختیار دیا گیا ہے، یہ بات سن کر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سمجھ گئے اور رونے لگے۔

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ابوبکر صدیق ہم میں سب سے بڑے عالم تھے۔

علم کثرتِ معلومات کا نام نہیں:

علم معلومات کا نام نہیں ہے کہ کسی کو معلومات زیادہ ہوں، کسی چیز کی صحیح حقیقت تک پہنچ جانا اس کا نام علم ہے۔

ہمارے اکابر کا علم:

میں نے ایک موقع پر مدرسہ میں اپنے عزیز طالب علموں سے سبق پڑھاتے ہوئے عرض کیا تھا کہ مجھے اپنے اکابر سے کچھ زیادہ خوش اعتقادی ہے، حضرت نانوتوی

رحمۃ اللہ علیہ دنیا سے تشریف لے گئے، تو مولانا مناظر احسن گیلانی رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ ایک صحیح بخاری شریف کا نسخہ اور ایک قرآن کریم ان کے گھر سے برآمد ہوا، اس پر انہوں نے مرزا غالب کا یہ شعر نقل کیا ہے کہ:

چند تصویر بتاں، چند حسینوں کے خطوط
بعد مرنے کے میرے گھر سے یہ ساماں نکلا!

قلت اسباب و وسائل کا تو یہ حال ہے لیکن حجۃ الاسلام کہلاتے تھے، یعنی ان کا وجود اسلام کی حقانیت کی دلیل ہے۔ میں نے کہا: تم لوگ سالہا سال کے بعد غور وفکر کر کے قرآن و حدیث کے دلائل کو دیکھ کر جس نتیجہ پر پہنچو گے، میرا عقیدہ یہ ہے کہ میرے اکابر آنکھ کھولتے ہی وہاں پہنچ جاتے تھے۔

حضرات انبیاؑ اور ہمارے اکابر کی قوت قدسیہ:

اللہ تعالیٰ نے ان کو قوتِ قدسیہ عطا فرمائی تھی۔ فلاسفہ نے عقل انسانی کے درجات قائم کئے ہیں، ان میں ایک درجہ قوتِ قدسیہ کا ہے، انبیاؑ اور اولیاؑ کو اعلیٰ درجہ کی قوتِ قدسیہ عطا ہوتی ہے، ان کو مقدمات کی ترتیب دینے کی ضرورت نہیں ہوتی، کسی بات پر غور وفکر کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی، بلکہ جب بھی وہ کسی چیز کی طرف متوجہ ہوتے ہیں علم لَدُنِّی کے طور پر فوراً اس کی حقیقت تک پہنچ جاتے ہیں، اس کا نام علم ہے۔

مستشرقین کا علم حرف شناسی ہے:

حرف شناسی کا نام علم نہیں ہے، اگر اس کا نام علم ہوتا تو مستشرقین سب سے بڑے عالم ہوتے۔ ”مفتاح کنوز السنۃ“ ایک کتاب ہے جو ایک عیسائی مستشرق کی لکھی ہوئی ہے، حدیث کی کتابوں میں جہاں جہاں کوئی احادیث آئی ہیں، اس نے ان کو عنوانات پر تقسیم کردیا، مثلاً حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے بارے میں کیا کیا

احادیث ہیں۔ اور مستشرقین کی ایک جماعت نے ایک کتاب بڑی بڑی، موٹی موٹی آٹھ جلدوں میں جو اب سولہ جلدوں میں چھپی ہے، لکھی ہے، اس میں یہ بتایا ہے کہ حدیث کا فلاں لفظ، حدیث کی فلاں کتاب اور فلاں باب میں آیا ہے، اس کتاب کا نام ہے: ''المعجم المفهرس لِاَلفاظ الحديث''، لیکن اس کے باوجود وہ ایمان سے محروم ہیں، اس علم کو کوئی کیا کرے گا؟ اس لئے کہ: ''علم کہ راہ بحق نہ نماید جہالت است۔'' چنانچہ شیخ سعدیؒ نے اسی لئے فتویٰ دیا تھا کہ:

سعدی بشوئے از لوح دل نقش غیرحق
علم کہ راہ بحق نہ نماید جہالت است

فرماتے ہیں کہ: ''دل کی تختی سے غیرحق کے نقوش کو مٹا ڈالو اور دھو ڈالو اس لئے کہ جو علم حق کی طرف راہ نمائی نہیں کرتا وہ علم نہیں جہالت ہے۔''

جز یادِ دوست ہرچہ کنی عمر ضائع است
بجز حرف عشق ہرچہ بخوانی بپالت است

یادِ دوست کے سوا جو کچھ بھی کرتے ہو عمر کو ضائع کرتے ہو اور حرف عشق کے علاوہ جو کچھ بھی پڑھتے ہو محض فضول حرکت ہے۔ یعنی وہ کیا علم ہے جو آدمی کو اللہ تعالیٰ تک نہیں پہنچاتا، یعنی اللہ تعالیٰ کے دروازے تک نہیں لے جاتا، وہ کیسا علم ہے؟ کسی چیز کی حقیقت تک پہنچ جانا علم کہلاتا ہے۔

تحصیل علم کے ذرائع:

پھر یہ علم کئی طریقے سے حاصل ہوتا ہے، کچھ تو یہ پڑھنے پڑھانے سے حاصل ہوتا ہے، بشرطیکہ اخلاص کے ساتھ ہو۔

کبھی اللہ تعالیٰ کے مقبول بندوں کی صحبت میں رہنے سے علم ملتا ہے اور دل

میں ایک بصیرت پیدا ہوجاتی ہے، اور وہ حقائق کو پہچانتی ہے، اور کبھی علم لدنی ہوتا ہے، یعنی حق تعالیٰ شانہ کی جانب سے القا کیا جاتا ہے، جیسے قرآن کریم میں ہے: "وَعَلَّمْنَاهُ مِن لَّدُنَّا عِلْمًا۔" (اور ہم نے اس کو اپنی جانب سے علم سکھلایا)۔

صدیق اکبرؓ کا علم:

سیدنا حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا علم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت بابرکت کا اثر تھا کہ ان کے قلب میں وہی چیز آتی تھی جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب میں آتی تھی، دوسری بات آتی ہی نہیں تھی، اس لئے لقب صدیق ہوا۔

"صدیق" کا معنی:

صدیق اس کو کہتے ہیں کہ سر کے بالوں سے لے کر، سر کی چوٹی سے لے کر پاؤں کے ناخنوں تک صدق ہی صدق ہو، اور کذب کا نام ونشان نہ ہو، وہ صدیق کہلاتا ہے، قرآن کریم نے بطور خاص حضرت یوسف علیہ السلام کو "یُوسُفُ اَیُّهَا الصِّدِّیْقُ" (یوسف:۴۶) کہا ہے، صدیقین کا لفظ عام بولا ہے، دوسری جگہ ارشاد ہے:

"وَاذْكُرْ فِي الْكِتَابِ مُوْسٰى اِنَّهٗ كَانَ صِدِّيْقًا نَّبِيًّا۔" (مریم:۵۱)

ترجمہ:......"ذکر کیجئے کتاب میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کا کہ وہ صدیق تھے۔"

مقام صدیقی، مقامِ نبوت کا عکس:

یہاں حضرت موسیٰ علیہ السلام کو صدیق کہا، حضرات انبیأ کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام نبوت ملنے سے پہلے صدیق ہوتے ہیں، بعد میں جب ان کو نبوت عطا کی جاتی ہے، تو ان کے فیض صحبت سے صدیق بنتے ہیں، تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ انبیأ

کے بعد افضل الصدیقین ہیں، اس لئے کہ وہ افضل النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کے سب سے برگزیدہ صحابی ہیں، جیسا کہ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے خاص ان کے بارہ میں فرمایا ہے: ''اِذْ یَقُوْلُ لِصَاحِبِهٖ لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا۔'' چنانچہ اس آیت میں: ''صَاحِبِهٖ'' سے مراد صاحب النبی صلی اللہ علیہ وسلم ہے۔

صدیق اکبرؓ جانشین رسول تھے:

اس لئے میں نے کہا ہے کہ امیرالمؤمنین کا لفظ جو ہے ناں! یہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں ایجاد ہوا، امیرالمؤمنین کی اصطلاح خلیفۃ المسلمین کے لئے حضرت عمرؓ کے زمانے میں ایجاد ہوئی، صحابہؓ نے حضرت عمرؓ کو امیرالمؤمنین کہنا شروع کیا، حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو امیرالمؤمنین نہیں کہتے تھے، ان کو امیرالمؤمنین نہیں کہا جاتا تھا، ان کو جب بھی بلاتے یا خلیفۃ رسول اللہ! کہہ کر بلاتے تھے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلیفہ، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مسند کی جانشینی انہی کو زیبا تھی۔

صدیق اکبرؓ کا مقام:

جب حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے یہ عرض کیا کہ: ''بِاٰبَائِنَا وَاُمَّهَاتِنَا وَاَبْنَائِنَا! یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ!'' تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''عَلٰی رِسْلِکَ'' ٹھہرو ابوبکر ٹھہرو! یہ کیوں فرمادیا؟ اس میں بھی رمز تھی، زبان کھل گئی تھی صدیق کی، ایسا نہ ہو کہ یہ دہانہ پھوٹ پڑے اور سب کچھ بہا کر لے جائے، ٹھہر جاؤ! بند لگالیا، غم و اندوہ کی وجہ سے سیلاب اُمڈ آئے اور حاضرین کے لئے اس کا برداشت کرنا مشکل ہوجائے، فرمادیا: ''علی رسلک'' ٹھہر جاؤ، بند لگادیا۔ وہ خاموش ہوگئے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دو باتیں ارشاد فرمائیں۔

ایک بات تو یہ ارشاد فرمائی کہ اس بھری دنیا میں کسی صاحب نے ہم پر کوئی

احسان کیا ہے، ہم اس کا بدلہ چکا چکے ہیں، سوائے ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے کہ ان کے احسان کا بدلہ ہم سے نہیں چکایا گیا، اللہ تعالیٰ ہی ان کا بدلہ عطا فرمائیں گے۔

اور دوسری یہ بات ارشاد فرمائی کہ اپنی رفاقت اور اپنے مال کے ذریعہ سے جس قدر احسانات ہم پر ابوبکر کے ہیں، اتنے کسی کے نہیں، ''اِنَّ اٰمَنَّ النَّاسِ عَلَیَّ فِیْ صُحْبَتِہٖ وَمَالِہٖ اَبُوْبَکْرٍ۔'' اور ان کے استخلاف کی طرف اشارہ کرکے فرمایا: مسجد کی طرف دروازے کھلتے تھے، مسجد شریف کے اردگرد صحابہؓ کی آبادی تھی، اور جلدی سے نماز کے آنے کے لئے مسجد میں دروازے کھول رکھے تھے، فرمایا: سارے دروازے بند کردیئے جائیں سوائے ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے دروازے کے کہ ان کو تو ہمہ وقت آنے کی ضرورت ہوگی، باقی دروازے بند کردو، تاکہ خلیفہ کا دوسرے لوگوں سے امتیاز ہوجائے۔

آٹھ سال بعد شہدائے احد پر نمازِ جنازہ:

اسی خطبہ میں دو باتیں مزید ارشاد فرمائیں، ایک تو شہدائے احد کو یاد فرمایا، یہ اسلام کے لئے سب سے پہلے قربانی دینے والے حضرات تھے، ان کے لئے دعائے رحمت فرمائی اور استغفار فرمایا، حدیث شریف میں آتا ہے کہ:

''وَعَنْ عُقْبَۃَ بْنِ عَامِرٍ رَضِیَ اللہُ عَنْہُ قَالَ: صَلّٰی رَسُوْلُ اللہِ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ عَلٰی قَتْلٰی اُحُدٍ بَعْدَ ثَمَانِ سِنِیْنَ کَالْمُوَدِّعِ لِلْاَحْیَاءِ وَالْاَمْوَاتِ ...... الخ۔''

(مشکوٰۃ ص:۵۴۷)

ترجمہ:...... ''آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم (اپنے وصال سے چند دن پہلے احد گئے، شہدائے احد کی قبروں پر گئے اور یہ عجائبات میں سے ہے کہ) آٹھ سال کے بعد ان حضرات پر نمازِ جنازہ پڑھی، گویا کہ آپ ﷺ زندوں اور مردوں کو رخصت فرما

رہے تھے، (زندوں کو تو رخصت کر ہی رہے تھے اور ساتھ ہی ساتھ مردوں سے بھی رخصت ہوئے)۔"

مہاجرین وانصار کا مقام:

اور دوسری بات یہ ارشاد فرمائی کہ مہاجرین بڑھتے جائیں گے اور انصار کم ہوتے جائیں گے۔ یہ دو طبقے تھے، ایک مہاجرین کا جنہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی معیت میں ہجرت کی، مکہ مکرمہ چھوڑ کر یہاں آگئے، جو اس وقت ان کے لئے پردیس تھا، اپنا وطن چھوڑا، گھر بار چھوڑا، اپنے کاروبار چھوڑے اور بعض نے اپنے اہل وعیال چھوڑے، ایسے حضرات بھی تھے جو ہجرت کرکے تشریف لے آئے، لیکن بال بچے وہاں رہے، ان کے منگوانے کا کوئی انتظام نہیں ہوسکا تھا، یہ مہاجرین تھے اور مدینے کے حضرات جو پہلے سے ہی یہاں رہ رہے تھے اور جنہوں نے اسلام کے لئے اپنی آغوش کھول دی تھی، خود اسلام کی آغوش میں چلے گئے تھے، یہ انصار کہلاتے تھے، قرآن کریم میں جہاں جہاں بھی تذکرہ آیا، ان دونوں فریقوں کا المہاجرین والانصار کے ساتھ آیا ہے، پہلے نمبر پر مہاجرین اور دوسرے نمبر پر انصار، گویا مہاجرین کو متبوع اور انصار کو تابع بنایا گیا ہے۔ ارشاد فرمایا کہ یہ انصار "قرشي وعيبتي" میرے اعضائے باطنی ہیں اور عیبا کہتے ہیں اپنا خاص بکس جس میں آدمی نے اپنا سامان اور خزانہ رکھا ہوا ہوتا ہے، مطلب یہ ہے کہ انہوں نے مجھے پناہ دی تھی، اس لئے ان میں سے جو کریم اور بڑے لوگ ہیں ان کا اکرام کرو، اور اگر ان میں سے کسی سے غلطی ہوجائے تو اس سے درگزر کرو، یہ کن کو کہہ رہے ہیں؟ مہاجرین کو! اس میں بھی اشارہ فرمادیا کہ خلافت مہاجرین میں ہوگی، انصار میں نہیں ہوگی اور یہ حدیث پہلے گزر چکی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی خطبہ میں ارشاد فرمایا تھا:

"اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لِلْاَنْصَارِ وَلِاَبْنَاءِ الْاَنْصَارِ وَاَبْنَاءِ اَبْنَاءِ الْاَنْصَارِ۔" (مشکوٰۃ ص:۵۷۷)

ترجمہ:......"یا اللہ! انصار کی بخشش فرما، انصار کی اولاد کی بخشش فرما، اوران کی اولاد کی اولاد کی بخشش فرما۔"

انصار کے احسانات:

ان حضرات انصار کے عام مسلمانوں پر بڑے احسانات ہیں، اسلام پر احسان کہنا تو غلط ہوگا، بلکہ اسلام کا ان پر احسان تھا، ظاہر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ان کے احسانات تھے، لیکن حقیقت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ان پر احسانات تھے، یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عشاق تھے، بالکل وہی نقشہ نظر آتا تھا جو شمع اور پروانوں کا نظر آیا کرتا ہے، جس طرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نکلتے تھے حضرات انصار آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے جلو میں ہوتے تھے، اور ہر قربانی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ اقدس کے لئے دینے کو تیار رہتے تھے، وہ جو جنگ ہوازن کے موقع پر قصہ پیش آیا تھا، وہ میں ذکر کر چکا ہوں، صحیح بخاری شریف میں ہے کہ کسی نوجوان انصاری کے منہ سے نکل گیا تھا کہ:

"..... فَقَالُوْا يَغْفِرُ اللّٰهُ لِرَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُعْطِى قُرَيْشًا وَيَدَعُنَا وَسُيُوْفُنَا تَقْطُرُ مِنْ دِمَائِهِمْ فَحُدِّثَ لِرَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِمَقَالَتِهِمْ فَاَرْسَلَ اِلَى الْاَنْصَارِ فَجَمَعَهُمْ فِىْ قُبَّةٍ مِنْ اَدَمٍ وَلَمْ يَدْعُ مَعَهُمْ اَحَدًا غَيْرَهُمْ فَلَمَّا اجْتَمَعُوْا جَاءَهُمْ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ مَا حَدِيْثٌ بَلَغَنِىْ عَنْكُمْ فَقَالَ فُقَهَاءُهُمْ اَمَّا ذَوُوْا رَاْيِنَا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ فَلَمْ يَقُوْلُوْا شَيْئًا وَاَمَّا اُنَاسًا مِنَّا حَدِيْثَةٌ اَسْنَانِهِمْ قَالُوْا يَغْفِرُ اللّٰهُ

لِرَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یُعْطِی قُرَیْشًا وَیَدَعُ الْاَنْصَارَ وَسُیُوْفُنَا تَقْطُرُ مِنْ دِمَائِہِمْ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَمَّا تَرْضَوْنَ اَنْ یَّذْھَبَ النَّاسُ بِالْاَمْوَالِ وَتَرْجِعُوْنَ اِلٰی رِحَالِکُمْ بِرَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالُوْا بَلٰی یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ! قَدْ رَضِیْنَا۔" (مشکوٰۃ ص:۵۷۶)

یعنی آنخضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنوں کو دیتے ہیں، ان کو مکہ یاد آگیا ہے اور ہماری تلواروں سے ابھی تک خون ٹپک رہا ہے۔ آنخضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو بالکل الگ ایک خیمہ میں جمع ہونے کا حکم دیا، وہ حضرات جمع ہوگئے، آنخضرت صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے، فرمایا: یہاں انصار کے علاوہ کوئی اور آدمی تو نہیں ہے؟ عرض کیا گیا کہ: حضور! اور تو کوئی نہیں ہے، ہمارا بھانجا ہے، ہے تو دوسرے قبیلے کا، انصار کا نہیں ہے، لیکن ہمارا بھانجا ہے، فرمایا اس کو رہنے دو، "فَاِنَّ اِبْنَ اُخْتِ الْقَوْمِ مِنْھُمْ۔" کیونکہ کسی قوم کا بھانجا انہیں میں سے شمار ہوگا، یہ خاص بات تھی جو آنخضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی موقع پر ارشاد فرمائی، اور پھر پوچھا کہ وہ کیا بات ہے جو مجھے تمہاری طرف سے پہنچی ہے، حضرات انصار رونے لگے اور کہنے لگے کہ یا رسول اللہ! ہم میں سے جو بڑے اور سمجھ دار لوگ ہیں انہوں نے تو کچھ نہیں کہا، یہ جو بچے، لونڈے ہیں، ان کے منہ سے یہ بات نکلی ہے۔ وہاں عجیب وغریب مکالمہ ہوا، آنخضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: انصار! تم بھول گئے ہو، تم گمراہ تھے، اللہ تعالیٰ نے میری وجہ سے تمہیں ہدایت دی، تم بھوکے تھے، اللہ تعالیٰ نے میری وجہ سے تمہیں کھانا عطا فرمایا، تم ننگے تھے، فقیر تھے، قلاش تھے، میری وجہ سے اللہ تعالیٰ نے تمہیں غنی کردیا، اب وہ رو رہے ہیں، گرج کر فرمایا: مجھے جواب کیوں نہیں دیتے؟ وہ صرف اتنا کہہ

پائے کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ہم پر بہت احسانات ہیں۔ فرمایا: جواب دو! تم جواب دینا چاہو تو جواب دے سکتے ہو کہ تجھے تیری قوم نے رہنے نہیں دیا تھا، نکال دیا تھا، ہم نے تجھے پناہ دی تھی، لوگ تجھ کو گالیاں دیتے تھے، ہم نے تیرے لئے یہ کیا تھا، وہ یہ کرتے تھے ہم نے یہ کیا۔ اور بہت ساری ایسی باتیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے گنوادیں، لیکن انہوں نے صرف اتنا ہی کہا کہ: اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کے ہم پر بہت احسانات ہیں۔ فرمایا کہ: اے انصار! کیا تم اس بات پر راضی نہیں ہو کہ لوگ شام کو اونٹ اور بکریاں لے کر جائیں اور تم اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کو لے کر جاؤ، اور دوسری روایت میں ہے:

”وَلَوْ لَا الْھِجْرَةُ لَکُنْتُ اِمْرًا مِّنَ الْاَنْصَارِ، وَلَوْ سَلَکَ النَّاسُ وَادِیًا وَّسَلَکَتِ الْاَنْصَارُ وَادِیًا اَوْ شِعْبًا لَسَلَکْتُ وَادِیَ الْاَنْصَارِ وَشِعْبِھِمْ۔“ (مشکوٰۃ ص:۵۷۶)

اب میں کیا کروں میں مہاجر ہوں، ہجرت کر کے گیا ہوں، اگر ہجرت نہ ہوتی تو میں بھی اپنے آپ کو انصار ہی کہلاتا، میں بھی انصار ہی میں سے شمار ہوتا، ایک وادی میں چلے انصار، دوسری وادی میں چلے لوگ، تو میں انصار کی وادی اور گھاٹی پر چلوں گا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی ان کے ساتھ بہت ہی تعلق خاطر تھا، بے حد محبت، اس لئے اس آخری وقت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے حق میں وصیت فرمائی اور ان کو بہت ہی زیادہ دعائیں دیں۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین!

مؤمن کی صفات

یعنی

اصلاح نفس و اصلاح معاشرہ کے زرین اصول:

اہل طریق اپنی ذات کو کسی سے بہتر نہیں سمجھتے، جو شخص اپنے کو دوسرے سے بہتر جانتا ہے، بغیر اس کے کہ اس کو اپنا اور اس دوسرے کا مرتبہ فی الحال اور انجام کے اعتبار سے معلوم ہوگیا ہو، وہ جاہل باللہ ہے، دھوکے میں مبتلا ہے، اور خیر سے یکسر خالی ہے، خواہ اسے کتنے ہی معارف کیوں نہ دیئے گئے ہوں، علم کی تحقیر درحقیقت حق تعالیٰ کی بے ادبی ہے، اور یہ نقیض ولایت ہے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم
الحمدللہ وسلام علی عبادہ الذین اصطفی!

’’عارف باللہ شیخ تاج الدین ابن عطاءؒ اللہ سکندریؒ کی تصنیف لطیف ’’مفتاح الفلاح ومصباح الارواح‘‘ ذکر الٰہی کے موضوع میں بے نظیر تبرک ہے، جو بیش قیمت افادات پر مشتمل ہے، حیدرآباد (سندھ) کے ایک بزرگ حضرت مولانا عبدالغنی صاحب مدفیوضہم نے یہ کتاب حضرت اقدس مولانا محمد عبداللہ صاحب صدر مفتی خیرالمدارس ملتان کی خدمت میں بغرض اشاعت بھیجی ہے۔ اصل کتاب عربی میں ہے، حضرت موصوف، اس کی اصل اور ترجمہ دونوں کی اشاعت کا الگ الگ اہتمام فرما رہے ہیں۔ ذیل میں اسی کتاب کا ایک باب قارئین کی خدمت میں ہدیہ کیا جاتا ہے، واللہ الموفق!‘‘................(محمد یوسف)

مساکین جو امور اپنے اوپر لازم قرار دیتے ہیں:

جاننا چاہیئے کہ اللہ تعالیٰ کا راستہ منازعت اور جھگڑالو نفس کے ظہور سے بعید ہے، اس میں نہ ذرہ برابر عذر معذرت کی گنجائش ہے، نہ چشم پوشی کی صورت ہوسکتی ہے، ان امور میں جو خروج عن الطریق کی طرف مؤدی ہوں کسل مندی گوارا کی جاسکتی ہے، ان کے نزدیک زبانی مؤاخذہ اور درگزر نہ کرنا، ان امور میں ہے جن میں شرعاً مسامحت نہیں ہوسکتی، اور اپنے حقوق اور ذاتی امور میں مسامحت کر لیتے ہیں۔

اپنی ذات اور دوسروں کے لئے:

اہل طریق کی ایک شرط یہ ہے کہ وہ اپنے نفس سے لوگوں کو انصاف دلاتے ہیں، لیکن خود دادطلبی نہیں کرتے، وہ اجانب سے معذرت قبول کر لیتے ہیں لیکن خود عذر خواہی کی نوبت نہیں آنے دیتے، وہ باہم مناصحت کا، اور عام لوگوں کے ساتھ شفقت و رحمت کا برتاؤ کرتے ہیں، ان کے درمیان باہمی بغض، کینہ، حسد، عطیاتِ الٰہیہ میں نہیں پایا جاتا، ان میں سے کوئی ''میری''، ''میرے پاس''، ''میرا سامان''، ''میری سواری'' اور ''میرا کپڑا'' کا لفظ نہیں کہے گا، انہیں جو فتوح حاصل ہوتی ہیں، ان میں وہ سب برابر کے شریک ہوتے ہیں، وہ کسی خاص شخص کی ملک میں نہیں ہوتیں۔

عورتوں اور لڑکوں کی ہم نشینی سے پرہیز:

ان کا طریق عورتوں کی موافقت، ہم نشینی اور دوستی کو ترک کرنا، اور نوعمر لڑکوں کی صحبت اور گفتگو سے پرہیز کرنا ہے۔ ان کے یہاں یہ شرط ہے کہ کسی سے وعدہ نہ کیا جائے، اگر کسی نے غلطی کی اور وعدہ کر لیا تو اس کا ایفاء ہر قیمت پر ضروری ہے۔

اہل اللہ کے اوصاف:

سچ بولنا، اور طعام، کلام اور نظر میں ورع اختیار کرنا، ریاکاری سے دور

بھاگنا، شریعت کے تمام آداب کی جو اسے معلوم ہوں، رعایت اور حفاظت کرنا، اور معلوم نہ ہونے کی صورت میں ہر حالت کا حکم دریافت کئے جانا، ان کے شرائط طریق میں داخل ہے، ان کا یہ نظریہ ہے کہ جو شخص آدابِ شرعیہ میں خیانت سے نہیں چوکتا وہ اسرارِ الٰہیہ میں خیانت سے کب باز رہے گا؟ اور حق جل مجدہ اپنے اسرار صرف امین حضرات کو عطا فرماتے ہیں، خیانت پیشہ لوگوں کا ان میں کوئی حصہ نہیں۔

اپنی پسند و ناپسند سے اجتناب:

ان کے طریق میں یہ بھی داخل ہے کہ وہ اپنی پسند و ناپسند سے دست کش ہوجاتے ہیں، بس حق جل مجدہ نے ان کے لئے جو کچھ پسند فرمالیا اور اختیار کرلیا وہ اسی پر بجان و دل راضی ہیں۔ نیز وہ مباحات کے درپے ہوکر وقت ضائع نہیں کرتے۔ جو شخص اس طریق میں داخل ہو، اگر وہ صاحب نکاح ہو تو اسے طلاق دینے کی ضرورت نہیں، اور اگر مجرد ہو تو نکاح نہ کرے گا تاوقتیکہ اس کی تکمیل نہیں ہوجاتی، اس کے بعد حق تعالیٰ کی جانب سے جو القأ کیا جائے گا، اس پر عمل کرے گا۔

روپیہ پیسہ لینے دینے میں احتیاط:

سالک کی ایک شرط یہ بھی ہے کہ روپیہ پیسہ لینے میں پوری احتیاط اور تورع کے باوجود نقدی پاس رکھ کر رات نہیں گزارے گا، نہ سالک کسی کو دینے کے لئے کسی سے کچھ لیتا ہے، کیونکہ یہ اس کے لئے حجاب ہے، البتہ کامل لے بھی سکتا ہے، اور دل چاہے تو رکھ بھی سکتا ہے، اور دل چاہے تو دے سکتا ہے، کیونکہ کامل القأ ربانی کے موافق عمل کرتا ہے، جس طرح شاگرد، استاذ کے اشاروں پر عمل کرتا ہے، جس طرح تلمیذ کے کسی فعل پر اعتراض نہیں (کیونکہ وہ پابند حکم استاذ ہے)، اسی طرح شیخ کامل کے ان افعال پر اعتراض نہیں، اس لئے کہ اگر وہ واقعی شیخ ہے تو یہ سب کچھ من جانب اللہ کرتا ہے۔

ترکِ اغراض:

ان کی ایک شرط ترکِ اغراض ہے، الّا یہ کہ اعتراض کرنے والا اعلیٰ ہو، کیونکہ یہ اعتراض نہیں بلکہ تادیب ہے، اور اگر کم مرتبہ ہے تو اسے خاموش رہنا چاہئے، اگر اس نے اعتراض کیا تو عقد طریق باطل کردیا، اس لئے کہ اہل طریق اہل صدق ہیں، زبان سے وہی کہتے ہیں جس کا مشاہدہ کرتے ہیں۔

آدابِ مرید:

اور جب مرید شیخ کی زیارت کو جائے تو اپنے قلب کو ''اپنے پاس کی چیزوں'' سے خالی کرلے، تاکہ شیخ کے القاءٔ کردہ امور کو قبول کرسکے، اور شیخ کی کسی بات پر انکار کی صورت پیدا نہ ہو، اور اگر کوئی ایسی بات پیش آئے جس کو اس کا قلب قبول نہیں کرتا، تو اپنے کو ملامت کرے اور یوں جانے کہ میں اس مقام کو نہیں پہنچا، شیخ کی طرف خطا کی نسبت نہ کرے، جو شیخ کے پاس بغرض امتحان و آزمائش جاتا ہے، وہ جاہل ہے، اور شیخ سے ''خاطر'' پر کلام کا مطالبہ نہ کرے، بلکہ امراض نفوس اور ان کے علاج کی معرفت شیخ سے طلب کی جاتی ہے، مکاشفات، مریدین کے احوال ہیں، عارفین کے احوال نہیں۔

بدظنی سے اجتناب:

اور اہل طریق جب کسی گناہگار کو عین حالتِ معصیت میں دیکھتے ہیں تب بھی اس کے بارے میں اصرار کا اعتقاد نہیں رکھتے، ان کا خیال ہوتا ہے کہ شاید اس نے خفیۃً توبہ بھی ساتھ ہی کرلی ہو یا ہوسکتا ہے کہ اس کا خاتمہ عنایت الٰہیہ کی وجہ سے اچھا ہونے والا ہو، اس لئے ممکن ہے کہ یہ گناہ (انجام کے اعتبار سے) اسے مضر نہ ہو، ہاں برا اعتقاد وہ اسی شخص کے متعلق رکھتے جس کے انجام پر اللہ تعالیٰ نے ان کو مطلع کردیا ہو، اس کے باوجود وہ کسی کو عار نہیں دلاتے۔

اپنے آپ کو کسی سے بہتر نہ جاننا:

اہل طریق اپنی ذات کو کسی سے بہتر نہیں سمجھتے، جو شخص اپنے کو دوسرے سے بہتر جانتا ہے، بغیر اس کے کہ اس کو اپنا اور اس دوسرے کا مرتبہ فی الحال اور انجام کے اعتبار سے معلوم ہوگیا ہو، وہ جاہل باللہ ہے، دھوکے میں مبتلا ہے، اور خیر سے یکسر خالی ہے، خواہ اسے کتنے ہی معارف کیوں نہ دیئے گئے ہوں، علم کی تحقیر درحقیقت حق تعالیٰ کی بے ادبی ہے، اور یہ نقیض ولایت ہے۔

اہل اللہ کے اوصاف:

نیز ان کے اوصاف میں سے ہر دنی اور گندے خلق سے نفس کو پاک کرنا، اور خلق عالی سے نفس کو مزین کرنا ہے۔ وہ مخلوق کی ایذا برداشت کرلیتے ہیں، کسی کو ایذا نہیں دیتے، وہ دوسروں کا بوجھ اٹھالیتے ہیں، اپنا بار دوسروں پر نہیں ڈالتے، وہ نیکی کے کاموں میں اعانت کرتے ہیں، آفت رسیدگاں کی فریاد رسی کرتے ہیں، راستہ بھولے ہوئے کی رہنمائی کرتے ہیں، ناواقف کو تعلیم دیتے ہیں، غافل کو بیدار کرتے ہیں، وہ نہ دربان رکھتے ہیں، نہ پردہ لٹکاتے ہیں، بلکہ جو شخص بھی ان کو تلاش کرے، پالیتا ہے، اور جو ان کا ارادہ کرے، ان تک پہنچ جاتا ہے، وہ کسی سے چھپ کر نہیں رہتے، نہ کسی سائل کو منع کرتے ہیں، نو وارد کی مہمان نوازی کرتے ہیں، وحشت زدہ کو انس دلاتے ہیں، ڈرے ہوئے کو امن دیتے ہیں، وہ نوکروں اور خادموں کی مدد کرتے ہیں، الغرض نہ وہ کسی فضیلت کو چھوڑتے ہیں، نہ کسی رذیلہ کو کرتے ہیں۔

چار قسم کی موت برداشت کرنا:

منجملہ ان کے اوصاف کے مجاہدات بدنیہ یعنی بھوک، پیاس، برہنگی، اور چار قسم کی موت کا برداشت کرنا ہے، سفید موت یعنی بھوک، سرخ موت یعنی مخالفت ہویٰ، سیاہ موت یعنی تحمل ایذا، سبز موت یعنی اوپر نیچے پیوند لگانا۔

کونین کو دل سے نکال دینا:

ان کے اوصاف میں یہ امور بھی ہیں، کونین کو اپنے قلب سے ترک کردینا، اپنے پاس کی چیزوں کو اپنے بھائیوں یعنی خلق اللہ پر قربان کردینا، تمام امور میں حق تعالیٰ پر اعتماد رکھنا، تمام ایسے امور جو نفس کو شاق اور ناگوار ہیں، ان کے جاری ہونے پر راضی ہونا، دکھ درد پر صبر کرنا، وطن سے دور نکل جانا، مخلوق سے کنارہ کشی اختیار کرنا، بروں سے (بدفہمی کی وجہ سے نہیں بلکہ خالق جل مجدہ کو خلق پر ترجیح کی غرض سے) علائق اور عوائق کو قطع کرنا، اور لوگوں کی حاجات کے پورا کرنے میں سعی کرنا، بشرطیکہ یہ اپنی اصلاح سے فارغ ہوچکا ہو، اور جو شخص اپنے نفس کی تکمیل سے فراغت حاصل کئے بغیر ان امور میں مشغول ہوتا ہے، وہ ریاست اور شہرت کا خواہش مند ہے۔

قناعت پسندی:

منجملہ ان کے اوصاف کے قناعت ہے۔ یعنی ''جتنا رزق مل جائے، نفس کا اس پر قرار پکڑنا اور مزید کا منتظر نہ رہنا۔'' نیز ان کا سر منڈانا، بال کتروانا، ناخن تراشنا اور کسی کو دینے کی غرض سے کپڑا اتارنا، یہ تمام امور باوضو ہونے کی حالت میں ہوتے ہیں، ان کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ ان سے جب بھی کوئی چیز جدا ہو، طہارت پر جدا ہو، فرشتے کہتے ہیں: ''اے رب! جب ہم ان کے پاس سے آئے تھے وہ نماز پڑھتے تھے۔''

حق عبدیت کا اہتمام:

منجملہ ان کے حق عبدیت ادا کرنے کی نیت سے دعا کرنا، اور حق تعالیٰ کے سامنے فقر و ذلت، خشوع و خضوع اور تواضع و مسکنت کا ظاہر کرنا ہے، تاکہ ان صفات کے مقابل، اسمائے الٰہیہ کا ظہور ہو، ان اسمائے الٰہیہ کا سر اسی پر کھلتا ہے جو ان صفات کے ساتھ متصف ہوجائے جو ان اسمائے کے مقابل ہیں۔ یہی حق عبدیت ہے۔

اپنے عیوب پر نظر کرنا:

منجملہ ان کے احوال کے اپنے عیوب پر نظر کرنا، اپنی ذات میں مشغول ہونا اور لوگوں کے عیوب سے اندھا ہوجانا ہے۔ وہ زبان کو خیر کا عادی بناتے ہیں، آنکھوں کو فضول نظر سے بند رکھتے ہیں، نیز رفتار میں قدرے تیزی کرنا، خیر کے سوا ہر بات میں خاموشی اختیار کرنا، جن صاحب سلطنت لوگوں سے نفع کی امید یا نقصان کا اندیشہ کیا جاسکتا ہے، ان کے سامنے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرنا، تمام مخلوق سے صاف دل رہنا، تمام مسلمانوں کے لئے غائبانہ دعا کرنا، فقرأ کی خدمت کرنا، اور اللہ تعالیٰ کی تمام مخلوق سے خواہ انسان ہو یا حیوان، شفقت و رحمت کا برتاؤ کرنا، ان کی صفات ہیں۔

ظالم حاکم کی نفرت کا سبب:

روایت ہے کہ بخارا میں ایک حاکم بڑا ظالم تھا، ایک دن سوار ہوکر نکلا، راستہ میں خارشی کتا دیکھا، سردی اس دن بہت تھی، متعلقین کو حکم دیا کہ اس کتے کو اٹھالو، وہ کتا اٹھا کر اس کے گھر لایا گیا، اس کے ساتھ خوب لطف و احسان کا معاملہ کیا، رات ہوئی تو خواب میں ہاتف غیبی سے آواز آئی: ”تو کتا تھا، تجھے کتے کو ہبہ کردیا۔“ (یعنی کتے کی وجہ سے بخش دیا)۔

دوسروں کے محاسن پھیلانا اور عیوب چھپانا:

منجملہ ان کے اوصاف کے لوگوں کے محاسن کا پھیلانا اور ان کے عیوب کا چھپانا ہے۔ البتہ بدعتی لوگوں کے ساتھ وہ یہ رعایت نہیں کرتے، کیونکہ بدعتی کے حالات کی اطلاع ہر شخص پر فرض ہے، تاکہ لوگ اس کی فساد انگیزی سے اپنی حفاظت کرسکیں۔

لوگوں کی تعظیم کرنا اور حقارت سے اجتناب:

منجملہ ان کے احوال کے لوگوں کو بنظر تعظیم دیکھنا ہے، نہ بنظر حقارت، وہ اپنے کو کسی سے افضل نہیں دیکھتے، نہ کسی پر اپنی فضیلت سمجھتے ہیں، نہ کسی پر اپنا حق تصور کرتے ہیں، خواہ دوسروں کے ان کے ذمہ کتنے ہی حقوق ہوں، وہ کسی کو قرض نہیں دیتے، جب ان سے سائل کچھ مانگتا ہے تو اسے دے دیتے ہیں، لیکن ان کے دل میں واپس لینے کا خیال نہیں ہوتا، اور اگر وہ شخص از خود واپس کرے تو ہر ممکن تدبیر سے واپس نہ لینے کی کوشش کرتے ہیں، لیکن اگر وہ واپس دینے پر اصرار کرے تو اس سے لے کر کسی دوسرے محتاج کو دے دیتے ہیں، لیکن اس کو اپنی ملک میں نہیں رکھتے، کیونکہ جس چیز سے وہ نکل جاتے ہیں، اس کی طرف رجوع نہیں کرتے، جب ان کی کوئی چیز راستہ میں گر جاتی ہے، خواہ مال ہو یا کپڑا، یا ہزار دینار ہوں، اور وہ اسے چھوڑ کر آگے نکل گئے ہوں، تو نہ اس کی تلاش کرتے ہیں، نہ اس غرض سے واپس لوٹتے ہیں، نہ اس کا اعلان کرتے ہیں، اور اگر ان کو اس حالت میں اپنے نفس میں تغیر محسوس ہو تو وہ اصحابِ علت ہیں، ہنوز ''کائنات'' کا ان کے قلب میں حصہ ہے، انہیں اس علت کے ازالہ کے لئے محنت کرنی چاہئے، اور اگر کوئی شخص بلاطلب ان کی گم شدہ چیز واپس کر دیتا ہے، تو دل چاہتا ہے تو رکھ لیتے ہیں اور دل چاہتا ہے تو اسے ملک سے نکال دیتے ہیں، ان کے لئے یہ کوئی شرط نہیں کہ ان کے پاس نہ ہو، بعض کے پاس مال ہوتا ہے، بعض کے پاس نہیں ہوتا۔

خلوت وجلوت میں طاعت سے سرشاری:

ان کا ایک وصف خلوت وجلوت میں طاعت کے ساتھ لذت حاصل کرنا، حق تعالیٰ کے ساتھ ایک ایک لحظہ کی رعایت کرنا، اور ہمہ وقتی تلقی وارد کے لئے خاطر مع اللہ کی حفاظت کرنا، جمیع حالات میں حق تعالیٰ سے راضی رہنا، ہر حال میں حق تعالیٰ

کی حمد بجالانا ہے۔

خلافِ عادت پر عمل ہی کرامت ہے:

مخلوق کے نفوس جس عام عادت اور روش پر چل رہے ہیں، جو شخص اپنے نفس کی عادت توڑ کر خرقِ عادت کے طور پر نفس کو عادت عامہ کے خلاف چلا دیتا ہے، حق تعالیٰ اس کے بدلے میں اسی قسم کا خرقِ عادت فرمادیتے ہیں (یعنی اسباب و مسبّبات کا ظہور فرمادیتے ہیں)۔عوام کی اصطلاح میں اسی کو کرامت کہا جاتا ہے، لیکن خواص کے نزدیک ''وہ عنایت الٰہیہ جس کی بدولت نفس کی سفلی عادات کے خلاف کرنے کی توفیق اور قوت نصیب ہوئی، اس سے مشرف ہوجانا ہی کرامت ہے۔''

(یہاں سے آخر تک کا مضمون اصل کتاب باب سابق سے مقدم ہے، یہاں اس کی تاخیر مناسب معلوم ہوئی۔محمد یوسف۔)

حق تعالیٰ کی مغفرت وبخشش کی امید:

خبردار! اہل ''لا الہ الا اللہ'' کے ساتھ کبھی عداوت نہ کرو، اس لئے کہ ان کو حق تعالیٰ کی ولایت عامہ حاصل ہے، اور وہ اولیاءُ اللہ ہیں، خواہ وہ کتنے ہی گناہگار ہوں، اور زمین کی بھرتی کے بقدر گناہ لے کر آئیں، حق تعالیٰ اسی قدر مغفرت کے ساتھ ان کا استقبال فرمائیں گے، بشرطیکہ وہ شرک میں مبتلا نہ ہوں، اور جس کے لئے ولایت ثابت ہے اس سے جنگ حرام ہے، اور جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ لڑنے کو تیار ہو، اس کا انجام اللہ تعالیٰ نے بیان فرمادیا، دنیا کا بھی اور آخرت کا بھی۔

(یہ مصنف پر حق تعالیٰ کی مغفرت وبخشش اور رحمت واسعہ کی امید ویقین کا غلبہ کثیر ہے کہ انہوں نے عام قائلین ''لا الہ الا اللہ'' کو ولایت عامہ کا مستحق سمجھا، اور بغیر پرسش وحساب کے ان کے لئے نعماءِ آخرت کی امید باندھی۔قرآن وسنت کی

روشنی میں ہم تو یہی سمجھتے ہیں کہ ہر مؤمن و مسلم اپنے ایمان و اسلام کی بنا پر مستحق نجات و مغفرت ہوگا، لیکن یہی نہیں کہ وہ اپنے کو اعمالِ صالحہ اور قیود شرعیہ سے بے پرواہ سمجھے اور کتاب وسنت کے خلاف زندگی گزارے۔ ہر مؤمن و مسلم کو بھی اپنے برے اعمال کے لئے اس مالک حقیقی کی بارگاہ میں جوابدہ ہونا ہے۔ مدیر)

بغیر تحقیق کے کسی کو دشمن خدا کہنے سے اجتناب:

اور جس شخص کے دشمن خدا ہونے کی اطلاع تمہیں منجانب اللہ نہیں ہے، اسے بھی دشمن نہ بناؤ، کم از کم یہ ہو کہ جس کے حالات کی تمہیں تحقیق نہیں ہے، اس سے نہ دوستی کا برتاؤ کرو، نہ دشمنی کا، البتہ جب معلوم ہوجائے کہ وہ اللہ کا دشمن ہے، اور اللہ کا دشمن صرف مشرک اور کافر ہے۔

پس اس سے بری ہوجاؤ، جس طرح کا معاملہ حضرت خلیل اللہ علیٰ نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام نے اپنے والد آزر سے کیا۔ حق تعالیٰ فرماتے ہیں: ”پس جب ان کو (حضرت ابراہیم علیہ السلام کو) واضح ہوگیا کہ وہ اللہ کا دشمن ہے، اس سے بری ہوگئے۔“ اور حق تعالیٰ فرماتے ہیں: ”آپ کسی قوم کو جو اللہ تعالیٰ پر اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتے ہوں، نہیں پائیں گے کہ وہ ایسے لوگوں سے دوستی رکھتے ہوں جو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے مقابلہ کرتے ہیں، خواہ ان کے باپ ہوں، جیسے ابراہیم علیہ السلام نے کیا تھا، یا بیٹے ہوں، یا بھائی ہوں، یا برادری کے لوگ۔“ پس یہ میزان ہے جس سے تم جان سکو گے۔

اولیاءُ اللہ سے عداوت سے پرہیز:

اور حتی الامکان اللہ کے بندوں سے معادات کا برتاؤ نہ کرو، اور نہ دشمنی کا فیصلہ اس بات سے کرنے لگو جو زبان سے ظاہر ہو۔ اگر کسی مسلمان سے ناروا فعل سرزد ہو تو اس کے فعل کو بے شک برا سمجھو، مگر اس کی ذات سے کراہت نہ کرو، اور اللہ کے

دشمن (کافر) کی ذات سے نفرت ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ: حق تعالیٰ فرماتے ہیں: ''جو میرے ولی سے دشمنی کرے، میں اس کے خلاف اعلان جنگ کرتا ہوں!'' اور اگر کسی آدمی کی حالت مجہول تھی، اور تم نے اس سے دشمنی کا برتاؤ کیا، تو کہا جائے گا کہ تم نے اللہ کی مخلوق کے معاملہ میں اللہ کا حق ادا نہیں کیا، کیا خبر کہ اللہ کا علم اس کے متعلق کیا ہے؟ تم خواہ مخواہ اس سے بری ہوگئے، اور اس سے دشمنی کرنے لگے۔ اور اگر کسی کا ظاہر حال تمہارے علم میں (اچھا) ہے، اور وہ واقعتاً حق جل مجدہ کا دشمن ہے، مگر چونکہ تم کو اس بات کا علم نہیں، اس لئے اللہ کا حق ادا کرنے کی غرض سے اس سے دوستی رکھو، دشمنی نہ کرو، کیونکہ حق تعالیٰ کا اسم ''ظاہر'' تم سے حق تعالیٰ کے دربار میں مخاصمہ کرے گا، اپنے اوپر اللہ کی محبت قائم نہ کرو، ورنہ مارے جاؤ گے، اس لئے کہ حق تعالیٰ کی حجت غالب آکر رہتی ہے۔ پس اللہ تعالیٰ کے بندوں کے ساتھ رحمت وشفقت کا معاملہ کرو، جس طرح اللہ تعالیٰ ان کے کفر کے باوجود انہیں رزق دیئے جاتا ہے، باوجودیکہ ان کے تمام احوال سے واقف بھی ہے، اسی طرح اپنی رحمت وشفقت تمام حیوانات اور تمام مخلوق کے ساتھ عام رکھو، ان کے وجود کو ان کے حال پر چھوڑ دو، اور تم موجد وجود کی رحمت کے ساتھ ان پر رحم کرو۔

سیر الی اللہ کی آفات:

سیر الی اللہ کی آفات جو بعض سالکین کے لئے رہزن ثابت ہوتی ہیں، دس ہیں:

۱:......عمل کا دیکھنا۔

۲:......آرزو کا لمبا ہونا۔

۳:......دل میں حصول ولایت کے خیال کا آنا۔

۴:......بتوجہ خلق کی طرف مائل ہونا۔

۵:......خوابوں پر قناعت کرنا۔

۶:......ورد سے انس کرنا۔

۷:......وارد سے لذت لینا۔

۸:......وعدوں پر ٹھہر جانا۔

۹:......خوش فہمی پر کفایت کرنا۔

۱۰:......اور اللہ تعالیٰ کے حق میں دھوکے میں رہنا۔

اللہ تعالیٰ کی نظر سے گر جانے کی علامتیں تین ہیں:

۱:......نفس سے راضی ہو جانا۔

۲:......اللہ تعالیٰ سے ناراض ہونا۔

۳:......اور قضاء و قدر میں حق تعالیٰ سے مزاحمت کرنا۔

حق تعالیٰ کے قرب کی علامات:

حق تعالیٰ کے قرب کی علامتیں تین ہیں:

۱:......نفسانی لذات کا ترک کر دینا۔

۲:......حق پر قائم ہونا۔

۳:......اللہ کی خاطر مخلوق سے تواضع کرنا۔

وصول الی اللہ کی علامتیں تین ہیں:

۱:......**فهم عن الله** (اللہ سے سمجھنا)۔

۲:......**استماع من الله** (اللہ سے سننا)۔

۳:......**اخذ عن الله** (اللہ سے لینا)۔

اللہ کے ساتھ خاص ہو جانے کی علامتیں تین ہیں:

۱:......اختیار ترک کردینا۔

۲:......تدبیر کو سلب کردینا۔

۳:......ارادہ کو فنا کردینا۔

نیابت عن اللہ کی علامتیں تین ہیں:

۱:......اوصاف فانیہ کو اوصاف باقیہ سے بدل لینا۔

۲:......اوصاف فانیہ کو اوصاف باقیہ میں تبدیل کردینا۔

۳:......ذات فانیہ کو ذات باقیہ میں گم کردینا۔

”واللہ یؤتی ملکه من یشاء واللہ واسع علیم۔“

تعلق مع اللہ کے صحیح ہونے کی علامات:

حق تعالیٰ کے ساتھ بندہ کے تعلق کے صحیح ہونے کی علامتیں تین ہیں:

۱:......اختیار کا فنا ہوجانا۔

۲:......ہر تقدیری واقعہ کا شیریں ہوجانا۔

۳:......ہر چیز میں محبوب سے راضی ہوکر، اور ہر چیز میں اس کے سامنے سر تسلیم خم کرتے ہوئے ہر چیز میں کمال محبوب کا مشاہدہ کرنا۔

محبت الٰہی کی علامتیں:

بندے کے ساتھ حق تعالیٰ کی محبت ثابت ہونے کی علامتیں تین ہیں:

۱:......بندے سے جو کچھ صادر ہو (اس کے حکم خداوندی کے موافق ہونے کی وجہ سے) اللہ تعالیٰ کا اس سے راضی ہونا۔

۲:......حق تعالیٰ کی جانب سے تحدث (بیان نعمت) کی اجازت ہونا۔

۳:......اپنی حکمت بالغہ سے سِر کا اس پر القاٴ کرنا۔

(ماہنامہ دارالعلوم دیوبند، بھارت)

فرائض کی ادائیگی

حضرت امیرالمؤمنین رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حق تعالیٰ شانہ نے بہت سی چیزوں کو فرض فرمایا ہے، ان فرائض کو ادا کرو، اللہ کی بارگاہ میں ادا کرو، اللہ تعالیٰ ان کی برکت سے تمہیں جنت میں پہنچادیں گے، فرائض کو ادا کرو، مخلوق کو دکھانے کے لئے نہیں اور مخلوق کی خاطر نہیں، بلکہ فرائض کا ادا کرنا اللہ کی بارگاہ میں ہے، یعنی محض حق تعالیٰ شانہ کی رضا کے لئے کرو۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم
الحمدللہ وسلام علی عبادہ الذین اصطفیٰ!

”عَنْ عَلِيِّ بْنِ حُسَيْنٍ رَحِمَهُ اللّٰهُ تَعالٰى (قَالَ) اَوَّلُ خُطْبَةٍ خَطَبَهَا عَلِيٌّ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ حِينَ اُسْتُخْلِفَ حَمِدَ اللّٰهَ وَاَثْنٰى عَلَيْهِ فَقَالَ: اِنَّ اللّٰهَ عَزَّ وَجَلَّ اَنْزَلَ كِتَابًا هَادِيًا بَيَّنَ فِيهِ الْخَيْرَ وَالشَّرَّ فَخُذُوا بِالْخَيْرِ وَدَعُوا الشَّرَّ، اَلْفَرَائِضَ اَدُّوهَا اِلَى اللّٰهِ سُبْحَانَهٗ يُؤَدِّكُمْ اِلَى الْجَنَّةِ، اِنَّ اللّٰهَ حَرَّمَ حُرُمًا غَيْرَ مَجْهُوْلَةٍ وَفَضَّلَ حُرْمَةَ الْمُسْلِمِ عَلَى الْحُرُمِ كُلِّهَا وَشَدَّ بِالْاِخْلَاصِ وَالتَّوْحِيدِ الْمُسْلِمِينَ، وَالْمُسْلِمُ مَنْ سَلِمَ النَّاسُ مِنْ لِّسَانِهٖ وَيَدِهٖ اِلَّا بِالْحَقِّ، لَا يَحِلُّ اَذَى الْمُسْلِمِ اِلَّا بِمَا يَجِبُ، بَادِرُوْا اَمْرَ الْعَامَّةِ وَخَاصَّةَ اَحَدِكُمُ الْمَوْتَ فَاِنَّ النَّاسَ اَمَامَكُمْ وَاِنَّ مَا مِنْ خَلْفِكُمُ السَّاعَةُ تَحْدُوْكُمْ تُخَفِّفُوْا تَلْحَقُوْا فَاِنَّمَا يَنْتَظِرُ النَّاسُ اُخْرَاهُمْ، اِتَّقُوا اللّٰهَ عِبَادَهٗ فِىْ عِبَادِهٖ وَبِلَادِهٖ وَاِنَّكُمْ مَسْئُوْلُوْنَ حَتّٰى عَنِ الْبِقَاعِ وَالْبَهَائِمِ اَطِيْعُوا اللّٰهَ عَزَّ وَجَلَّ

وَلَا تَعْصُوْهُ وَاِذَا رَأَيْتُمُ الْخَيرَ فَخُذُوْا بِهٖ، وَاِذَا رَأَيْتُمُ الشَّرَّ فَدَعُوْهُ وَاذْكُرُوْا اِذْ اَنْتُمْ قَلِيْلٌ مُّسْتَضْعَفُوْنَ فِي الْاَرْضِ۔“

(حیاۃ الصحابہ ج:۳ ص:۴۶۴)

ترجمہ:......”حضرت علی بن حسین رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ سب سے پہلا خطبہ جو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے دیا جبکہ آپ کو خلیفہ بنایا گیا، اللہ کی حمد و ثنا کے بعد فرمایا کہ: بے شک اللہ تعالیٰ نے کتاب نازل فرمائی ہے، جو ہدایت کرنے والی ہے، اس میں اللہ تعالیٰ نے خیر اور شر کو ذکر فرمادیا ہے، پس خیر کو لو اور شر کو چھوڑ دو، فرائض کو اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں ادا کرو، وہ تم کو جنت میں پہنچادیں گے، بے شک اللہ تعالیٰ نے بہت سی چیزوں کو حرام قرار دیا ہے، جو سب کو معلوم ہیں اور مسلمان کی حرمت کی فضیلت تمام حرمت کی چیزوں سے زیادہ ہے، اور اللہ تعالیٰ نے اخلاص اور توحید کے ساتھ مسلمان کو مضبوط کیا ہے، مسلمان وہی ہے کہ مسلمان اس کی زبان اور ہاتھ سے محفوظ رہیں، ہاں! حق کے ساتھ، کسی مسلمان کو ایذا دینا جائز نہیں، مگر اسی چیز کے ساتھ جو کہ واجب ہے، تمام کاموں سے پہلے اور خاص طور پر اپنے خصوصی کاموں سے پہلے موت کی طرف سبقت کرو، اس لئے کہ لوگ تم سے آگے جاچکے ہیں اور جو تم سے پیچھے ہیں وہ تمہارے پیچھے آئیں گے، ذرا اپنا بوجھ ہلکا رکھو، تاکہ تم بھی پہلوں سے جاملو، کیونکہ سب کے سب لوگ اپنی آخرت کے انتظار میں ہیں، اللہ کے بندوں اور اللہ کی سرزمین میں اللہ سے ڈرو، اس لئے کہ تم سے زمین کے ٹکڑوں اور

چوپاؤں کے بارے میں بھی سوال کیا جائے گا، اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرو، اس کی نافرمانی نہ کرو، خیر کو دیکھو تو اس کو لے لو، اور جب برائی کو دیکھو تو اس کو چھوڑ دو اور یاد رکھو جبکہ تم بہت کم تھے، زمین میں کمزور سمجھے جاتے تھے۔"

حضرت عثمانؓ کی شہادت اور حضرت علیؓ کی خلافت:

یہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا خطبہ ہے، جیسا کہ آپ حضرات جانتے ہیں حضرت علی رضی اللہ عنہ کو خلافت اس وقت سپرد کی گئی تھی جبکہ ان کے پیش رو خلیفہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ شہید کر دیئے گئے تھے، کئی دن تک باغیوں نے ان کا محاصرہ کئے رکھا تھا، بالآخر جب انہوں نے دیکھا کہ اب حاجی لوگوں کے واپس آنے کا وقت آ گیا ہے تو انہوں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے مکان کی دیوار پھلانگ کر ان کو شہید کر دیا، اور اس حالت میں شہید کیا تھا کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ قرآن کریم کی تلاوت کر رہے تھے اور روزے سے تھے، حضرتؓ کے خون کا سب سے پہلا چھینٹا مصحف شریف کی جس آیت پر گرا وہ تھی:

"فَسَيَكْفِيكَهُمُ اللّٰهُ۔" (البقرہ:۱۳۷)

ترجمہ:......"اللہ تعالیٰ ان کے مقابلے میں آپ کی کفایت فرمائیں گے۔"

وہ تو جنت میں چلے گئے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین سے جا ملے، لیکن مسلمان اس وقت سے آج تک اس کی سزا بھگت رہے ہیں۔

شہادتِ عثمانؓ کے بعد:

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد مسلمانوں کے درمیان خانہ

جنگی ہوئی، جنگ جمل ہوئی، جنگ صفین ہوئی، اس کے علاوہ خارجیوں کے ساتھ مقابلے ہوئے، اور مسلمانوں کی وہ تلوار جو کافروں کے مقابلے میں چلتی تھی، اب آپس میں چلنے لگی، لوگوں کے اندازے کے مطابق تقریباً ستر ہزار (۷۰,۰۰۰) آدمی ان جنگوں میں کام آئے ہیں جو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد ہوئیں، جیسا کہ اس آیت شریفہ میں فرمایا تھا کہ اللہ تعالیٰ آپ کی کفایت فرمائیں گے۔

قاتلینِ عثمانؓ کا انجام:

جن لوگوں نے دیوار پھلانگ کر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو شہید کیا تھا، تمام کے تمام بری طرح قتل ہوئے، ان قاتلین میں ایک محمد بن ابی بکر بھی تھے، حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے صاحبزادہ جن کی پیدائش آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں حجۃ الوداع کے سفر میں ہوئی تھی، ان کی والدہ سے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی وفات کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ نے عقد کرلیا تھا، اس لئے یہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ربیب ہیں۔ لا الٰہ الا اللہ! ان شورش کرنے والے باغیوں میں یہ بھی شریک تھے اور ان پانچ آدمیوں میں جنہوں نے دیوار پھلانگی تھی یہ بھی شامل تھے، انہوں نے سب سے پہلے جاکر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی داڑھی پکڑی، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ”بھتیجے! اگر تمہارے والد اس حالت کو دیکھتے تو پسند نہ کرتے۔“ یہ فقرہ سن کر انہوں نے فوراً داڑھی چھوڑ دی اور واپس نکل آئے، بلکہ دوسرے لوگوں کو بھی ہٹانے کی کوشش کی، یہ صرف ایک صحابی تھے بایں معنی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں پیدا ہوئے تھے، اگرچہ بچے تھے، ورنہ علمائے تاریخ اس بات پر متفق ہیں کہ ایک بھی صحابی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف شورش کرنے والوں میں شریک نہیں، اللہ تعالیٰ نے صحابہؓ کا دامن اس سے پاک رکھا۔ محمد بن ابی بکر بعد میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی جانب سے گورنر بنادیئے گئے تھے، اور وہاں ان کو قتل کیا

گیا۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے بھائی تھے، جس دن حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے سنا، بہت زیادہ صدمہ ہوا، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی زندگی میں یہ واقعہ ہوا۔

مدینہ پر باغیوں کا تسلط:

بہرکیف! حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو شہید کردینے کے بعد مدینہ میں باغیوں کا تسلط تھا اور اکابر صحابہؓ میں کوئی بھی خلافت کا کام سنبھالنے کے لئے تیار نہیں تھا، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو بھی رات کی تاریکی میں چند حضرات نے جنازہ پڑھ کر بقیع کی ایک جانب دفن کردیا۔ وہ جگہ اس وقت جنت البقیع میں شامل نہیں تھی، اس کی دیوار سے باہر تھی، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے دفن ہوکر اس جگہ کو جنت البقیع میں شامل کرایا، اب تو بقیع اس سے بھی آگے چلا گیا ہے۔

حضرت علیؓ کا امت کو سنبھالنا:

تو تین دن تک مدینہ میں باغیوں کا تسلط رہا، لیکن حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے تیسرے دن خلافت قبول کی، خلافت اس حالت میں قبول فرمائی کہ کہنا چاہئے کہ زمین شر و فساد سے بھری ہوئی تھی، اور اس بنا پر امیر المؤمنین حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کا ساڑھے چار سال کا زمانہ خلافت کا قریب قریب شورشوں میں گزرا، ایک دن بھی ٹک کر بیٹھنا نصیب نہیں ہوا، کافروں کے مقابلے میں جہاد معطل ہوگیا، مسلمانوں کی آپس میں تلوار چل گئی، جس میں ستر ہزار کے قریب آدمی مارے گئے، تو حضرت علی رضی اللہ عنہ کے عجیب و غریب خطبات ہیں، کیونکہ دیکھ رہے تھے کہ مسلمانوں کو دنیا کے سانپ نے ڈس لیا ہے، مسلمانوں کی ایک دوسرے کی عزت و آبرو ٹنا شروع ہوگئی ہے، نومسلم لوگ جو بعد میں مسلمان ہوئے تھے اور جنھوں نے دین کو پورا نہیں سمجھا تھا ان کا غلبہ ہوگیا ہے، صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کچھ اُٹھ چکے تھے، کچھ پابہ رکاب تھے، ایسے حالات میں خلافت کو قبول کرنا اور امت کو سنبھالنا،

یہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا دل گردہ تھا، ان کی ہمت تھی، بلاشبہ وہ خلیفۂ راشد ہیں اور حضرات ابوبکر وعمر وعثمان رضوان اللہ علیہم اجمعین کے معیار کے آدمی ہیں، معمولی آدمی نہیں۔

حضرت علیؓ کا پہلا خطبہ:

تو سب سے پہلا خطبہ جو دیا اس میں اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا کے بعد ارشاد فرمایا کہ: اللہ تعالیٰ نے کتابِ ہادی نازل فرمائی ہے، جو ہدایت دینے والی کتاب ہے (قرآن کریم) اور اللہ تعالیٰ نے اس میں خیر اور شر کو بیان فرمادیا ہے، خیر کی باتوں کو بھی بیان فرمادیا ہے، شر کی باتوں کو بھی بیان فرمادیا ہے۔

خیر کو اپناؤ اور شر کو چھوڑ دو:

خیر کی باتوں کو بیان کرنے سے مقصود یہ ہے کہ بندے خیر کے ان اعمال کو اختیار کریں اور شر کو ذکر کرنے سے مقصود یہ ہے کہ بندے ان چیزوں سے اجتناب کریں، ان چیزوں سے بچیں۔ اس لئے فرمایا کہ: ”فَخُذُوْا بِالْخَیْرِ وَدَعُوا الشَّرَّ۔“ خیر کی چیز کو لو اور شر کو چھوڑ دو، اللہ تعالیٰ نے جتنے خیر کے کام کلام پاک میں ذکر فرمائے ہیں، ان کو اختیار کرو اور جتنے شر کے کام ذکر فرمائے ہیں ان کو چھوڑ دو، اللہ تعالیٰ نے اپنی پاک کتاب میں اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی سنت میں بہت سے فرائض بیان فرمائے ہیں، ایک مسلمان کے ذمے کیا کیا چیزیں فرض ہیں؟

مخدوم محمد ہاشم اور ان کی فرائض اسلام:

ٹھٹھہ سندھ کے ایک بزرگ ہوئے ہیں مولانا مخدوم محمد ہاشم سندھی رحمہ اللہ تعالیٰ، جن کی کتاب ہے: ”بذل القوۃ فی سن النبوۃ“ اس کا میں نے ”عہدِ نبوت کے ماہ وسال“ کے نام سے ترجمہ کیا تھا۔ یہ کتاب دراصل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ ہے، اور انہوں نے عجیب انداز سے اس کو مرتب کیا ہے، میں نے ایک

بزرگ کی فرمائش پر اس کا ترجمہ کیا تھا، اور اس کے مقدمہ میں میں نے لکھا تھا کہ: یہ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے ہم عصر ہیں، ان کے زمانے کے آدمی ہیں، اور کہنا چاہئے کہ یہ خطہ سندھ کے اپنے وقت کے شاہ ولی اللہ تھے، اتنے بڑے عالم کہ عقل حیران ہوجاتی ہے۔ ٹھٹھہ میں ان کے مزار کی زیارت بھی کرکے آیا ہوں، میں نے اپنے اس مقدمہ میں لکھا ہے کہ دینی موضوعات میں سے کوئی موضوع مشکل سے ہوگا جس پر مخدوم صاحبؒ نے کتاب نہ لکھی ہو، اس وقت زبان فارسی تھی اور علاقائی زبان سندھی تھی اور ہماری دینی زبان عربی ہے، تینوں زبانوں میں ان کی کتابیں ہیں اور تینوں زبانوں پر یکساں عبور ہے، بہت سی کتابیں لکھی ہیں اور بڑی طویل طویل کتابیں لکھیں، لیکن کیا مجال ہے کہ ان کی تحریر کی ایک سطر بھی معیار سے نیچی ہوگئی ہو؟ میں کہنے یہ لگا تھا کہ ان کا ایک رسالہ عربی میں ''فرائض الاسلام'' کے نام سے ہے، وہ چھپ گیا ہے، جہاں تک مجھے یاد ہے اس کا اردو ترجمہ بھی چھپ گیا ہے، جس میں بتلایا گیا ہے کہ ایک مسلمان کے ذمہ اللہ تعالیٰ کی کون کون سی چیزیں فرض ہیں؟

تو حضرت امیر المؤمنین رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حق تعالیٰ شانہ نے بہت سی چیزوں کو فرض فرمایا ہے، ان فرائض کو ادا کرو، اللہ کی بارگاہ میں ادا کرو، اللہ تعالیٰ ان کی برکت سے تمہیں جنت میں پہنچادیں گے، فرائض کو ادا کرو، مخلوق کو دکھانے کے لئے نہیں اور مخلوق کی خاطر نہیں، بلکہ فرائض کا ادا کرنا اللہ کی بارگاہ میں ہے، یعنی محض حق تعالیٰ شانہ کی رضا کے لئے کرو۔

فرائض ومحرمات معلوم ہیں:

اس کے بعد ارشاد فرمایا کہ جس طرح اللہ تعالیٰ نے کچھ فرائض مقرر کئے ہیں اسی طرح اللہ تعالیٰ نے کچھ چیزوں کو حرام فرمایا ہے: ''غَیْرُ مَجْھُوْلَۃٍ۔'' وہ مجہول نہیں ہیں، نامعلوم نہیں ہیں، بلکہ ہر شخص ان کو جانتا ہے۔

فرائض کی اور محرماتِ قطعیہ کی یہ شان ہے کہ جو جانتے ہیں وہ تو جانتے ہیں اور جو نہیں جانتے وہ بھی جانتے ہیں، اسلام کے فرائض کو، موٹے موٹے فرائض اسلام کو ہر آدمی، ہر کس وناکس جانتا ہے، گو تفصیلات زیادہ نہ جانتا ہو، اور اسی طرح ہماری شریعت نے جن چیزوں کو حرام کیا ہے، وہ بھی کوئی مخفی نہیں ہیں، بلکہ موٹی موٹی محرمات، یہ قریب قریب ہر مسلمان کو معلوم ہوتی ہیں، بعض چیزیں ایسی بھی ہیں جن کو علمأ جانتے ہیں عوام نہیں جانتے، لیکن مشہور چیزیں محرمات میں سے چاہے مسلمان خود ان کے مرتکب بھی ہوں، تب بھی جانتے ہیں کہ یہ حرام ہیں، چنانچہ کسی مسلمان کو قتل کرنا، کسی کی جان لینا، کسی کا ناحق مال کھانا، کسی کے مال پر قبضہ کرلینا، کسی پر ناحق تہمت لگانا، سود کھانا، یتیموں کا مال کھانا، یہ ایسی چیزیں ہیں جن کو سارے مسلمان جانتے ہیں، کوئی مسلمان تمہیں ایسا نہیں ملے گا جو یہ کہتا ہو کہ مسلمانوں کو قتل کرنا حلال ہے، کوئی نہیں مانے گا کہ کسی کی چوری کرنا، کسی کا ناحق مال لینا یہ جائز ہے، کوئی مسلمان ایسا نہیں ہوگا۔

فرائض شرعی کا منکر کافر ہے:

اب ایک مسئلہ بتادیتا ہوں اس کو اچھی طرح ذہن نشین کرلیا جائے۔ ہماری عقائد کی کتابوں میں یہ لکھا ہے کہ فرائض شرعیہ جو قطعی ہیں، ان کا انکار کرنے والا مسلمان نہیں ہے

محرماتِ قطعیہ کا منکر کافر ہے:

اور محرماتِ قطعیہ جو قطعی ہیں، ان کی حرمت کا انکار کرنے والا مسلمان نہیں ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ بہت سے مسلمان، اللہ بچائے! زنا کے بھی مرتکب ہیں، لیکن تمہیں کوئی مسلمان ایسا نہیں ملے گا جو یہ کہتا ہو کہ زنا حلال ہے، اور جو زنا کو حلال کہے وہ مسلمان نہیں رہتا۔ بہت سے مسلمان چوری ڈکیتی کرتے ہیں لیکن تمہیں کوئی مسلمان

لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ پڑھنے والا جو اللہ پر اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان رکھتا ہو، ایسا نہیں ملے گا جو ان گناہوں کو جائز سمجھتا ہو، اور جو جائز سمجھے وہ مسلمان نہیں ہے۔

نماز کی فرضیت کا منکر کافر ہے:

کتنے مسلمان ہیں جو پنجگانہ نماز نہیں پڑھتے، لیکن جس مسلمان سے بھی پوچھو وہ کہے گا کہ نماز فرض ہے، یہ تو اللہ کا فرض ہے، پنجگانہ نماز اللہ کا فرض ہے، خدانخواستہ اگر کوئی نماز کی فرضیت کا منکر ہوجائے تو وہ مسلمان نہیں۔

روزے کی فرضیت کا منکر کافر ہے:

رمضان المبارک کے روزے ہیں، بہت سے مسلمان نہیں رکھتے، اس کے باوجود جانتے ہیں کہ روزہ رکھنا فرض ہے، اللہ کا فرض ہے، آدمی تندرست ہو اور مقیم ہو، روزہ رکھنے کی طاقت رکھتا ہو تو اس کے ذمہ روزہ رکھنا فرض ہے، ہاں! بیمار ہو تو اس کے بارے میں حکم ہے کہ دوسرے وقت میں رکھ لے، سفر میں ہو تو اس کو بھی رخصت ہے کہ سفر میں روزہ نہ رکھے کہ دوسرے وقت میں رکھ لے، لیکن بہرحال روزہ فرض ہے، تو کتنے مسلمان ایسے ہیں جو رمضان کے روزہ کے تارک ہیں، لیکن ان سے پوچھئے تو وہ کہتے ہیں کہ جی! روزہ تو فرض ہے، اللہ کا فرض ہے اور اگر خدانخواستہ کوئی اس کا منکر ہوجائے تو وہ مسلمان نہیں رہتا۔

فرضیت زکوٰۃ کا منکر کافر ہے:

یہی حکم زکوٰۃ کا بھی ہے، بہت سے مسلمان بخل کی وجہ سے زکوٰۃ نہیں دیتے، بہت سے مسلمان باوجودیکہ ان کے ذمہ زکوٰۃ فرض ہے، زکوٰۃ ادا نہیں کرتے، اور بعض دے دیتے ہیں، لیکن پورا حساب کرکے نہیں دیتے، ایسے ہی اندازے سے دے دی، نہیں بھائی! زکوٰۃ تو پورا حساب کرکے دینی چاہیئے، دو پیسے زیادہ ہی نکلیں، کم

نہ رہے۔

میت کو فرائض شرعیہ سے سبکدوش کرو:

رات ایک صاحب کے خط کا جواب لکھ رہا تھا، میں نے جواب میں لکھا کہ میت کے ایصالِ ثواب کے لئے سب سے پہلی چیز یہ ہے کہ میت کو فرائض شرعیہ سے سبکدوش کیا جائے، اب لوگ ان چیزوں کا اہتمام تو کرتے ہیں تیجا کردو، دسواں کردو، چالیسواں کردو، فلاں کام کردو، قرآن مجید پڑھوادو اور کچھ صدقہ و خیرات بھی کردیتے ہیں، فرض کرلو کہ وہ اخلاص کے ساتھ کرتے ہیں، محض ایصالِ ثواب کے لئے کرتے ہیں، درمیان میں نیت کھوٹی نہیں اور یہ بھی فرض کرلو صحیح طریقہ اختیار کرتے ہیں، غلط نہیں اختیار کرتے، تو کہنا یہ ہے کہ کیا اس معمولی ایصالِ ثواب سے اس کے فرائض ختم ہوجائیں گے؟

زندگی بھر کے نفلی روزے رمضان کے ایک روزہ کا بدل نہیں:

آپ لوگوں نے حدیث سنی ہوئی ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ:

”مَنْ اَفْطَرَ یَوْمًا مِنْ رَمَضَانَ مِنْ غَیْرِ رُخْصَةٍ وَلَا مَرَضٍ، لَمْ یُقْضَ عَنْهُ صَوْمُ الدَّهْرِ کُلِّهٖ وَاِنْ صَامَهٗ۔“

(مشکوٰۃ ص:۱۷۷)

ترجمہ:......”جس شخص نے رمضان مبارک کا ایک روزہ جان بوجھ کر چھوڑ دیا، نہیں رکھا قدرت کے باوجود اللہ تعالیٰ اس کو عمر نوح عطا فرمائیں اور یہ ساری عمر نفلی روزہ رکھتا رہے، تب بھی اس کا معاوضہ ادا نہیں ہوتا۔“

فرائض، فرائض ہیں، ایک آدمی فرض ادا نہیں کرتا نوافل میں لگا ہوا ہے،

اس کے نوافل کی کیا قیمت ہے اللہ کے نزدیک؟

فجر کی جماعت رات بھر کے نوافل سے بہتر ہے:

مؤطا امام مالک میں ہے کہ امیر المؤمنین حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے پاس ایک نوجوان بیٹھتا تھا، (غالباً اس کا نام سلیمان بن ابی حثمہ تھا) حضرت عمرؓ کو بھی اس سے تعلق تھا، آپؓ فجر کی نماز کے بعد تتبع کیا کرتے تھے، یعنی حاضری لیا کرتے تھے کہ کون کون آدمی حاضر ہے اور کون کون نہیں آیا؟ ایک دن فجر کی نماز میں اپنے اس دوست کو نہیں دیکھا، تو وہاں مسجد سے سیدھے اس کے گھر گئے اس کی والدہ ملیں، آپؓ نے ان کی والدہ سے فرمایا:

”..... لَمْ اَرَ سُلَيْمَانَ فِىْ صَلٰوةِ الصُّبْحِ! فَقَالَتْ: اِنَّهٗ بَاتَ يُصَلِّىْ فَغَلَبَتْهُ عَيْنَاهُ. فَقَالَ عُمَرُ: لَاَنْ اَشْهَدَ صَلٰوةَ الصُّبْحِ فِى الْجَمَاعَةِ اَحَبُّ اِلَىَّ مِنْ اَنْ اَقُوْمَ لَيْلَةً.“ (مؤطا امام مالک ص:۱۱۵)

ترجمہ:......” آج سلیمان کو میں نے صبح کی نماز میں نہیں دیکھا! اس کی والدہ کہنے لگیں کہ ساری رات اللہ کی عبادت میں مشغول رہے، فجر کے وقت آنکھ لگ گئی (اس لئے جماعت میں شریک نہیں ہوسکے)۔ حضرت نے ارشاد فرمایا کہ: فجر کی نماز میں جماعت میں شریک ہوجاتے تو تمام رات عبادت میں کھڑے رہنے سے میرے نزدیک یہ افضل تھا۔“

فجر کی جماعت کی اہمیت:

بھائی! کچھ سمجھے؟ ساری رات کھڑے ہوکر تم اللہ کی عبادت کرو لیکن فجر کی نماز میں شرکت نہ کرو، اللہ کے نزدیک اس رات بھر کی عبادت کی قیمت نہیں، اور تم

ساری رات سوتے رہو، فجر کی نماز میں شرکت کرو تو یہ اس سے زیادہ قیمتی ہے، لوگ اس سے بہت غافل ہیں، اپنی زندگی میں بھی اور مرنے کے بعد ان کے وارثین، لواحقین جو اپنے باپ کے لئے، اپنے عزیزوں کے لئے ایصالِ ثواب کا اہتمام کرتے ہیں اور ان کے بارے میں بڑے فکرمند ہوتے ہیں، بعض بے چارے بڑے فکرمند ہوتے ہیں۔

مرحوم کی قضا نمازوں اور روزوں کا حساب لگا کر فدیہ دو:

لیکن کیا کبھی حساب کر کے یہ بھی دیکھا کہ اس کے ذمہ کتنی نمازیں فرض رہ گئی ہیں؟ روزے اس کے ذمہ کتنے رہ گئے تھے؟ زندگی کے کتنے سالوں میں اس نے زکوٰۃ ادا نہیں کی؟ حج فرض تھا، لیکن نہیں کر پایا یا نہیں کیا؟ بھائی! ان فرائض سے سبکدوش کرواؤ، ایصالِ ثواب کو مہربانی کر کے رہنے دو۔

ایک روزہ کا فدیہ:

پھر میں نے لکھا کہ ایک روزے کا فدیہ ایک صدقہ فطر کے مطابق، ایک صدقہ فطر کے برابر ہے، دو وقت کا مسکین کو کھانا کھلا دینا یا تقریباً پونے دو سیر، پونے دو کلو رکھ لو، اب تو سیر نہیں رہے، اس کے قریب قریب غلہ یا اس کی نقد قیمت دے دو، یہ ایک روزے کا فدیہ ہے، ایک رمضان کے فدیے ہوگئے تیس۔ اگر دس رمضانوں کے روزے اس کے ذمہ باقی تھے تو اس کے فدیے ہوگئے تین سو۔

نمازوں کا فدیہ:

پھر جتنا فدیہ ایک روزہ کا ہے، اتنا ہی فدیہ ایک نماز کا ہے، اور نمازیں دن میں وتر سمیت چھ ہوتی ہیں، پانچ فرض اور چھٹی واجب، واجب بھی فرض ہوتی ہے، عملی فرض ہوتا ہے، اعتقادی فرض نہیں ہوتا، عملی فرض ہوتا ہے، تو ایک نماز کا فدیہ ایک صدقہ فطر کے برابر، ایک دن کی نمازوں کے چھ صدقے، ایک مہینے کی نمازوں کے ایک سو اسّی صدقے اور ایک سال کی نمازوں کے اکیس سو ساٹھ صدقے، یعنی دو ہزار

ایک سو ساٹھ، یہ اگر تم میت کی طرف سے ادا کردو تو حضرت امام محمد رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ توقع کی جائے گی کہ اللہ تعالیٰ اس کو قبول کرلیں گے، یقین سے نہیں کہہ سکتے کہ وہ یقینی بات صرف روزے کے بارے میں فرمائی ہے، تو ایک سال کا صدقہ یعنی فدیہ نمازوں کا، ایک سال کی نمازیں کسی کے ذمہ قضا ہوں، اکیس سو ساٹھ ہے، دو ہزار ایک سو ساٹھ صدقے۔ آج کل تو قیمت زیادہ ہوگئی، لیکن اگر دس روپے فرض کرلئے جائیں تو اکیس ہزار چھ سو (۲۱,۶۰۰) روپے، یہ ایک سال کی نمازوں کا فدیہ ہے، اسی طرح روزوں کا، اسی طرح زکوٰۃ کا حساب کرو، اور اس کی جانب سے زکوٰۃ ادا کرو، حج نہیں کیا تو اس کا حج بدل کراؤ۔

پہلے فرائض کی سبکدوشی پھر ایصال ثواب:

جب ان فرائض سے سبکدوش کردو گے تو پھر ایصالِ ثواب پوچھنا، تم ایصالِ ثواب کہتے ہو، جیسے بھی کچا پکا، الٹا سیدھا، وہ تو پکڑا ہوا ہے زنجیروں میں، پہلے اس کو چھڑواؤ تو صحیح، ایصالِ ثواب تو ترقیات کے لئے ہوتا ہے۔ اسی طرح اگر لوگوں کے قرضے اس کے ذمہ ہیں تو ان قرضوں کو بھی ادا کرو۔

اپنی آخرت کی خود فکر کرو:

اب آپ کی عقل میں بات آئے گی کہ ہم اپنی زندگی میں غافل تھے اور مرنے کے بعد ہمارے وارث بھی غافل ہیں۔ ان کو غافل ہونا بھی چاہیۓ، اس لئے کہ جب ہم نے اپنی زندگی میں کچھ نہیں کیا تو وارث ہمارے کیا لگتے ہیں؟ بھئی میں اپنی جان کا جتنا خیر خواہ ہوں دوسرے بیوی، بچے، عزیز و اقارب، دوست و احباب تو اتنے میرے خیر خواہ نہیں ہوں گے، جب مجھے اپنا ہی اہتمام نہیں تو دوسرے میرا اہتمام کیوں کریں گے؟ رو پیٹ کے بیٹھ جائیں گے، بس یہی ان کی محبت ہے، ان کو یہ معلوم نہیں کہ یہ کس جگہ پکڑا ہوا ہے؟ اور اس کو کیسے چھڑائیں؟

نماز روزہ میں نیابت جائز نہیں:

بعض لوگ پوچھتے ہیں کہ اس نے روزے نہیں رکھے تھے، ہم ان کی جگہ روزے رکھ لیں؟ اس نے نمازیں نہیں پڑھی تھیں، ہم ان کی نمازیں لوٹادیں؟ خوب یاد رکھو! نماز روزے میں نیابت نہیں ہوتی۔ مؤطا امام مالک میں ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے پوچھا گیا کہ کیا کوئی کسی کی طرف سے نماز یا روزہ رکھ سکتا ہے؟ تو انہوں نے فرمایا:

"لَا یَصُوْمُ اَحَدٌ عَنْ اَحَدٍ وَلَا یُصَلِّیْ اَحَدٌ عَنْ اَحَدٍ۔" (مؤطا امام مالک ص:۲۴۵)

ترجمہ:......"کوئی آدمی دوسرے کی جانب سے روزہ نہیں رکھ سکتا، کوئی آدمی دوسرے کی جانب سے نماز نہیں پڑھ سکتا۔"

حج وزکوٰۃ میں نیابت ہوتی ہے:

ہاں! زکوٰۃ دے سکتا ہے اس کے حکم سے، حج بدل کرسکتا ہے اس کے حکم سے، لیکن وہ تو مرگیا تو اس کا وارث اگر اپنی طرف سے دے، تو اللہ تعالیٰ سے توقع ہے کہ اللہ تعالیٰ قبول فرمالیں گے اور میت کو رہائی عطا فرمادیں گے۔

اللہ مجھے معاف فرمائے جیسے کہ میں عرض کررہا ہوں، یوں تو ہم مسلمان سمجھتے ہیں کہ یہ چیزیں فرض ہیں، لیکن عملی طور پر ہم نے ان کو فرائض کی فہرست سے خارج کردیا ہے، ایک آدمی نمازیں نہیں پڑھتا، روزے نہیں رکھتا، زکوٰۃ نہیں دیتا، حج اس نے نہیں کیا، مرگیا، ہے پکا مسلمان، میاں جی بھی بے چارہ اس کی نماز جنازہ پڑھادے گا، کوئی فرق نہیں پڑتا، تو میرا بھائی! اللہ نے جو فرائض مقرر کئے ہیں ان کو ادا کرنے کا اہتمام کرو۔

قرض کی ادائیگی کی دو ہی صورتیں ہیں:

اور یہ خوب یاد رکھو کہ جو قرض کسی کے ذمہ ہوتا ہے، اس کے ادا کرنے کی دو ہی صورتیں ہیں تیسری کوئی صورت نہیں ہوتی، یا ''ادا'' یا ''اِبرا'' یا تو آدمی قرض ادا کردے یا قرض والا معاف کردے، جس کا قرض ہے، وہ کہہ دے میں نے چھوڑ دیا تو خلاصی مل گئی یا اس نے قرض ادا کردیا، یہ ادا نہیں کرتا وہ ابرا نہیں کرتا، معاف نہیں کرتا، تم بتلاؤ کہ اس کے پکڑے جانے میں کیا شبہ ہے؟ اور ہماری شریعت کا حکم ہے کہ اگر کوئی شخص کسی کا مقروض ہو تو وہ اس کو پکڑوا سکتا ہے، جیل میں بند کروادے جب تک کہ اس کا قرضہ ادا نہیں کرتا، تو فرائض کے ادا کرنے میں تو ہم نے کوتاہی کی اور صاحب حق اللہ تعالیٰ ہیں، ویسے تو اللہ بخشنے پر آئیں تو سبھی کچھ بخش دیں، لیکن بھائی کوئی قانون اور ضابطہ تو نہیں ہے، تمہیں صحت دی تھی، قوت دی تھی، آنکھیں دی تھیں، کان دیئے تھے، زبان دی تھی، ہاتھ پاؤں دیئے تھے، تم نے یہ فرائض کیوں ادا نہیں کئے؟ پوچھ سکتے ہیں، اور اگر سارے گناہگاروں کو معاف کردیں تو ان کا ہاتھ پکڑنے والا کون ہے؟ ان کی رحمت ہے معاف کردیں، معاف کرنا چاہیں تو ہم جیسے گناہگاروں کو بھی معاف کردیں، اور پکڑنا چاہیں تو اچھے اچھوں کو پکڑلیں، یہ تو اس کی مرضی پر ہے۔

فرائض کے ادا کرنے اور محرمات سے بچنے کا اہتمام کرو:

بہرحال یہاں کہنا یہ ہے کہ فرائض کے ادا کرنے کا اہتمام کرو اور محرمات سے بچنے کا اہتمام کرو، فرض کو فرض سمجھنا یہ مسلمانی ہے، اور فرض کو فرض نہ سمجھنا کفر ہے، جو چیزیں کہ قطعی طور پر حرام ہیں، جس کو حضرت فرمارہے ہیں: ''اِنَّ اللّٰہَ حَرَّمَ حُرُمًا غَیْرَ مَجْھُوْلَۃٍ۔'' کہ اللہ تعالیٰ نے چیزیں حرام کی ہیں، ان کا حرام ہونا مجہول نہیں ہے۔

قطعی محرمات کو حلال سمجھنا کفر ہے:

ہر آدمی جانتا ہے، ایسی قطعی محرمات میں سے کسی ایک کو حلال سمجھ لینا کفر ہے، تم جانتے ہو کہ ماں، بہن سے نکاح ہوسکتا ہے؟ نعوذ باللہ! استغفر اللہ! قرآن کریم میں ہے:

”حُرِّمَتْ عَلَيْكُمْ أُمَّهٰتُكُمْ وَبَنَاتُكُمْ وَاَخَوَاتُكُمْ وَعَمَّاتُكُمْ وَخَالَاتُكُمْ.....“ (النسآ:۲۳)

اللہ تعالیٰ نے بیان فرمادیا قرآن کریم میں کہ تم پر تمہاری مائیں، تمہاری بیٹیاں اور تمہاری بہنیں اور تمہاری پھوپھیاں اور تمہاری خالائیں حرام ہیں۔

ایک صاحب کا میرے پاس خط آیا کہ ایک آدمی نے اپنی بہن سے نکاح کیا ہوا ہے، ایسے لوگ بھی ہیں، ایسے کافر بھی! لیکن میں یہ ”کافر“ کا لفظ محاورۃً کہہ رہا ہوں، بھائی! اگر وہ سمجھتا ہے کہ یہ گناہ ہے، بہن سے نکاح نہیں ہوسکتا، اس بات کا قائل ہے تو ہم اس پر کفر کا فتویٰ نہیں دیں گے، گناہگار ہے، ہاں! اگر سمجھتا ہے کہ اس میں کوئی حرج نہیں، تو پھر کافر ہے، کسی گناہ کو حلال سمجھنا کفر ہے، ہماری عقائد کی کتابوں میں ہے، میں حوالہ دے رہا تھا ناں! کہ ہماری عقائد کی کتابوں میں لکھا ہے کہ: ”اِسْتِحْلَالُ الْمَعْصِيَةِ كُفْرٌ۔“ کسی معصیت کے کام کو، گناہ کے کام کو جبکہ وہ قطعی ہو، حلال سمجھنا کفر ہے۔

مسلمان کی حرمت سب محرمات سے بڑھ کر ہے:

اس کے بعد ارشاد فرمایا کہ بھئی اللہ تعالیٰ نے حرام تو بہت سی چیزیں فرمائی ہیں، لیکن مسلمان کی حرمت تمام محرمات سے بڑھ کر ہے، مسلمان کی جان، اس کی آبرو اور اس کا مال یہ بھی ایک مسلمان کے لئے حرام ہیں، حدیث میں ہے:

”كُلُّ الْمُسْلِمِ عَلَى الْمُسْلِمِ حَرَامٌ دَمُهٗ وَمَالُهٗ وَعِرْضُهٗ۔“ (مشکوٰۃ ص:۴۲۲)

ترجمہ:......”ہر مسلمان کا دوسرے مسلمان کے لئے حرام ہے اس کا خون بھی، اس کا مال بھی اور اس کی آبرو بھی۔“

مسلمان کی حرمت کعبہ سے بڑھ کر ہے:

جس دن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجرت کی تھی، بیت اللہ کی طرف منہ کرکے فرمایا کہ: بیت اللہ! میرے دل میں جتنی تیری قدر و قیمت ہے وہ اللہ جانتا ہے لیکن میں کیا کروں؟ میری قوم مجھے یہاں رہنے نہیں دیتی۔ اور پھر فرمایا: تو بڑی حرمت والا ہے، بڑی عزت والا ہے، لیکن اللہ کی قسم! مؤمن کی عزت تجھ سے زیادہ ہے۔ اور یہ تو اس دن فرمایا تھا۔

حجۃ الوداع میں آخری دن، آخری حج میں جس کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اسّی دن دنیا میں تشریف فرما رہے، اس خطبہ میں فرمایا تھا کہ: ”اَیُّ شَھْرٍ ھٰذَا؟“ یہ کون سا مہینہ ہے؟ کہا کہ: ذی الحجہ کا مہینہ ہے! لیکن صحابہ نے یہ جواب نہیں دیا بلکہ فرمایا کہ: ”اَللهُ وَرَسُوْلُهٗ اَعْلَمُ!“ بھائی ذی الحجہ تھا، حج کے لئے گئے ہوئے ہیں ناں! تو ذی الحجہ تھا، ذی الحجہ حرمت کے مہینوں میں سے ہے، لیکن صحابہؓ نے ادب کے طور پر فرمایا کہ: ”اَللهُ وَرَسُوْلُهٗ اَعْلَمُ!“ فرمایا کہ: کیا یہ ذی الحجہ کا مہینہ نہیں ہے؟ کہا کہ: ہاں! ذی الحجہ کا مہینہ ہے، حرمت والا مہینہ ہے۔ پھر فرمایا کہ: ”اَیُّ بَلَدٍ ھٰذَا؟“ یہ کون سا شہر ہے؟ اب دنیا نہیں جانتی کہ مکہ ہے؟ لیکن صحابہؓ نے کہا: ”اَللهُ وَرَسُوْلُهٗ اَعْلَمُ!“ فرمایا کہ: کیا یہ مکہ نہیں ہے؟ کہا کہ: ہاں! مکہ ہی ہے۔ پھر فرمایا کہ: یہ کون سا دن ہے؟ یہ دن تھا ”یَوْمُ النَّحْرِ“ کا، پھر فرمایا کہ: اللہ کی قسم! ایک مسلمان کی حرمت ”کَحُرْمَةِ شَھْرِکُمْ ھٰذَا فِیْ بَلَدِکُمْ ھٰذَا وَفِیْ یَوْمِکُمْ ھٰذَا!“ کسی مسلمان کی

حرمت اتنی عزت والی ہے جیسے کہ اس مہینہ میں، اس شہر میں اور اس دن میں یعنی اس مہینے کی حرمت، اس شہر کی حرمت اور اس دن کی حرمت جتنی ہے، مسلمان کی حرمت اس سے بڑھ کر ہے۔

ایک درہم کے بدلے ستر مقبول نمازیں:

تو یہ بات یاد رکھو یہاں پر ایک تنبیہ کر دینا چاہوں گا، اس میں ہم لوگ مبتلا ہیں، سب مبتلا ہیں میں بھی مبتلا ہوں، اللہ ہمیں معاف فرمادے، اب تو لوگ کسی کے خون کے ساتھ ہاتھ رنگنے سے بھی پرہیز نہیں کرتے، مسلمانوں کی حرمت دل سے نکل گئی ہے، لیکن دو چیزوں میں ہم احتیاط نہیں کرتے، ایک کسی کا مال ناحق کھانے میں احتیاط نہیں کرتے اور دوسرے کسی کو بے آبرو کرنے میں احتیاط نہیں کرتے۔ ''درمختار'' میں لکھا ہے کہ ایک درہم اگر کسی کا کھائے (تقریباً ساڑھے تین ماشے چاندی کا ہوتا ہے)، اگر کسی کا ایک درہم ناحق کھایا ہو تو قیامت کے دن ستر مقبول نمازیں اس کے بدلے میں دلائی جائیں گی، تمہارے پاس مقبول نمازیں ہیں کتنی؟ تم یہاں کھا پی کر ہضم کر لیتے ہو، ڈکار لے لیتے ہو، تمہیں معلوم نہیں کہ زہر کھایا ہوا ہضم نہیں ہوا کرتا، یہ نکل کے رہتا ہے، کسی مسلمان کا ناحق مال کھانا، یہ کبھی ہضم نہیں ہوگا، جس کا مال کھایا ہے، وہ دعویٰ نہ کر سکے، اپنا حق ثابت نہ کر سکے، اپنا حق تم سے وصول نہ کر سکے، لیکن ایک عدالت قائم ہونے والی ہے، جہاں پر حق والے کو اس کا حق دلایا جائے گا، ہاں! دل کی خوشی سے کھاؤ، ٹھیک ہے، سارا ہی کھالو، بقول سعدی رحمہ اللہ کے کہ: ''دشمناں را پوست برکند دوستاں را پوستین۔'' دشمنوں کا چمڑا اتار لیا کرو اور دوستوں کی پوستین اتار لیا کرو۔ خوشی سے کرلو، چاہے پوستین بھی اتار لو، لیکن اس کی دل کی خوشی کے بغیر اگر کھاؤ گے تو یہ بھرنا پڑے گا اور ایک درہم یعنی ساڑھے تین ماشے چاندی کے بدلے میں ستر مقبول نمازیں دلائی جائیں گی، ہم لوگ اس معاملہ میں احتیاط نہیں کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں معاف فرمائے، اللہ ہمیں معاف فرمائے، احتیاط کی ضرورت ہے۔

قومی اموال کی چوری سنگین ترین جرم!

بطورِ خاص جو مال کہ کسی خاص شخص کی ملکیت نہیں، بلکہ عام مسلمانوں کی چیز ہے اس میں تو اور بھی زیادہ گھپلا کرتے ہیں لوگ، بجلی کی چوری کرتے ہیں، بجلی کی چوری کرکے مسجدوں میں روشنی کرتے ہیں، بجلی کی چوری کرکے جس مکان میں روشنی کروگے اور اس مکان میں نماز پڑھو گے، نماز قبول نہیں ہوگی، مذہبی تقریبات میں چوری کرکے روشنی کرتے ہیں، عرسوں میں اور دوسری چیزوں میں نعوذ باللہ! یہ جو اجتماعی پیسہ ہے، اس کا معاملہ اور بھی سنگین ہے، بھئی ایک آدمی کا پیسہ تم نے کھایا، جیسے کہ میں نے عرض کیا وہ بھی گناہ کی بات ہے، لیکن پھر بھی اس کی منت سماجت کرلو تو شاید مان جائے، اب یہ اجتماعی چیز جس میں دس کروڑ مسلمان شریک ہیں، کس کس سے معافی مانگتے رہوگے؟ کروڑوں انسانوں کا حق اپنی گردن پر لے کے جاؤگے اور قیامت کے دن یہ سارے کے سارے تمہارے "خصماء" ہوں گے، قرض خواہ ہوں گے، کسی کا ناحق مال کھانے سے بچو۔

مسلمانوں کی آبروریزی سے بھی احتیاط:

دوسری چیز جس میں ہم احتیاط نہیں کرتے وہ مسلمانوں کی آبرو ہے، کسی کی تحقیر کرنا، کسی کو برا بھلا کہنا، کسی کا مذاق اڑانا، کسی کی غیبت کرنا، کسی کے عیب اس کے سامنے بیان کرنا، جبکہ اصلاح کا مقصد نہ ہو، بلکہ عار دلانا مقصد ہو۔

یہ تمام کی تمام چیزیں گناہِ کبیرہ ہیں اور یہ لوگوں کے حقوق ہیں جو ہم اپنے ذمے لے رہے ہیں اور قیامت کے دن ہمیں ان کو ادا کرنا ہوگا، اللہ تعالیٰ ہمیں فہم عطا فرمائے، ہدایت نصیب فرمائے۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

معاشرہ کی اچھائی اور برائی کا معیار!

میری بات یاد رکھو! کتابوں سے تمہیں دین نہیں ملے گا، چاہے تم میری بات سے اتفاق کرو یا نہ کرو، تم حدیث کی کتابوں کے ترجمے خرید کر، الماریوں میں رکھ دو، تمہارے اندر دین نہیں آئے گا، تم قرآن کریم کے ترجمے اور تفسیریں خرید کر گھر میں رکھ لو، اور کبھی ان کو پڑھ بھی لیا کرو، تب بھی تم میں دین نہ آئے گا، دین کا مرکز مساجد ہیں، جب تک تمہارا ان مساجد کے ساتھ رابطہ نہیں ہوگا، اس وقت تک تمہارے اندر دین نہیں آئے گا۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم
الحمدللہ وسلام علی عبادہ الذین اصطفی!

”عَنْ حَسَّانَ بْنِ عَطِیَّةَ اِنَّ اَبَا الدَّرْدَاءِ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ کَانَ یَقُوْلُ: لَا تَزَالُوْنَ بِخَیْرٍ مَا اَحْبَبْتُمْ خِیَارَکُمْ وَمَا قِیْلَ فِیْکُمْ بِالْحَقِّ فَعَرِفْتُمُوْہُ، فَاِنَّ عَارِفَ الْحَقِّ کَعَامِلِہٖ۔“

(حلیۃ الاولیاً ج:۱ ص:۲۱۰)

”عَنْ اَبِی الْھَیْثَمِ قَالَ: قَالَ اَبُو الدَّرْدَاءِ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ: لَا تُکَلِّفُوا النَّاسَ مَا لَمْ یُکَلَّفُوْا، وَلَا تُحَاسِبُوا النَّاسَ دُوْنَ رَبِّھِمْ، اِبْنَ اٰدَمَ! عَلَیْکَ نَفْسَکَ، فَاِنَّہٗ مَنْ تَتَبَّعَ مَا یَرٰی فِی النَّاسِ یُطِلُّ حُزْنَہٗ وَلَا یَشْفِ غَیْظَہٗ۔“

(حلیۃ الاولیاً ج:۱ ص:۲۱۱)

ترجمہ:......”امام ابونعیم نے حلیہ میں حسان بن عطیہؒ کے واسطے سے روایت کی ہے کہ: حضرت ابوالدرداُ رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے کہ: تم لوگ ہمیشہ خیر پر رہو گے جب تک اپنے اچھے لوگوں سے محبت کرتے رہو گے اور جب تک کہ تم میں حق

بات کہی جائے گی تو تم اس کو پہچانو گے، کیونکہ حق کا پہچاننے والا ایسا ہی ہے جیسا کہ اس پر عمل کرنے والا۔‘‘

ابونعیم نے حلیہ میں حضرت ابوالدرداؓ رضی اللہ عنہ سے دوسری روایت نقل کی ہے کہ:

ترجمہ:......’’ابو الهیثم رحمہ اللہ سے روایت ہے کہ حضرت ابوالدرداؓ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: لوگوں کو اس چیز کی زحمت نہ دو جس کے وہ مکلّف نہیں ہیں، اور لوگوں سے حساب نہ لو، ان کے رب کے سوا کوئی دوسرا حساب نہیں لیتا۔ آدم کے بیٹے! تو اپنی فکر کر، اس لئے کہ جو شخص جستجو کر رہا ہو اس چیز کی جس کو وہ لوگوں میں دیکھتا ہے، اس کا غم لمبا ہوگا اور اس کے غصہ کو کبھی شفا نہیں ہوگی۔‘‘

حضرت ابودرداءؓ پہلے حکیم الامت:

حضرت ابوالدرداؓ رضی اللہ عنہ کے بارے میں میں نے عرض کیا تھا کہ یہ وہ صحابی ہیں جن کو اس امت میں سب سے پہلے حکیم الامت کا لقب دیا گیا ہے، یہیں سے معلوم ہوجائے گا کہ صحابہ کرامؓ کے زمانہ میں جس شخص کو حکیم الامت کا لقب دیا جاتا ہے وہ کس درجہ کا آدمی ہوگا؟ دمشق میں رہائش اختیار کرلی تھی، نماز پڑھاتے تھے اور طالب علموں کو پڑھاتے تھے، حضرات محدثینؒ فرماتے ہیں کہ شاگردی تو بہت سے لوگوں نے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین سے کی، لیکن صحابہ کرامؓ میں دو آدمی بڑے خوش بخت تھے، اور انہوں نے اپنے شاگردوں پر اپنا خاص رنگ چھوڑا، ایک حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ، جو کوفہ کے معلّم اور قاضی تھے، اور ایک حضرت ابوالدرداؓ رضی اللہ عنہ۔

حضرت ابوالدرداءؓ کے اقوال حکمت:

عجیب وغریب حکمت کی باتیں فرمایا کرتے تھے، یہاں بھی ان کے دو چار جملے نقل کیے گئے ہیں:

پہلا جملہ یہ ہے کہ تم لوگ ہمیشہ خیر پر رہو گے جب تک تم میں یہ دو باتیں پائی جائیں گی:

ایک یہ کہ تم صرف اپنے اچھے لوگوں سے محبت کرو گے۔ یعنی اچھے لوگوں سے محبت اور برے لوگوں سے نفرت رہے گی۔

اور دوسری یہ کہ جب تک تمہارے معاشرے میں یہ بات باقی رہے کہ جس سے حق بات کہی جائے وہ اس کو قبول کرے اور سنے۔ اس لئے کہ کسی حق بات کو قبول کرلینا ایسا ہی ہے جیسا کہ اس پر عمل کرلینا۔ گویا کسی معاشرے کی بھلائی ناپنے کا میٹر یہ دو چیزیں ہیں۔ چنانچہ اگر کسی معاشرے کو پہچاننا ہو کہ یہ اچھا معاشرہ ہے یا برا؟ اس میں خیر غالب ہے یا شر؟ یا یہ کہ خیر کی طرف بڑھ رہا ہے یا شر کی طرف؟ تو اس معیار کے ذریعہ تم اُسے پہچان سکتے ہو۔

معاشرہ کی اچھائی کی پہلی علامت:

ایک یہ کہ لوگ اپنے اچھے لوگوں سے لوگ محبت کریں، اس معاشرہ میں اچھے لوگوں کی پذیرائی ہو اور ان کو قدر ومنزلت اور محبت کی نظر سے دیکھا جاتا ہو۔

دوسرے یہ کہ اس معاشرہ میں صحیح اور حق بات بتلانے والے موجود ہوں، اور جب حق بتلایا جائے تو لوگ اس کو قبول کرتے ہوں۔

اگر اس کے الٹ ہوجائے تو سمجھ لو کہ یہ معاشرہ خیر پر نہیں ہے۔

اچھے لوگوں سے الفت ومحبت فطری مناسبت کی علامت:

کیونکہ اچھے اور پسندیدہ لوگوں سے تعلق رکھنا، ان کو پسند کرنا، ان سے محبت

کرنا اس لئے خیر کی علامت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کے دلوں میں ایک فطرتی اور قدرتی مناسبت رکھی ہے، جب تک کہ دو شخصوں کے درمیان مناسبت نہ ہو، ان کے درمیان جوڑ پیدا نہیں ہوسکتا۔ یہ شادی کے رشتے بعض مرتبہ ناکام ہوجاتے ہیں، کیونکہ میاں بیوی کے درمیان جوڑ نہیں بیٹھتا، میاں جی کا منہ دوسری طرف ہے، بیگم جی کا منہ دوسری طرف ہے، دونوں کی سوچ متفق نہیں ہوتی، ایک اگر صحیح سوچتا ہے تو دوسرا اس صحیح کو بھی غلط سمجھتا ہے، اسی کو کہتے ہیں مناسبت، دو شخصوں کے درمیان مناسبت ہوگی تو ان کے درمیان الفت ہوگی۔

بیعت کے لئے مناسبت کی شرط ہے:

ہمارے حضرت حکیم الامت قدس سرہٗ سے جب کوئی بیعت کے لئے درخواست کرتا تو فرماتے: جس کے ساتھ مناسبت ہے اس سے بیعت کرلو، بغیر مناسبت کے پیری مریدی بھی نہیں چلتی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے کہ:

"اَلْاَرْوَاحُ جُنُوْدٌ مُّجَنَّدَۃٌ، فَمَا تَعَارَفَ مِنْھَا اِئْتَلَفَ، فَمَا تَنَاکَرَ مِنْھَا اِخْتَلَفَ۔" (صحیح مسلم ج:۲ ص:۳۳۱)

یعنی روحیں ایک لشکر ہے جو عالمِ ارواح میں جمع کیا گیا، جن کے درمیان وہاں تعلق ہوگیا ایک دوسرے کی طرف منہ اٹھایا، جان پہچان ہوگئی، ان کے درمیان الفت ہوگئی، اور جن کی وہاں ایک دوسرے سے پیٹھ رہی، ایک دوسرے سے پہچان نہ ہوئی تو ان کا یہاں اختلاف ہوگیا۔

نیک لوگوں کی طرف میلان نیکی کی علامت:

جب یہ بات معلوم ہوگئی تو اب سمجھئے کہ نیک لوگوں کے ساتھ آپ کی رغبت کا ہونا، آپ کی الفت ہونا، آپ کا ان کی طرف التفات ہونا، آپ کا ان کی طرف

جھکاؤ ہونا، ان کی طرف آپ کی کشش ہونا، اس بات کی علامت ہے کہ اللہ نے آپ کو نیک اور نیکی سے مناسبت عطا فرمائی ہے۔

اچھے لوگوں سے بغض نیکی سے نفرت کا نشان:

اور اگر نیک لوگوں کے ساتھ اختلاف ہے، ان سے نفرت ہے، ان سے بغض اور بُعد ہے، تو یہ اس بات کی علامت ہے کہ آپ کی طبیعت کو نیکی کے ساتھ مناسبت نہیں ہے، نیک لوگوں کے ساتھ مناسبت نہیں ہے۔ یہ ایک بیماری ہے جس کا علاج ہونا چاہئے۔

نیک لوگوں پر تنقید کرنا فسادِ مزاج کی نشانی ہے:

میرے بھائی! اللہ کے نیک بندوں پر تو تنقید کرتے ہو، لیکن اپنے آپ کو تو دیکھ لو، کہیں ایسا تو نہیں کہ تمہارے اندر بیماری ہو؟ جس کی وجہ سے تمہیں ساری فضا پیلی پیلی نظر آتی ہے، ممکن ہے تم نے چشمہ پیلا لگایا ہوا ہو؟ یا تمہیں پیلیا ہوگیا ہو؟ یہ تو ممکن نہیں کہ سارا عالم ہی پیلا ہوگیا۔ بھائی! فضا کا رنگ تو وہی ہے جو قدرتی رنگ ہے، اگر کسی کی نظر صحیح ہے تو فضا کے رنگ کو اس کے اصل رنگ میں دیکھے گا، اور جس کے مزاج میں تغیر پیدا ہوگیا وہ فضا کا رنگ بدلا ہوا دیکھے گا۔

دوسروں کو ہلاکت زدہ کہنے والا.....:

اسی بنا پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”اِذَا قَالَ الرَّجُلُ هَلَكَ النَّاسُ فَهُوَ اَهْلَكُهُمْ۔“ (صحیح مسلم ج:۲ ص:۳۲۹) یعنی جب کوئی شخص یہ کہے کہ لوگ ہلاک ہوگئے، لوگ ایسا کرتے ہیں، لوگ ایسا کرتے ہیں، یعنی اس کو لوگوں کا ہی حال نظر آتا ہے، پوری فضا اس کو خراب نظر آتی ہے، فرمایا کہ یہ سب سے زیادہ ہلاک ہونے والا ہے، ان سے بڑھ کر ہلاک ہونے والا ہے۔

نیک لوگوں سے کبیدگی کا مرض قابل علاج ہے:

تو اللہ تعالیٰ کے مقبول بندوں سے اگر مناسبت نہیں، بلکہ ایک قسم کی کبیدگی اور نفرت ہے، تو میں نے عرض کیا ہے کہ یہ مرض لائق علاج ہے، لائق علاج ضرور ہے لیکن لاعلاج نہیں۔ کاش کہ تم اپنی بیماری کو پہچانتے، بھائی! کسی سے صحیح تشخیص کرواؤ، اپنا آپریشن کراؤ، تو یہ بیماری دور ہوسکتی ہے۔

لاعلاج مرض؟

لیکن میرے بھائی! اگر تم اپنی بیماری کو تندرستی سمجھتے ہو تو پھر یہ بیماری لاعلاج ہوسکتی ہے۔

حالی یہ کہتے ہیں کہ کسی نے بقراط سے جاکر پوچھا:

مرض تیرے نزدیک مہلک ہیں کیا کیا؟

بقراط حکیم، کسی نے پوچھا کہ کون سی بیماریاں مہلک ہیں جس سے آدمی مر جاتا ہے؟ اس نے کہا کہ کوئی بیماری اللہ نے ایسی نہیں پیدا فرمائی جس کی دوا پیدا نہ کی گئی ہو، کوئی مرض مہلک نہیں:

مگر وہ مرض جس کو آسان سمجھیں، کہے جو طبیب اس کو ہذیان سمجھیں

یعنی جس بیماری کو آسان سمجھ لیا گیا، اور اگر کسی طبیب نے کہا کہ اس میں یہ بیماریاں ہیں، تو اس سے کہا کہ بکواس کرتا ہے، طبیب کے کہے کو ہذیان سمجھ لیا، تو یہ بیماری مہلک ہے۔

روحانی شفاخانہ سے ایکسرے کی ضرورت ہے:

کسی شفاخانہ میں اپنے ایکسرے کرواؤ، میں یہ نہیں کہہ رہا کہ یہ جو تمہارے ہاں ایکسرے کی مشینیں لگی ہوئی ہیں وہاں ایکسرے کراؤ! بلکہ کسی روحانی شفاخانہ میں جاکر ایکسرے کرواؤ، تمہیں اپنی اندر تصویر نظر آئے گی، تمہارے اندر کون سے انسانی

اخلاق ہیں؟ کون سے درندوں والے اخلاق ہیں؟ کون سے بہائم یعنی جانوروں والے اخلاق ہیں؟ کون سے حشرات الارض والے اخلاق ہیں؟ کون سے ایمانی اخلاق ہیں؟ کون سے کافروں والے اخلاق ہیں؟ کون سے رحمانی اخلاق ہیں؟ اور کون سے شیطانی اخلاق ہیں؟ اس مشین کے سامنے اپنے آپ کو پیش کروگے تو تمہیں اپنی اندرونی کیفیت معلوم ہوگی۔

بہرکیف! کہنا یہ ہے کہ اللہ کے نیک بندوں یا اچھے لوگوں سے محبت کرنا اور ان کی طرف کشش ہونا، آدمی کے خیر پر ہونے کی علامت ہے اور بروں کی طرف کشش ہونا، ان سے رغبت ہونا، یہ علامت ہے اس بات کی کہ یہ دوسرے راستہ کی طرف بڑھ رہا ہے، خدا نہ کرے کہ یہ بیماری پختہ ہوجائے اور پھر لاعلاج بن جائے۔

نیک لوگوں سے الفت ابرار کے ساتھ حشر کی علامت:

دیکھو ایک بات کہتا ہوں! قرآن کریم میں بھی جگہ جگہ فرمایا گیا ہے کہ: ”وَتَوَفَّنَا مَعَ الْاَبْرَارِ۔ وَاَلْحِقْنَا بِالصّٰلِحِیْنَ“ دنیا میں ہر آدمی یہ چاہتا ہے کہ قیامت کے دن اس کا حشر اچھے لوگوں کے ساتھ ہو، کیا کوئی یہ چاہے گا کہ اس کا حشر ڈاکوؤں کے ساتھ ہو؟ یعنی جس لائن میں ڈاکوؤں کو کھڑا کیا گیا ہے، مجھے بھی اسی لائن میں کھڑا کیا جائے؟ کوئی چاہے گا کہ زانی و بدمعاشوں کے ساتھ اس کا حشر ہو؟ کوئی نہیں چاہے گا! کیا کوئی چاہے گا کہ جھوٹوں کے ساتھ اس کا حشر ہو؟ ہم میں سے ہر شخص کی خواہش ہے کہ ہمارا حشر انبیأ کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کے ساتھ، صدیقین کے ساتھ، شہدأ کے ساتھ، اولیأ اللہ کے ساتھ، اللہ کے نیک اور مقبول بندوں کے ساتھ ہو، ہر شخص یہی چاہتا ہے ناں! کوئی صحیح المزاج آدمی ایسا نہیں ہوگا جو یہ کہے کہ میرا حشر کافروں، منافقوں، فاسقوں اور فاجروں کے ساتھ ہو، بلکہ یہ کہے گا کہ نبیوں کے ساتھ ہو، صدیقوں کے ساتھ ہو شہیدوں کے ساتھ ہو، اولیأ کے ساتھ ہو، اس کے لئے

ایک ضابطہ اور اصول سن لو! کہ تم جیسی روش دنیا میں اختیار کروگے حشر بھی ویسے ہی ہوگا، بس یہی فقرہ بتلانا چاہتا ہوں، اب تم خود فیصلہ کرسکوگے کہ میرا حشر قیامت کے دن کس کے ساتھ ہونے والا ہے؟ تمہیں اگر برے لوگوں سے رغبت ہے، برے لوگوں کو اچھا سمجھتے ہو، برے لوگوں کی صحبت میں بیٹھتے ہو، تو پھر ان کے ساتھ حشر ہوگا، اور اگر اچھے لوگوں کے ساتھ رغبت رکھتے ہو، اچھے لوگوں سے پیار رکھتے ہو، اگرچہ خود اچھے نہیں، لیکن اچھے لوگوں سے پیار تو ہے، گو عمل نہیں مگر اچھے لوگ ہمیں اچھے تو لگتے ہیں، اگر یہ چیز موجود ہے تو انشاءاللہ! انشاءاللہ! انشاءاللہ! اچھوں ہی کے ساتھ اللہ تعالیٰ حشر فرمائیں گے، اللہ تعالیٰ ہمارا حشر اچھے بھی لوگوں کے ساتھ فرمائے، وَتَوَفَّنَا مَعَ الْاَبْرَارِ!

اچھے معاشرہ کی دوسری علامت: حق کہنا اور قبول کرنا:

دوسری بات یہ کہ وہ معاشرہ جس میں حق بات کہی جائے اور اس کو قبول کیا جائے۔ دنیا میں اچھی باتیں بھی ہوتی ہیں، بری باتیں بھی ہوتی ہیں، پھر صحیح بھی ہوتی ہیں، غلط بھی ہوتی ہیں، حق بھی ہے، باطل بھی ہے، اس عالم کا مزاج ہی اللہ تعالیٰ نے ایسا بنایا ہے، بہت سے لوگ پوچھتے رہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ یہ کیوں نہیں کرتے؟ اللہ تعالیٰ وہ کیوں نہیں کرتے؟ اللہ تعالیٰ نے ظالموں کو اتنی ڈھیل کیوں دے رکھی ہے؟ یہ کیوں کر رکھا ہے؟ وہ کیوں کر رکھا ہے؟ میں نے کہا کہ بھائی! اللہ تعالیٰ نے خدائی تمہارے سپرد نہیں کی بلکہ اپنے پاس رکھی ہے، اور اس کو مشورہ کی بھی ضرورت نہیں کہ تم اس کو مشورہ دو کہ ایسا کرنا چاہئے، بس وہ جانتا ہے، تم تو اپنا کام کرو، اللہ کو مشورے نہ دو، تم سے بندگی نہیں نبھتی، خدائی کیا نبھاؤگے؟ تمہیں بندہ بنایا ہے، تم سے آدابِ بندگی نہیں بجالائے جاتے، تو خدائی کو کیا سمجھوگے؟ خدائی معاملات میں کیا مشورہ دوگے؟ یہ تو تم رہنے دو کہ اللہ تعالیٰ نے حق کے ساتھ باطل کو کیوں پیدا کیا؟ آدم کے ساتھ

شیطان کو کیوں لگایا؟ یہ کیوں کیا؟ وہ کیوں کیا؟ ظالموں کو کیوں ڈھیل دی؟ ان باتوں کو تم چھوڑ دو، یہ خدائی معاملات ہیں تمہاری اور میری عقل میں آنے والے نہیں ہیں۔

حافظ شیرازیؒ کو کسی نے مشورہ دیا تھا، تو حافظ شیرازیؒ نے کہا:

حدیث مطرب و لہو و را زدہر کم ترجو
کہ کس نہ کشیود وکشاید بحکمت این معما را

یعنی کوئی شخص حکمت و دانائی کے ساتھ اس معما کو نہ حل کرسکا اور نہ کرسکے گا، یہ بندوں کے حل کرنے کی چیز ہی نہیں ہے، ان سے یہ معما حل ہو ہی نہیں سکتا۔

حق بات کہنا اور اس کا قبول کیا جانا غلبۂ حق کی علامت:

اللہ تعالیٰ نے حق و باطل کو پیدا کیا ہے، لیکن کبھی تو غلبہ ہوتا ہے حق کا، اور اس غلبہ کی علامت یہ ہے کہ جو لوگ حق پر نہیں ہوتے وہ بھی شرمندہ ہوتے ہیں، جیسا کہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے زمانہ میں حق کا غلبہ تھا، صحابہ کرامؓ کے زمانے میں اگر کسی سے کوئی غلطی ہوتی تھی تو وہ شرمندہ ہوتا تھا، جانتا تھا کہ میں غلطی پر ہوں، بعد میں رفتہ رفتہ حق مغلوب ہوتا چلا گیا، اور باطل بھی اسی رفتار سے بڑھتا رہا، پھیلتا رہا، پھولتا رہا، حق اور باطل دونوں کی لڑائی ہے، میدان ایک کے ہاتھ میں ہوگا یا دوسرے کے ہاتھ میں ہوگا، کبھی ایسا بھی ہوسکتا ہے کہ دونوں برابر رہیں، تو جس معاشرہ میں حق بات کہنے کی جرأت کی جائے۔ کہنے والے کہیں اور سننے والے سن لیں، اگرچہ عمل کی توفیق نہ ہوئی لیکن کم از کم سننے کی توفیق تو ہوگئی، یہ علامت ہے غلبہ حق کی کہ حق غالب ہے باطل پر۔

حق کہنے اور قبولیت میں دشواری غلبۂ باطل کی علامت:

جب زمانہ میں حق کہنا دشوار ہوجائے، مصلحت پسندی کی وجہ سے حق نہ کہا جاسکتا ہو یا اس خیال سے کہ اگر حق بات کہیں گے تو لوگوں کی عقل میں نہیں آئے گی

بلکہ اور زیادہ بگڑیں گے۔

جیسا کہ ہمارے حضرت حکیم الامت رحمہ اللہ فرماتے تھے کہ ''لوگوں کو گناہگار اور فاسق رہنے دو، ان کو کافر مت بناؤ۔'' بڑی حکیمانہ بات ہے، اس لئے کہ ایک آدمی گناہ کر رہا ہے، تو وہ گناہگار ہے اور فاسق ہے، اگر آپ نے اس کو ٹوکا اور اس نے اس کا انکار ہی کر دیا کہ جاؤ میاں اپنا کام کرو، لئے پھر رہا ہے اپنی شریعت! بتلایئے یہ مسلمان رہا کہ کافر ہوگیا؟ آپ ہی بتائیں کہ جب ٹوکنے پر اس نے یہ کہہ دیا کہ لے جائیں اپنی شریعت کو (نعوذ باللہ!)۔ تو حضرت فرماتے ہیں کہ لوگوں کو گناہگار ہی رہنے دو، ان کو کافر مت بناؤ، کیونکہ حق کہنے کے لئے ایک شرط یہ بھی ہے کہ دیکھو یہ قبول بھی کیا جائے گا کہ نہیں؟ آپ نے حق بات تو کہہ دی لیکن اس کا الٹا اثر ہوا، پہلے وہ چھپ کر کرتا تھا اب دھڑلے سے کرے گا، پہلے وہ کم سے کم دل میں تھوڑی بہت ندامت محسوس کرتا تھا، اب وہ ندامت کا پردہ بھی اٹھالیا گیا، نعوذ باللہ! اللہ کی پناہ! جب کسی معاشرہ میں یہ کیفیت ہوجائے کہ حق کہنے والا سو بار سوچے کہ میں کہوں بھی کہ نہ کہوں؟ اور اگر وہ کہہ بھی دے تو قبول نہ کیا جائے، بلکہ سو تاویلیں کی جائیں کم سے کم یہی کہہ دے کہ جا میاں اپنا کام کر تم جیسے بہت سے مولوی بھی دیکھے ہیں، کیونکہ یہ تو چلتا پھرتا فقرہ ہے ناں!، بھائی! تم نے میرے جیسے مولوی دیکھ لئے، ورنہ ان بے چارے علمأ حقہ کا قصور کیا ہے؟ بات تو تمہاری میرے ساتھ ہو رہی ہے، میرے بھائی! تمہارا مجرم اور قصوروار تو میں ہوں، میرے جیسے مولویوں کو کیوں برا کہتے ہو؟ لہٰذا ''تمہارے جیسا مولوی دیکھا ہے'' کہنا اس بات کی علامت ہے کہ اس معاشرہ میں حق مغلوب ہے اور باطل غالب ہے، اللہ کی پناہ!

تو اس امت کے پہلے حکیم الامت حضرت ابوالدردأ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں تم لوگ خیر پر رہو گے جب تک یہ حالت رہی کہ تم میں حق کہا جائے اور اس کو قبول بھی کیا جائے، تو جب یہ کیفیت پیدا ہوجائے کہ کوئی حق کہنے کی جرأت ہی نہ کرے

اور اگر کوئی جرأت کر بھی لے تو قبول نہ کیا جائے، اور خاموشی و مصلحت پسندی کو حق کہنے پر ترجیح دی جائے، تو یہ اس بات کی علامت ہے کہ معاشرہ کی چولیں ہل گئیں، حق پر نہیں رہا، باطل کا سیلاب اس کشتی میں اتنا داخل ہوگیا ہے کہ وہ قریب ڈوبنا چاہتی ہے، اللہ تعالیٰ حفاظت میں رکھے، اللہ تعالیٰ پناہ میں رکھے۔

نئ نسل کا کیا بنے گا؟

حافظؒ کہتے ہیں:

مشکل دارم زدانائے محفل باز پرس

مجھ کو ایک مشکل درپیش ہے، کسی دانائے محفل سے پوچھنی چاہئے، اور آپ ہی ماشاءُاللہ دانائے محفل ہیں، آپ سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ معاشرہ میں کتنے لوگ ہیں جو مسجد میں آتے ہیں؟ خاص طور سے بیچاری نئ نسل! کہ ان کی تو شب و روز کی محفل اور شب و روز کی مصاحبت، ان کا اٹھنا بیٹھنا، کافروں، بے ایمانوں، بروں، چوروں اور بدمعاشوں کے ساتھ ہی ہے، دین، دینداری بلکہ ظاہری دینداری کا ماحول بھی اب ہماری مسجدوں میں سمٹ کر رہ گیا ہے۔ اور ان بیچاروں کو تو یہاں آنے کا کبھی موقع بھی نہیں ملتا، مجھے سمجھاؤ کہ ان بیچاروں کا، نئ نسل کا کیا حال بنے گا؟ تمہارے بچے نماز کے وقت میں ٹی وی کے سامنے بیٹھے ہوئے ہیں، حتیٰ کہ ہفتہ میں ایک دن جمعہ کی بھی توفیق نہیں ہوتی، مجھے بتلاؤ دینداری کہاں سے آئے گی؟ ایمان کس راستے سے داخل ہوگا؟ مجھے آج کل یہ مشکل درپیش ہے، میں اس کے لئے پریشان ہوں، اس امت کا کیا علاج کیا جائے؟ اور ان کو اپنے دین پر کیسے واپس لایا جائے؟ درندے اس کو نوچ رہے ہیں، بھیڑیئے اس کو اٹھا رہے ہیں، ہزار ہا فتنے اس امت کے افراد کو دبوچنے کے لئے موجود ہیں، کیا علاج کیا جائے اس کا؟ میری عقل میں یہ بات نہیں آرہی ہے، اللہ تعالیٰ توفیق عطا فرمائے۔

دین کتابوں سے نہیں مسجد کے رابطہ سے آئے گا:

میری بات یاد رکھو! کتابوں سے تمہیں دین نہیں ملے گا، چاہے تم میری بات سے اتفاق کرو یا نہ کرو، تم حدیث کی کتابوں کے ترجمے خرید کر، الماریوں میں رکھ دو، تمہارے اندر دین نہیں آئے گا، تم قرآن کریم کے ترجمے اور تفسیریں خرید کر گھر میں رکھ لو، اور کبھی ان کو پڑھ بھی لیا کرو، تب بھی تم میں دین نہ آئے گا، دین کا مرکز مساجد ہیں، جب تک تمہارا ان مساجد کے ساتھ رابطہ نہیں ہوگا، اس وقت تک تمہارے اندر دین نہیں آئے گا۔

ایمان، ایمان کی دکان سے ملے گا:

جس طرح کوئلوں کی دکان سے خوشبو نہیں ملا کرتی، لوہار کی دکان سے سونا نہیں ملا کرتا، بلکہ خوشبو عطر فروش اور سونا سنار سے ملتا ہے، اسی طرح ایمان، ایمان کی دکان سے ملے گا اور ایمان کی دکان یہ مسجدیں ہیں، اگر تمہیں ایمان کی ضرورت ہے تو واللہ العظیم! تم میں سے ایک ایک کو ان مساجد سے ربط پیدا کرنا پڑے گا، ورنہ تمہیں چاہے کتنا ہی یہ خیال کیوں نہ ہو کہ ہم دیندار ہیں، اور ہم نے دین کو سمجھا ہے، ہمارے اندر دین موجود ہے، ہم نماز بھی پڑھ لیتے ہیں، مگر معاف کیجئے گا! یہ دین نہیں ہے، تم نے دین کو سمجھا ہی نہیں۔

لوگوں کو ان کی حیثیت سے زیادہ تکلیف نہ دو:

دوسرا ارشاد: حضرت ابوالدرداءؓ رضی اللہ عنہ کے دوسرے ارشاد میں تین فقرے ہیں:

”ایک یہ کہ لوگوں کو ان کی حیثیت سے زیادہ تکلیف نہ دو۔“

مولانا رومیؒ نے بھی یہ نصیحت فرمائی ہے کہ:

چہار پایہ قدر ہمت بارنیم

یعنی چوپائے پر اس کی طاقت کے مطابق بوجھ رکھا کرو، جو کمزور آدمی زیادہ بوجھ نہیں اٹھا سکتا، اس پر زیادہ بوجھ نہ ڈالو، اور جن لوگوں کا دماغ اونچی باتوں کو سمجھ نہیں سکتا، اپنے علوم اپنے پاس ہی رکھو، ان کے سامنے بیان نہ کیا کرو، لہٰذا علم اور عمل کے اعتبار سے بھی، لوگوں کی استعداد اور ہمت کو دیکھو، اس کے مطابق ان پر بوجھ ڈالو۔

پہلے اپنی فکر کرو:

دوسرا فقرہ اسی ارشاد کا یہ ہے کہ تم لوگوں کے محاسب بنا کر نہیں بھیجے گئے۔ لہٰذا وعظ و نصیحت کرنا، کسی کی خیرخواہی کے لئے اس کو کوئی بات بتلانا یا اگر اس کے اندر غلطی ہے تو اس کی اصلاح کرنا یہ تو ایمانی تقاضا ہے، لیکن میرا حساب میرا رب لے گا، تمہارا حساب تمہارا رب لے گا، تمام انسانوں کا حساب اللہ تعالیٰ لیں گے، ہم میں سے ایک کو دوسرے کا محاسب بنا کر نہیں بھیجا گیا۔ جیسا کہ ارشاد الٰہی ہے: ”وَمَا اَنْتَ عَلَيْهِمْ بِوَكِيلٍ، وَمَا اَنْتَ عَلَيْهِمْ بِجَبَّارٍ۔“ قرآن کریم میں بار بار فرمایا گیا ہے کہ جتنا تم سے ہوسکتا ہے تم اپنا حقِ خیرخواہی ادا کرو، لیکن قیامت کے دن تم کو اپنے اعمال کا حساب دینا ہے، لوگوں کے اعمال کا حساب نہیں دینا، قبر میں اور حشر میں مجھ سے میرے اعمال کے بارے میں پوچھا جائے گا، مجھ سے آپ کے اعمال کے بارے میں نہیں پوچھا جائے گا، اسی طرح آپ سے آپ کے اعمال کے بارے میں پوچھا جائے گا، زید و عمرو کے عمل کے بارے میں نہیں پوچھا جائے گا، تو اللہ تعالیٰ نے لوگوں کا حساب اپنے پاس رکھا ہے، حساب و کتاب کی محاسب صرف اللہ تعالیٰ کی ذات ہے، تم لوگوں کے محاسب نہیں ہو، اس لئے حضرت ابوالدرداءؓ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ”اِبْنَ آدَمَ! عَلَيْكَ نَفْسَكَ۔“ آدم کے بیٹے! اپنی فکر کر اور اپنی فکر کرنے کا مطلب یہ ہے کہ دوسروں کی فکر میں بعد میں پڑو، پہلے اپنی فکر کرو۔

دنیا والوں کا اصول:

جبکہ ہمارے یہاں یہ اصول بنالیا گیا ہے کہ ایک مجھ کو چھوڑ دو، باقی ساری دنیا کی اصلاح ہونی چاہئے، اور میری اصلاح نہیں ہونی چاہئے، گویا دور جدید کا نظریہ یہ ہے کہ ساری دنیا کو ٹھیک ہونا چاہئے لیکن مجھے کوئی کچھ نہ کہے۔

شریعت کا اصول:

اور ہمارا نظریہ اس کے الٹ ہونا چاہئے کہ میری اصلاح ہونی چاہئے، دنیا کی اصلاح ہوتی ہے ہو، نہیں ہوتی نہ ہو، اللہ ان سے خود حساب لے گا، مجھے خود ٹھیک ہونا چاہئے، ہم لوگ اپنی اصلاح سے غافل ہوکر دوسروں کی اصلاح کی فکر میں لگے ہوئے ہیں، حضرت ابوالدرداءؓ اس کو فرماتے ہیں کہ اپنے نفس کی فکر کرو۔

ایک غلط فہمی کا ازالہ:

اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ تمہارے سامنے اگر گناہ ہوتا ہے تو ہونے دو، اس کا غلط مطلب نہ لو، آج کل لوگوں نے اس کا غلط مطلب لیا ہوا ہے کہ اپنی فکر کرو، جب کسی کو کہا جائے کہ بھائی! یہ کام نہیں کرنا چاہئے، تو کہتے ہیں کہ تم اپنا کام کرو جی! ناں بھائی! اگر آپ کے بدن پر خدانخواستہ کوئی زخم ہے، اس کی مرہم پٹی کرنا بھی میرے ذمہ ہے، اگر خدانخواستہ ہمارے کسی بھائی کو سانپ نے کاٹ لیا ہے تو اس کا علاج معالجہ بھی ہمارے ذمہ ہے۔

لیکن اگر کوئی شخص ایسے کسی آدمی کی خیرخواہی کے لئے اس کا علاج و معالجہ کرنا چاہتا ہے، اور وہ اس کو کہہ دے کہ میاں تم اپنی فکر کرو، مجھے رہنے دو، تو یہ عقل کی نہیں بے عقلی کی بات ہے، اسی طرح اگر کوئی کہیں گر گیا اور اسے چوٹ لگ گئی اور کوئی مسلمان، اس کی مرہم پٹی کی فکر میں ڈاکٹر کو بلاتا ہے، اور یہ اس سے کہتا ہے کہ میاں! تم اپنا کام کرو، مجھے رہنے دو، یہ بات درست نہیں۔

مسلمان کے حقوق کے بارہ میں سوال ہوگا:

کیونکہ اپنے بھائی کی خیرخواہی، جہاں تک ممکن ہو بھی ضروری ہے، اس لئے کہ یہ بھی ہماری ذمہ داری ہے اور اس کے بارہ میں پوچھا جائے گا، جیسا کہ حدیث قدسی میں ہے:

”اِنَّ اللّٰہَ تَعَالٰی یَقُوْلُ یَوْمَ الْقِیَامَۃِ: یَابْنَ اٰدَمَ مَرِضْتُ فَلَمْ تَعُدْنِیْ؟ قَالَ: یَا رَبِّ! کَیْفَ اَعُوْدُکَ وَاَنْتَ رَبُّ الْعَالَمِیْنَ؟ ..... اَمَا عَلِمْتَ اِنَّ عَبْدِیْ فُلَانًا مَرِضَ فَلَمْ تَعُدْہُ ..... یَا ابْنَ اٰدَمَ اِسْتَطْعَمْتُکَ فَلَمْ تُطْعِمْنِیْ ..... یَابْنَ اٰدَمَ اِسْتَسْقَیْتُکَ فَلَمْ تَسْقِنِیْ؟ قَالَ: یَا رَبِّ! کَیْفَ اَسْقِیْکَ وَاَنْتَ رَبُّ الْعَالَمِیْنَ؟ ..... الخ۔“

(مشکوٰۃ ص:۱۳۳، ۱۳۴)

یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ فرمائیں گے: اے ابن آدم! میں بیمار تھا، تو نے میری عیادت نہیں کی..... ابن آدم! میں نے کھانا مانگا تھا تو نے مجھے کھانا نہیں دیا...... اے ابن آدم میں پیاسا تھا تو نے مجھے پانی نہیں پلایا...... اور ابن آدم کہے گا کہ: یا اللہ! آپ تو بیماری، کھانے پینے سے پاک ہیں، ان چیزوں کی آپ کو کیا ضرورت ہے؟ فرمائیں گے کہ: میرا فلاں بندہ بیمار تھا تو نے اس کی عیادت نہیں کی، فلاں بھوکا تھا، تو نے اس کو کھانا نہیں کھلایا، فلاں پیاسا تھا تو نے اس کو پانی نہیں پلایا۔

تو یہ بھی ہماری ذمہ داری ہوگئی ناں بھائی! اس لئے یہ بات بھی غلط ہے کہ آدمی دوسرے کی فکر ہی نہ کرے، اور یہ بات بھی غلط ہے کہ آدمی صرف دوسروں ہی کی فکر کرے اور اپنی فکر نہ کرے۔

مسئولیت عنداللہ کا مراقبہ:

سب سے پہلی چیز یہ ہے کہ مجھے اپنی ذات کی فکر ہونی چاہئے، میرا معاملہ اللہ کے سامنے پیش ہوگا، میرا اللہ میرے ساتھ کیا کرے گا؟ یہ مراقبہ ہمہ تن رہنا چاہئے۔ اور پھر اسی کے ساتھ ساتھ یہ بھی سوچنا چاہئے کہ جن چیزوں کی ذمہ داری اللہ نے مجھ پر ڈالی ہے، قیامت کے دن مجھ سے اس کا سوال بھی ہوگا، انشاءاللہ اس مراقبہ سے ان ذمہ داریوں کو نبھانے کا احساس پیدا ہوجائے گا۔ لہٰذا جب کسی کو کوئی خیر کی بات بتلائی جائے یا کسی برائی سے روکا جائے، تو اس کا یہ کہنا کہ تم اپنی فکر کرو، مجھے چھوڑ دو، یہ بھی غلط بات ہے، بھائی تمہارے ساتھ خیر خواہی کا تقاضا یہ ہے کہ ہم تمہیں اس غلطی سے نکالیں، اور دشمنوں کے چنگل میں تجھے نہ چھوڑیں۔

لوگوں کے عیوب کا تتبع مشکلات کا سبب بنے گا:

پھر فرماتے ہیں کہ: ’’لوگوں کے اندر جو باتیں پائی جاتی ہیں، اگر ان کا تتبع کروگے اور ان کو تلاش کروگے تو تم بڑی مشکل میں پھنس جاؤگے۔‘‘ اس لئے ظاہر میں جو بات قابل اصلاح نظر آجائے، اس کی تو اصلاح کرلو، باقی کھود کرید کرنا صحیح نہیں، اس لئے کہ جو شخص لوگوں کے عیوب کا تتبع کرے گا، یعنی ان کو کریدنے، ڈھونڈنے کی کوشش کرے گا، ’’يُطِلُّ حُزْنُهٗ‘‘ اس کا غم بہت لمبا ہوجائے گا کہ کیا کریں؟ اور کیا نہ کریں؟ جیسا کہ ایک شاعر نے کہا ہے کہ:

تنم داغ داغ شد
پنبہ کجا کجا نہم

بدن کے روئیں روئیں پر زخم لگے ہوئے ہیں، کہاں کہاں پنبہ رکھوں؟ کہاں کہاں مرہم رکھوں؟ اگر ساری دنیا کی فکر میں مبتلا ہوجاؤگے تو پھر بڑی مشکل پیش آجائے گی، اس لئے جو بات سامنے آجائے اس کو تو کہہ دو، باقی زیادہ کاوش نہ

کرو، جو شخص لوگوں کے عیوب تلاش کرے گا چاہے اصلاح کی فکر سے کیوں نہ ہو، اس کا غم لمبا ہو جائے گا، اور اس کے دل کو کبھی شفا نہیں ہوگی، ہمیشہ پریشان ہی پریشان رہے گا۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

خواجہ معین الدین چشتیؒ

خواجہ معین الدین چشتی رحمہ اللہ کا اسم گرامی ''حسن'' ہے اور والد ماجد کا نام غیاث الدین بتاتے ہیں، ایران کا ایک علاقہ ہے ''سیستان'' حضرت خواجہ صاحب اس علاقے کے رہنے والے تھے، اس پر تمام اہل تاریخ متفق ہیں کہ ان کی ولادت شریفہ ۵۳۷ھ میں ہوئی یعنی چھٹی صدی میں، یہی زمانہ شاہ عبدالقادر جیلانی رحمہ اللہ کا ہے، یہ دونوں ایک ہی زمانے کے بزرگ ہیں، خواجہ معین الدین چشتی رحمہ اللہ طبقے کے اعتبار سے ان سے چھوٹے ہیں، لیکن یہی چھٹی صدی اُن کا زمانہ بھی ہے اور یہی چھٹی صدی اِن کا بھی زمانہ ہے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم
الحمد للہ وسلام علی عبادہ الذین اصطفیٰ!

”اَلَا اِنَّ اَوْلِیَآءَ اللّٰہِ لَا خَوْفٌ عَلَیْھِمْ وَلَا ھُمْ یَحْزَنُوْنَ۔ اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَکَانُوْا یَتَّقُوْنَ۔ لَھُمُ الْبُشْرٰی فِی الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا وَفِی الْاٰخِرَۃِ لَا تَبْدِیْلَ لِکَلِمَاتِ اللّٰہِ ذٰلِکَ ھُوَ الْفَوْزُ الْعَظِیْمُ۔“ (یونس:۶۲ تا ۶۴)

ابھی گزشتہ دنوں مجھے ایک صاحب نے پرچہ دیا تھا کہ آپ نے چار بزرگوں کے حالات ذکر کرنے کا وعدہ کیا تھا، ان میں سے دو کا ذکر کیا، پھر آپ بھول ہی گئے۔

سلاسل اربعہ:

تو آج انہی سلسلوں کے بارے میں کچھ عرض کرنے کا ارادہ ہے۔ مشہور سلسلے بزرگوں کے چار ہیں، ان کے علاوہ بھی اولیاءُ اللہ کے سلسلے ہیں، لیکن چار سلسلوں کو اللہ تعالیٰ نے بہت مقبولیت عطا فرمائی ہے، ان میں سے ایک سلسلہ حضرت شاہ عبدالقادر جیلانی پیرانِ پیر رحمہ اللہ کی طرف منسوب ہے، جس کو ”سلسلۂ قادریہ“ کہتے ہیں، ان کے حالات کا مختصر تذکرہ ہوا تھا۔

اس کے بعد دوسرا سلسلہ ہے شیخ شہاب الدین سہروردی رحمہ اللہ کا جو ''سلسلۂ سہروردی'' سے مشہور ہے۔

میں نے بتایا تھا کہ یہ حضرت شاہ عبدالقادر جیلانی رحمہ اللہ کے مریدین میں سے ہیں، لیکن ان کا سلسلہ کسی دوسرے بزرگ سے ہے، اور جو کتاب میں پڑھ کر سنایا کرتا تھا، وہ انہیں کی کتاب ہے، ان کے تذکرے میں ان کے چند افادات کا ذکر آ گیا تھا، وہ آج میں درمیان میں چھوڑ رہا ہوں، اس سلسلے کو ختم کرنے کے لئے درمیان میں چھوڑ رہا ہوں، تصوف پر ان کی کتاب ہے جو میں سناتا تھا، اور اس کتاب کے بارے میں بزرگوں کا کہنا یہ ہے کہ جس شخص کا کوئی مرشد نہ ہو، اس کے لئے یہ کتاب کافی مرشد ہے۔

خواجہ معین الدین چشتیؒ کی دو امتیاز:

آج میں تیسرے بزرگ خواجہ معین الدین چشتی رحمہ اللہ کا سلسلہ شروع کرتا ہوں، ان کی دو خصوصیتیں ہیں، ایک تو یہ کہ ان کا تعلق سرزمین ہند سے ہے، یعنی ہندوستان کی سرزمین سے، ان کے شیخ نے ولایت ہند ان کے سپرد کی تھی، اس لئے بعض لوگوں نے بطورِ مبالغہ ان کو ''نبی الہند'' کا خطاب دیا ہے، یعنی ہندوستان کا نبی، حالانکہ یہ نبی تو نہیں تھے، نبیوں کی شان تو بہت اونچی ہے۔

اور ان کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ ہمارا سلسلہ انہی کے واسطے سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچتا ہے، تو یہ خواجہ معین الدین چشتی رحمہ اللہ ہمارے پیرانِ پیر ہیں، اس لئے ان کا ذکر کرتا ہوں، لیکن مجھے افسوس ہے کہ اتنے بڑے بزرگ، مگر ان کے حالات نہیں ملتے، اب تو دو پیسے کا آدمی ہوتا ہے اور اس کی سوانح عمری پر لوگ ہزار ہزار صفحات لکھ دیتے ہیں، یہ زمانہ لکھائی پڑھائی کا زمانہ ہے، ایک بالشت قد

ہے، صرف ایک بالشت، لیکن اس کی سوانح عمری لکھی جاتی ہے کہ یہاں پیدا ہوا، یہ ہوا، وہ ہوا، لیکن ہمارے یہ اکابرؒ جن کے ذریعہ سے دین زندہ ہوا، امت زندہ ہوئی، ان کے حالات بہت کم ملتے ہیں، کہیں جستہ جستہ کسی نے کوئی تھوڑے بہت لکھ دیئے۔

آپ کے شیخ اور خلفاءؒ:

اتنی بات ہے کہ ان کے شیخ ہیں خواجہ محمد عثمان ہارونی، اور حضرت خواجہ معین الدین چشتی رحمہ اللہ کے خلفاءؒ کی تعداد ایک ہزار سے زیادہ تھی، جن میں خواجہ بختیار کاکی رحمہ اللہ مشہور ہیں، اور خواجہ بختیار کاکی رحمہ اللہ کے خلیفہ ہیں حضرت گنج شکر رحمہ اللہ پاک پتن والے۔

پھر ان کے دو خلیفہ مشہور ہوئے، ایک سلطان الہند خواجہ نظام الدین اولیاءؒ رحمہ اللہ، ان کو واقعتاً ''سلطان الہند'' کہا جاتا ہے۔

اور دوسرے خواجہ نصیر الدین محمود چراغ دہلوی رحمہ اللہ، بہرحال یہ بزرگوں کا بہت اونچا سلسلہ تھا۔

تعارف:

خواجہ معین الدین چشتی رحمہ اللہ کا اسم گرامی ''حسن'' ہے اور والد ماجد کا نام غیاث الدین بتاتے ہیں، ایران کا ایک علاقہ ہے ''سیستان'' حضرت خواجہ صاحب اس علاقے کے رہنے والے تھے، اس سیستان کی طرف نسبت کرکے عربی میں اس کو ''سجزی'' کہتے ہیں، اور بعض لوگ اس کو ''سنجری'' پڑھتے ہیں، حسن سنجری یا حسن سجزی اصل میں حسن سجزی ہے، سین کی زبر، جیم کے سکون اور زا کے کسرہ کے ساتھ۔

ولادت:

اس پر تمام اہل تاریخ متفق ہیں کہ ان کی ولادت شریفہ ۵۳۷ھ میں ہوئی یعنی چھٹی صدی میں، اور میں بتا چکا ہوں کہ یہی زمانہ شاہ عبدالقادر جیلانی رحمہ اللہ کا

ہے، یہ دونوں ایک ہی زمانے کے بزرگ ہیں، خواجہ معین الدین چشتی رحمہ اللہ طبقے کے اعتبار سے ان سے چھوٹے ہیں، لیکن یہی چھٹی صدی اُن کا زمانہ بھی ہے اور یہی چھٹی صدی اِن کا بھی زمانہ ہے۔

اللہ کی حکمت بالغہ:

حضرت مولانا ابوالحسن علی ندوی رحمہ اللہ نے ایک بڑی عجیب بات لکھی ہے کہ یہ پانچویں اور چھٹی صدی کا زمانہ، اگر تاریخ کو دیکھا جائے تو بادشاہوں کی لڑائی کا اور دنیاداروں کے دنیا پر ٹوٹ پڑنے کا زمانہ ہے، صحابہ کرامؓ اور تابعینؒ کا دور گزر چکا تھا، ائمہ دین کا دور گزر چکا تھا، اور لوگ بے تحاشا دنیا پر ٹوٹنے لگے تھے، اللہ تعالیٰ کی حکمت بالغہ عجیب تھی کہ اس زمانے میں اس قسم کے اکابر اولیأ اللہ کو اللہ تعالیٰ نے کھڑا کیا اور انہوں نے امت کا رخ بدل دیا۔

دین کے لئے نئے پودے:

ابن ماجہ میں ایک حدیث ہے:

”لَا یَزَالُ اللّٰہُ تَعَالٰی یَغْرِسُ فِیْ ھٰذَا الدِّیْنِ غَرْسًا یَسْتَعْمِلُھُمْ فِیْ طَاعَتِہٖ۔“ (ابن ماجہ ص:۳)

ترجمہ:......”اللہ تعالیٰ اس امت میں پودے لگاتے رہیں گے جن کو اللہ تعالیٰ اپنے دین کے لئے استعمال فرماتے رہیں گے۔“

ایک پودے کی جگہ دوسرا پودا اللہ تعالیٰ لگاتے رہیں گے، یہاں تک کہ یہ سلسلہ حضرت عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کی تشریف آوری تک جاری رہے گا، دین کو اللہ تعالیٰ مٹنے نہیں دیں گے، دین کے تمام شعبے اپنی اپنی جگہ کام کرتے رہیں گے، کچھ لوگ دین کے مسئلے مسائل بتانے والے ہیں، وہ اپنی جگہ کام کر رہے ہیں، کچھ لوگ

قرآن کریم کے پڑھنے پڑھانے والے ہیں، وہ اپنی جگہ کام کر رہے ہیں، کچھ لوگ حدیث شریف پر کام کرنے والے ہیں، وہ اپنی جگہ کام کر رہے ہیں، کچھ لوگ دلوں کا تزکیہ اور تصفیہ کرنے میں مصروف ہیں، ان کی اپنی الگ دنیا ہے، کچھ دعوت الی اللہ کے کام میں لگے ہوئے ہیں، ان کی اپنی دنیا ہے، یہ عظیم الشان کارخانہ جس کے بے شمار شعبے اللہ تعالیٰ نے بنائے ہیں، یوں ہی یہ سلسلہ چلتا رہے گا، اور اس کے لئے کوئی مستقل منصوبہ بندی نہیں کی جاتی، یعنی جس طرح حکومتیں منصوبے بناتی ہیں، اس طرح کی کوئی منصوبہ بندی نہیں کہ کس ملک میں کیا ضرورت ہے، کیا نہیں ہے؟ کوئی منصوبہ نہیں بنایا جاتا، جہاں جو ضرورت ہوتی ہے، اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے دل میں ڈال دیتے ہیں، وہ وہاں پہنچ جاتے ہیں اور کام کرتے ہیں، جتنا فیض اللہ تعالیٰ نے کسی کو پہنچانا ہوتا ہے، وہ پہنچا دیتے ہیں۔

تعلیم:

تو میں عرض کر رہا تھا کہ ۵۳۷ھ میں خواجہ معین الدین چشتی رحمہ اللہ کی ولادت شریفہ ہوئی، وہاں کے دستور کے مطابق قرآن کریم حفظ کیا، پھر علوم کی تحصیل کی، عالم بنے، لیکن دل میں شعلۂ محبت تھا، اس لئے بیعت کی ابتدا ہوئی۔

ان کا سلسلۂ نسب گیارہ واسطوں سے حضرت حسین رضی اللہ عنہ سے مل جاتا ہے، یعنی حسینی سید ہیں، حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کی اولاد میں سے ہیں۔

پندرہ سال کی عمر تھی کہ تمام علوم سے فارغ ہو چکے تھے، وراثت میں ان کو ایک بڑا باغ ملا تھا، دوسرے مشاغل کے ساتھ اس باغ کی نگرانی بھی فرماتے تھے، ملازم وغیرہ کام کرتے تھے اور حضرت ابتدائی عمر میں خود اس کی نگرانی فرماتے تھے۔

سلوک و احسان:

ایک مرتبہ ایک مجذوب ابراہیم قہندزیؒ تشریف لائے، شیخ نے ان کی بڑی

تعظیم وتکریم کی اور ان کے لئے کچھ انگور اور کچھ پھل لے کر آئے، ابراہیم مجذوب نے اپنے دانتوں سے ایک پھل لیا اور اس کو تھوڑا سا چبایا اور ان کو دے دیا، جس کے کھاتے ہی باغ میں ایک نور ظاہر ہوا، اور حضرت خواجہ کی حالت دگرگوں ہوگئی۔

مجذوبوں سے احتیاط:

یہ مجذوبوں سے ''جذب'' لگ جاتا ہے، اس لئے ذرا مجذوب قسم کے لوگوں سے کچھ محتاط رہنا چاہئے، کچھ تو یہ لوگ پاگل پھرتے ہیں، جن بے چاروں کا دماغ خراب ہوجاتا ہے، یہ مجذوب نہیں ہوتے۔

مجذوب کی تعریف:

''مجذوب'' کہتے ہیں مستِ الست لوگوں کو، جن کو نشۂ خداوندی نے مست کردیا ہو، اور دنیا سے بے خود ہوگئے ہوں۔

مجذوبیت کمال نہیں:

اور یہاں یہ بات یاد رہنی چاہئے کہ مجذوب ہوجانا کمال نہیں ہے، بلکہ نقص ہے، بعض لوگ ان کو یعنی مجاذیب کو کاملین سمجھتے ہیں، یہ غلطی ہے، مجذوب ہونے کے بعد ترقی رک جاتی ہے، جہاں ہے بس وہیں ہے، اس لئے کہ ترقی ہوتی ہے علم وعمل اور معرفت پر۔

جذب وسلوک:

ہاں اگر جذب کے ساتھ ساتھ سلوک بھی ہو یعنی اللہ تعالیٰ کے راستے پر چلتا بھی رہے، ہوش وحواس گم نہ ہوگئے ہوں، تو پھر یہ جذب نعمت کبریٰ ہے۔

سلوک میں جذب:

بزرگ فرماتے ہیں کہ جذب کے بغیر سلوک بھی نہیں ہوتا، جذب کے معنی

اللہ تعالیٰ کا کسی کو اپنی طرف کھینچ لینا، جب تک اللہ تعالیٰ کی طرف سے کشش نہ ہو، جذب نہ ہو، اس وقت تک سلوک نہیں چلتا، سلوک کے معنی راستہ چلنے کے ہیں، راستہ طے کرنے کے ہیں۔

لیکن بزرگ فرماتے ہیں کہ لوگوں کی دو قسمیں ہیں: ایک مجذوب سالک ہوتے ہیں، اور دوسرے سالک مجذوب ہوتے ہیں۔

مجذوب سالک:

مجذوب سالک ان لوگوں کو کہا جاتا ہے جو پہلے کھینچ لئے جاتے ہیں پھر چلائے جاتے ہیں، اللہ تعالیٰ کی کشش ان کو پہلے اپنی طرف کھینچ لیتی ہے اور پھر وہ راستے پر چلنا شروع کرتے ہیں۔

سالک مجذوب:

اور بعض اس کے الٹ سالک مجذوب ہوتے ہیں، پہلے وہ چلنا شروع کرتے ہیں، پھر راستے میں اللہ تعالیٰ کی رحمت ان کو اٹھا لیتی ہے، چلو تم کیا چلو گے؟ ہم تمہیں پہنچا دیتے ہیں! ان حضرات کو سالک مجذوب کہا جاتا ہے، تو جن لوگوں کے ہوش و حواس جاتے رہیں، مست ہو جائیں، وہ کسی کام کے نہیں رہتے، وہ ہمارے کام کے نہیں ہیں۔

مجذوبوں کو نہ ستاؤ:

پھر ان کو ستاؤ بھی نہیں، باقی ان کے قریب بھی مت جاؤ، کیونکہ وہ ایسی منزل پر پہنچے ہوئے ہیں، جہاں تک تمہاری رسائی نہیں ہے، خدا جانے ان کے منہ سے کیا نکلے، اور اللہ تعالیٰ ان کے کہے ہوئے کی لاج رکھا کرتے ہیں۔

پراگندہ حال لوگوں کا مرتبہ:

ایک حدیث شریف میں آتا ہے کہ:

”کَمْ مِنْ اَشْعَثَ اَغْبَرَ ذِیْ طِمْرَیْنِ لَا یُؤْبَهُ لَهٗ لَوْ اَقْسَمَ عَلَی اللّٰهِ لَاَبَرَّهٗ، مِنْهُمُ الْبَرَاءُ بْنُ مَالِكٍ۔“

(مشکوٰۃ ص:۵۷۹)

ترجمہ:...... ”بہت سے ایسے لوگ ہیں جن کے سر پراگندہ ہیں، بال بکھرے ہوئے، (پاگلوں کی طرح اور بدن پورے کا پورا مٹی پڑی ہوئی ہے، میل کچیل، ڈھنگ سے ان کو غسل کرنے اور بدن کو صاف کرنے کا بھی سلیقہ نہیں) اور دو پھٹی پرانی لنگیاں پہنی ہوئی ہیں۔ (ایک نیچے اور ایک اوپر اوڑھی ہوئی ہے، قمیص بھی نہیں، ستر پوشی کے لئے ایک چادر اوپر ہے اور ایک نیچے، اور ایسے لوگوں کا مرتبہ لوگوں کی نظر میں کیا ہوسکتا ہے؟ ذرا اندازہ کریں! تصور کریں! لیکن اللہ کی نظر میں ان کا مرتبہ یہ ہے کہ) اگر وہ قسم کھا کر کہہ دیں کہ آج اللہ تعالیٰ ایسا کریں گے، تو اللہ تعالیٰ ان کی قسم کو پورا کردیں گے، انہی میں سے (حضرت) برأ بن مالکؓ ہیں۔“

حضرت برأ بن مالکؓ کا مقام:

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: اسی جماعت کے ایک فرد برأ بن مالکؓ ہیں، یہ ایک صحابی تھے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہؓ جب جہاد میں جاتے، محنت کی، کوشش کی، جان لڑائی، لیکن فتح کے آثار نظر نہیں آتے تھے، تو برأ بن مالک رضی اللہ عنہ کو پکڑ کر لے جاتے، یہی برأ بن مالک رضی اللہ عنہ تھے جن کو کہیں سے تلاش کرکے لے جاتے اور محاذ میں کھڑا کرکے کہتے کہ: قسم کھاکے

کہو کہ اللہ تعالیٰ ہم مسلمانوں کو فتح دیں گے، یہ اپنے ساتھیوں کے مجبور کرنے سے قسم کھالیتے کہ: مجھے اللہ کی قسم ہے! اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو فتح دیں گے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ اللہ تعالیٰ ان کی قسم کو پورا کرے گا، جب بھی یہ اس طرح دعا مانگتے فتح ہوجاتی تھی، کبھی ایسا نہیں ہوا کہ براءؓ بن مالک رضی اللہ عنہ نے قسم کھا کر کوئی بات کہی ہو، اور اللہ تعالیٰ نے ان کی قسم جھوٹی کردی ہو، ایسا کبھی نہیں ہوا۔

تو میں عرض کر رہا تھا کہ یہ مجذوب قسم کے جو لوگ ہوتے ہیں، ان سے ذرا بچتے رہا کرو، قریب نہ جایا کرو، لوگ ان کے معتقد ہوجاتے ہیں۔

غلط عقیدہ:

اور ایک عقیدہ کی غلطی یہ لوگوں میں پھیلی ہوئی ہے کہتے ہیں کہ یہ بزرگ جو کچھ کہہ دیتے ہیں، وہ ہوجاتا ہے، یہ تقدیر بدل دیتے ہیں۔

اور یہ جو فقیر قسم کے لوگ ہیں ناں! انہوں نے ایک اور بات پھیلا رکھی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے لوحِ محفوظ کو جب لکھا تھا، وہاں تقدیریں جب لکھی تھیں، تو کچھ سیاہی بچ گئی تھی، وہ اللہ تعالیٰ نے فقراءؒ کی زبان پر انڈیل دی، تو گویا ان کا کہا ہوا بھی نوشتۂ تقدیر ہے، یہ بات قطعاً غلط اور جھوٹی ہے، افتراءٌ علی اللہ ہے، اور اس کی حقیقت صرف اتنی ہے جو میں نے ابھی ذکر کی ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کے خاص مقبول اور محبوب بندے ہوتے ہیں، جنہوں نے اپنی ہستی کو اللہ تعالیٰ کی رضا میں مٹالیا، اللہ تعالیٰ ان کے منہ کی بات پوری فرمادیتے ہیں، بس اتنی سی بات ہے، باقی تقدیر کا قلم ان کے ہاتھ میں نہیں ہے اور نہ ان کی بات نوشتۂ تقدیر ہے۔

مجذوب کے پس خوردہ سے احتیاط:

اسی سلسلے میں ایک بات یہ بھی یاد رکھو کہ کسی مجذوب کی جھوٹی چیز مت کھاؤ، ورنہ تمہیں بھی جذب ہوجائے گا، اور اگر خدانخواستہ اس قسم کا جذب ہوجائے کہ ہوش

ہی ٹھکانے نہ رہے تو بڑا مسئلہ خراب ہے۔

خلاصہ یہ کہ خواجہ معین الدین چشتی رحمہ اللہ اپنے باغ میں تھے کہ ابراہیم مجذوب آئے، انہوں نے درویش سمجھ کر ان کی خدمت کی، پھل وغیرہ پیش کیے، انہوں نے ایک پھل کھا کر ان کو دیا، انہوں نے بزرگ کا تبرک سمجھ کر کھالیا، بس کھایا کیا تھا؟ بلکہ منہ کو ہی لگایا تھا کہ حالت دگرگوں ہوگئی اور پھر کیا؟ شیخ سعدی رحمہ اللہ کا ایک قطعہ ہے:

یا مرو با یار ازرک پیراہن
یا بکش برخا نماں انگشت نیل

یا تو نیلے کرتے والے یار کے ساتھ چلو نہیں اور اگر ساتھ چلنا ہے تو عزت و آبرو اور خاندان پر نیل کی انگلی پھیر دو، خط کھینچ دو کہ سب کچھ ختم۔ عزت اور بے عزتی اب کوئی چیز نہیں رہی۔

گرچہ بدنا میست پیش عاقلاں
ما نمی خواہیم ننگ و نام را

اگرچہ عقل مندوں کے ہاں یہ بدنامی کی چیز ہے، لیکن ہم ننگ و نام کی پرواہ نہیں کرتے، کوئی اچھا کہے، کوئی برا کہے چھوڑ دو۔

یا مکن با پیل باناں دوستی
یا بنا کن خانہ بر انداز پیل

یا ہاتھی والوں سے یاری نہ لگاؤ، یا پھر ہاتھیوں کے برابر مکان بھی بناؤ، یاری لگاتے ہو ہاتھی والوں کے ساتھ اور دروازے رکھتے ہو چھوٹے، یہ نہیں ہوگا۔

حضرتؒ پر جذب:

تو شیخ رحمہ اللہ پر جب جذب طاری ہوا اور حالت بدلی تو پھر کہاں کا باغ؟

اور کہاں کا گھر بار؟ اور کہاں کا خاندان؟ اور کہاں کی یہ چیزیں؟ باغ فوراً بیچ دیا اور جو کچھ اس سے ملا تھا وہ اللہ تعالیٰ کے راستے پر لگا دیا، جذب پیدا ہوگیا، جذب اسی کو کہتے ہیں یعنی کشش الی اللہ، اللہ تعالیٰ کی طرف کھنچاؤ پیدا ہوجائے، دنیا سے تعلق ختم، باغ فروخت کردیا اور فروخت کرکے فقرأ پر تقسیم کردیا، گھر میں بھی جو کچھ تھا وہ سب کا سب لٹا دیا، اعلانِ عام کردیا کہ جس کا جو جی چاہے لے جائے، اول ثمرقند پہنچے، وہاں حفظ قرآن، تعلیم علومِ ظاہری میں رہے، اس سے فراغت کے بعد عراق تشریف لے گئے اور قصبہ ہرون پہنچ کر خواجہ عثمان ہارونی رحمہ اللہ سے بیعت ہوئے۔

سب اولیأ، علمأ تھے:

یہاں پر یہ بات بھی یاد رکھو کہ جتنے تمہیں درویش نظر آتے ہیں، اولیأ اللہ، بڑے بڑے اکابر، یہ سب کے سب عالم تھے، حافظ تھے، قاری تھے، اور یہ دینی علوم میں اشتغال رکھتے تھے، اور یہ جو لوگوں نے سمجھ لیا ہے کہ بزرگی کی لائن الگ ہے، اور یہ شریعت کا پڑھنا پڑھانا بالکل الگ چیز ہے، یہ دنیا کا سب سے بڑا جھوٹ ہے۔

حضرت پیرانِ پیرؒ کے ہاں چار شعبے قائم تھے:

میں نے آپ کو شاہ عبدالقادر جیلانی پیرانِ پیر رحمہ اللہ کے تذکرہ میں بتایا تھا کہ بیک وقت ان کی خانقاہ میں چار شعبے چلتے تھے، اور اپنے وقت میں وہ چاروں شعبوں کے امام تھے، ان کا باقاعدہ مدرسہ تھا، مدرسہ میں پڑھاتے تھے اور اس وقت کے سب سے بڑے مدرس تھے، ان کی ٹکر کا کوئی استاذ نہیں تھا۔

علامہ ابن خزامہؒ بارگاہِ جیلانی میں:

ابن خزامہ المقدسی حنبلی اپنی کتاب ''المغنی'' میں لکھتے ہیں کہ میرا بالکل ابتدائی زمانہ تھا، میں شیخ عبدالقادر جیلانی رحمہ اللہ کی خدمت میں پڑھنے کے لئے گیا، آپ نے مجھے چند اسباق پڑھائے، لیکن فرمایا: بیٹا تم بہت دیر سے آئے ہو، میرا اب

جانے کا وقت آچکا ہے، تم میرے فلاں شاگرد سے پڑھو۔

پیرانِ پیرؒ سب سے بڑے مفتی:

پیران پیر رحمہ اللہ اس وقت کے سب سے بڑے مدرس تھے۔ حضرت رحمہ اللہ کتابیں پڑھاتے تھے، اور اس وقت کے سب سے بڑے مفتی تھے، ان کے ہاں سے فتویٰ جاری ہوتا تھا، اور دونوں مذہبوں پر فتویٰ دیتے تھے، امام شافعی رحمہ اللہ کے مذہب پر، اور امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کے مذہب پر۔

مفتی ایک مذہب پر فتویٰ دے سکتا ہے:

یہ مسئلہ بھی یاد رکھو کہ فتویٰ صرف ایک مذہب پر دے سکتے ہیں، میں حنفی ہوں، مجھے صرف حنفی مذہب پر فتویٰ دینے کا حق ہے، میں یہ تو بتا سکتا ہوں کہ امام شافعی رحمہ اللہ کا اس مسئلہ میں یہ مذہب ہے، یہ بھی بتا سکتا ہوں کہ امام مالک رحمہ اللہ اس مسئلہ میں یہ رائے رکھتے ہیں، امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ یہ رائے رکھتے ہیں، مجھے ائمہ کے مذاہب بتادینے کا حق حاصل ہے، لیکن میں فتویٰ اپنے امام کے قول کے مطابق دوں گا، کسی دوسرے امام کے قول کے مطابق نہیں دے سکتا۔ یہ ایک اصول ہے، لیکن حضرت شیخ پیران پیر رحمہ اللہ کو اللہ تعالیٰ نے قدرت عطا فرمائی تھی کہ بیک وقت دونوں مذہبوں پر فتویٰ دیتے تھے، یہ خود حنبلی ہیں، امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کے مقلد ہیں، اور ان کا مذہب وہی ہے جو سعودی عرب والوں کا ہے، یہ پکے وہابی ہیں، حضرت پیران پیر رحمہ اللہ بھی حنبلی ہیں، تو اس وقت کے سب سے بڑے مفتی بھی حضرت پیران پیر ہی تھے، اور اس وقت کے سب سے بڑے واعظ بھی حضرت پیران پیر تھے، وعظ وتقریر فرماتے تھے اور نہ معلوم کہاں کہاں سے سمٹ کر لوگ ان کے وعظ میں جمع ہوتے تھے، اور اگر کبھی بادشاہوں کے معاملات کی اصلاح کرنی ہوتی تو وعظ میں فرماتے تھے، کیونکہ امرأ، بادشاہ اور خلفاؑ تک ان کے وعظ میں شریک اور حاضر ہوتے تھے۔

ولایت میں آپؒ کا مقام:

ان کی درویشی اور بزرگی کا تو پوچھنا ہی کیا؟ آخر پیرانِ پیر کہلاتے ہیں، اپنے وقت کے سب سے بڑے شیخ بھی تھے اور منبر پر بیٹھ کر فرمایا تھا کہ: ’’قَدَمِیْ هٰذِهٖ عَلٰی رَقَبَةِ کُلِّ وَلِیٍّ۔‘‘ میرا یہ پاؤں ہر ولی کی گردن پر ہے۔

ہندوستان میں حضرت خواجہ معین الدین چشتی رحمہ اللہ کو یہ بات پہنچی ممکن ہے کشف ہوگیا ہوگا، یا یوں کہو کہ ٹیلی فون لگا ہوا ہوگا، کیونکہ ان کے بھی ٹیلی فون ہوتے ہیں اور اس باطنی ٹیلی فون کے ذریعہ ان کو خبر پہنچی تو سر جھکا کر فرمایا: ’’بَلْ عَلَی الرَّأْسِ وَالْعَیْنِ!‘‘ گردن پر نہیں بلکہ میری آنکھوں پر اور میرے سر پر!

درویشی اور شریعت الگ نہیں:

تو یہ سمجھنا کہ درویشی الگ چیز ہے اور شریعت الگ چیز ہے، یہ جاہل لوگوں کی پھیلائی ہوئی جہالت ہے، یہ بزرگانِ دین اپنے وقت کے عالم بھی تھے، امام فتویٰ بھی تھے، واعظ بھی تھے، اور ساتھ کے ساتھ صوفی بھی تھے، الحمدللہ! ہمارا سب کا سب سلسلہ ہمارے اکابر رحمہم اللہ کا سلسلہ ان چاروں چیزوں کو لئے ہوئے ہے، اللہ تعالیٰ کا شکر ہے۔

سلسلۂ چشتیہ اقطاب کا سلسلہ ہے:

میں نے ایک موقع پر عرض کیا تھا کہ اللہ تعالیٰ کا احسان ہے کہ ہمارا سلسلۂ طریقت یہ اقطاب کا سلسلہ ہے، ہر بزرگ اپنے زمانے کا قطب ہوا۔ تو خواجہ عثمان ہارونی رحمہ اللہ کے ہاتھ پر بیعت ہوئے، میں ان کے ملفوظات سناؤں گا، کیونکہ خواجہ معین الدین چشتی رحمہ اللہ نے اپنے شیخ کے ملفوظات لکھے، پھر حضرت خواجہ رحمہ اللہ کے ملفوظات ان کے خلیفہ اعظم حضرت خواجہ بختیار کاکی رحمہ اللہ نے لکھے، پھر حضرت خواجہ بختیار کاکی رحمہ اللہ کے ملفوظات ان کے خلیفہ اعظم حضرت گنج بخش رحمہ اللہ

پاک پتن والوں نے لکھے، پھر ان کے ملفوظات ان کے خلیفہ اعظم خواجہ نظام الدین سلطان جی رحمہ اللہ نے لکھے، سلطان الہند خواجہ نظام الدین اولیأ رحمہ اللہ اور پھر خواجہ نظام الدین رحمہ اللہ کے ملفوظات ان کے دو شاگردوں یعنی دو مریدوں نے لکھے، یہ بزرگوں کا سلسلہ چلا آرہا ہے۔

حضرت شیخ کی خدمت کے بیس سال:

''انیس الارواح'' کے نام سے خواجہ معین الدین چشتی رحمہ اللہ نے اپنے پیر کے ملفوظات جمع کئے ہیں، اور اس کے شروع میں لکھتے ہیں کہ جس دن یہ فقیر حاضر خدمت ہوا اور قدم بوسی کی سعادت نصیب ہوئی، تو مجھے بیعت فرما کر میرے سفر کے بال کٹوائے اور چار گوشہ ٹوپی میرے سر پر رکھی اور پھر فرمایا کہ: جب تک میرے شیخ زندہ رہے، میں ان کے ساتھ رہا، خدمت کے بغیر فقیر، فقیر نہیں بنتا، اشارہ اس طرف تھا کہ تم بھی آگئے ہو تو بس یہیں کے ہو کر رہو گے، چنانچہ فرماتے ہیں کہ میں بیس سال اپنے شیخ رحمہ اللہ کی خدمت میں رہا۔ خواجہ معین الدین چشتی رحمہ اللہ اپنے شیخ کی خدمت میں بیس سال رہے، اور بیس سال میں ملکوں ملکوں کی سیر کی، اپنے شیخ کے ساتھ پھرتے رہے، مکہ مکرمہ بھی گئے، حج بھی کیا، شیخ ہی کے ساتھ رہے، ان کے ذمہ لوٹا، مسواک، کپڑے پہنانے کی خدمت سپرد تھی، بیس سال کے بعد شیخ نے ''معین الدین'' کا خطاب دیا اور کہا: حسن! ولایت ہند تمہارے سپرد کی جاتی ہے، جاؤ وہاں جا کر بیٹھ جاؤ۔ ان کے شیخ حضرت خواجہ محمد عثمان ہارونی رحمہ اللہ ان کو ہندوستان کی ولایت پر مامور فرما کر خود حج کے لئے تشریف لے گئے اور وہاں جا کر انتقال فرمایا۔ اور یہ اپنے شیخ کے حکم سے یہاں تشریف لے آئے۔

ہمارے سلسلہ کی عجیب بات:

ہمارے سلسلے میں بھی ایک عجیب بات چلی آتی ہے ساری عمر ساتھ رہے

لیکن وفات کے وقت موجود نہیں، ان کے خلیفہ اعظم خواجہ بختیار کا کی رحمہ اللہ بیس سال اپنے شیخ کی خدمت میں رہے، لیکن وفات سے پہلے کہہ دیا کہ دہلی کا پایۂ تخت تمہارے سپرد کیا جارہا ہے، جاؤ وہاں پہنچ جاؤ۔ وہ فرماتے ہیں کہ میں دہلی پہنچا، چالیس دن کے بعد مجھے اطلاع ملی کہ تمہارے جانے کے بیس دن کے بعد شیخ رحمہ اللہ کا انتقال ہوگیا، اور ان کے خلیفہ اعظم شیخ مسعود اجودھنی گنج شکر رحمہ اللہ وہ بیس سال اپنے شیخ کی خدمت میں رہے، لیکن شیخ نے وفات سے پہلے فرمایا کہ: فلاں جگہ چلے جاؤ، اور یہی خواجہ نظام الدین اولیأ رحمہ اللہ کے ساتھ ہوا، تو خیر یہ بھی عجائباتِ قدرت میں سے ہے۔

اجمیر تشریف آوری:

آپؒ یہاں اجمیر شریف میں تشریف لے آئے، خواجہ صاحب رحمہ اللہ وہاں پہنچے، ایک جگہ ڈیرہ لگادیا، اور اس وقت یہ ہندوستان کی سرزمین خالص ہندوؤں کی سرزمین تھی، بہت کم لوگ ایسے تھے جو کہیں خال خال مسلمان ہوگئے تھے، محمود غزنوی رحمہ اللہ کے زمانے سے وہاں راجہ پرتھوی راج کی حکومت تھی، شیخ رحمہ اللہ آکر ایک قریب کے درخت کے نیچے بیٹھ گئے، ملنگ، نہ کھانے کا سامان تھا، نہ پینے کا، نہ کوئی اور، نہ کسی سے لین، نہ دین، ایک مسافر تھے، کوئی دم درود کے لئے آجاتا، کوئی بیمار ہوتا یہ پھونک مار دیتے، اللہ تعالیٰ شفا دے دیتے، اس طرح لوگ مسلمان ہونے لگے، جو ان کی خدمت میں بیٹھ جاتا مسلمان ہوجاتا۔

راجہ پرتھوی راج کی گستاخی اور اس کا انجام:

راجہ کو اطلاع پہنچی تو اس نے پیغام بھیجا کہ اس کو کہو کہ نکل جائے یہاں سے، جواب میں ارشاد فرمایا کہ: فقیر یہاں رہنے کے لئے آیا ہے، تمہارا کوئی نقصان نہیں کرتا، مجھے یہاں سے کیوں نکالتے ہو؟ پھر پیغام آیا کہ اس کو کہو کہ نکل جائے

یہاں سے، پھر جواب دیا کہ: میرا قصور کیا ہے کہ مجھے یہاں سے نکالا جارہا ہے؟ تیسری دفعہ پیغام آیا کہ اگر نہیں نکلیں گے تو ہم پکڑ کر نکال دیں گے، شیخ رحمہ اللہ نے جوش میں آکر فرمایا کہ: میں نے تجھے یہاں سے نکال دیا اور زندہ پکڑ کر کسی کے حوالے کردیا، جاؤ! شیخ رحمہ اللہ کا یہ کہنا تھا کہ چند دن کے بعد شہاب الدین غوری رحمہ اللہ آئے، اور اس پر حملہ آور ہوئے، زندہ پکڑا گیا اور وہ علاقہ مسلمانوں کا ملک بن گیا۔

اب انہوں نے کیا کیا؟ لوگوں کو کس طرح تعلیم وتربیت فرمائی؟ افسوس ہے کہ کتابیں بالکل اس سے خاموش ہوگئیں۔ کیا مشاغل تھے؟ کیا معمولات تھے؟ لوگوں سے کیا برتاؤ کرتے تھے؟ میں نے بتایا ہے کہ خواجہ بختیار کاکی رحمہ اللہ نے جوان کے خلیفہ ہیں، ان کے ملفوظات جمع کئے ''دلیل العارفین'' کے نام سے، وہ میرے پاس موجود ہیں، لیکن بس حضرت نے یہ ارشاد فرمایا: ایک مجلس لگی اس میں یہ ارشاد فرمایا اور اس مجلس کی تقریر قلمبند کرلی اور بس! باقی کسی قسم کے حالات کہ لوگوں کو کس طرح دعوت الی اللہ دیتے تھے؟ کیا معمولات تھے آپ کے؟ ان تفصیلات سے کتابیں بالکل خاموش ہیں۔

آپؒ کا فیض:

اس لئے میں نے کہا کہ افسوس ہے کہ اتنے بڑے شیخ! کہ ایک سو پانچ سال کی عمر تھی اور جس دن انتقال ہوا تو آپؒ کے ہاتھ پر اس وقت تک نوے لاکھ انسان مسلمان ہوگئے تھے، نوے لاکھ آدمیوں کو مسلمان کر کے گئے تھے، ویرانہ کفر میں نوے لاکھ کافروں کو مسلمان کرکے گئے، اس لئے یہ کہنا صحیح ہے کہ ہندوستان میں یہ جو مسلمان نظر آرہے ہیں یہ حضرت خواجہ معین الدین چشتی رحمہ اللہ کا فیض ہے، یا اس قسم کے اور اولیاء اللہ کا فیض ہے، بادشاہوں کی تلواروں سے اسلام نہیں پھیلا۔

انگریزوں کا غلط پروپیگنڈا:

یہ انگریزوں نے جھوٹ پھیلایا تھا کہ عالمگیر رحمہ اللہ نے تلوار کے زور سے لوگوں کو مسلمان بنایا تھا، بھلا تلوار کے زور سے بھی کوئی مسلمان ہوا کرتا ہے؟ بھائی! تلوار کا زور اوپر تک تو چل سکتا ہے، دل تک تو تلوار کی نوک نہیں جاسکتی، یہ جو والہانہ عقیدت کے ساتھ لوگ مسلمان ہوئے، اور آج بھی جبکہ ہندوستان پر کفر کا تسلط ہے، اور مسلمانوں کی پٹائی ہو رہی ہے، اور لوگ مسلمان ہو رہے ہیں، ان کو کون مسلمان کر رہا ہے؟ ہندوستان میں جب انگریز کا تسلط تھا آپ دیکھتے تھے کہ جامع مسجدوں میں اور دوسری جگہوں میں لوگ مسلمان ہوتے تھے، ہندو، مسلمان ہوتے تھے، جبر و تشدد کے ساتھ کفر کو پھیلایا جاسکتا ہے، اسلام کو نہیں پھیلایا جاسکتا، ”لَا اِكْرَاهَ فِی الدِّیْنِ“ دین میں زبردستی نہیں چلتی۔

تو اس لئے بزرگ فرماتے ہیں کہ علماءٔ کی تبلیغ اور بادشاہوں کے دبدبہ اور طنطنہ سے دین اتنا نہیں پھیلا، جتنا بزرگانِ دین کے انفاسِ طیبہ سے پھیلا ہے، ان کے فیض وصحبت سے پھیلا ہے۔

اتباعِ سنت:

حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ نے حضرت خواجہ رحمہ اللہ کی اتباع سنت کا ایک واقعہ نقل کیا ہے کہ: ایک دفعہ وضو فرما رہے تھے، اتفاق سے داڑھی کا خلال کرنا بھول گئے۔

پہلے مسئلہ سمجھو کہ جس شخص کی داڑھی ہلکی ہے، اس کے لئے پوری داڑھی کا بھگونا فرض ہے، وضو میں داڑھی کا تر کرنا فرض ہے، اور جس کی داڑھی گھنی ہو، اس کے لئے بالوں کے اندر پانی پہنچانا فرض نہیں ہے، بلکہ اس کے اوپر کے حصے کو دھونا فرض ہے، لیکن اندر سے داڑھی کا خلال کرنا اس کے حق میں سنت ہے اور سنت بھی

مستحب قسم کی ہے، یعنی کوئی اگر چھوڑ دے، نہ کرے تو گناہگار نہیں ہوگا، اور یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ اس نے بہت برا کیا، یعنی سنت کا درجہ مستحب کا ہے، یعنی سنت مستحبہ، حضرت خواجہ رحمہ اللہ ایک دفعہ وضو فرما رہے تھے اور داڑھی کا خلال کرنا بھول گئے، غیب سے آواز آئی کہ محبتِ رسولؐ کا دعویٰ کرتے ہو اور سنت کے خلاف کرتے ہو؟ حضرت رحمہ اللہ فرماتے ہیں آپ نے فوراً توبہ کی کہ آئندہ ایسی حرکت نہیں کروں گا، اور اس پر استغفار کیا، توبہ کی، ایک مستحب کے ترک کردینے پر غیب سے عتاب ہوا، اور آپ نے اس پر توبہ کی۔

لوگوں کے ساتھ ان کے مقام کے مطابق معاملہ کرنے کا حکم:

یہاں پر یہ نکتہ خاص طور سے یاد رکھنے کے قابل ہے کہ حق تعالیٰ شانہ کا ہر ایک کے ساتھ معاملہ جدا ہے، میں نے آپ کو حدیث سنائی تھی ناں! کہ ایک دفعہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی خدمت میں ایک سائل آیا، اس نے کہا بھوکا ہوں، روٹی دے دو، روٹی کھلاؤ، حضرت ام المؤمنین رضی اللہ عنہا نے خادمہ سے کہا کہ اس کو کھانا دے دو، اس کو کھانا ہاتھ میں پکڑا دو، وہ چلا گیا، ایک اور شخص آیا اس کا بھی یہی سوال کہ بھوکا ہوں کھانا کھلاؤ، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے خادمہ سے فرمایا اس کو عزت کے ساتھ بٹھاؤ، اور اس کو کھانا کھلاؤ، انہوں نے کہا کہ حضور! دو آدمیوں کا سوال ایک تھا لیکن معاملہ دونوں کے ساتھ الگ الگ، ارشاد فرمایا کہ: ہمیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے وصیت فرمائی تھی: ”اَنزِلُوا النَّاسَ عَلٰی قَدرِ مَنَازِلِھِم۔“ (ابوداؤد ج:۲ ص:۳۰۹)

لوگوں سے ان کے مرتبہ کے مطابق معاملہ کیا کرو۔ یعنی جس مرتبے کا آدمی ہو اس مرتبے کا اس کے ساتھ معاملہ کرو، یہ بات کہہ کر فرمایا وہ پہلا آدمی بے چارہ کم حیثیت کا تھا، اس کے ہاتھ میں روٹی پکڑا دی وہ اس پر خوش ہوگیا، اس نے اپنی کوئی بے عزتی

محسوس نہیں کی، اور اس آدمی کو میں نے دیکھا کہ صاحبِ وجاہت ہے، اب کسی چوہدری کے ہاتھ میں تم روٹی پکڑا دو، وہ تو اس کو اپنی بے عزتی سمجھے گا،معزز آدمی کے ہاتھ میں روٹی پکڑا دو، تو وہ اس کو اپنی بے عزتی سمجھے گا، اس لئے اس کو بٹھا کر کھلانا چاہیے، میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کے مطابق دونوں کی حیثیت کے مطابق معاملہ کیا ہے۔

حق تعالیٰ کا معاملہ ہر ایک کے ساتھ جدا جدا ہے:

میں نے آپ کو اس لئے یہ حدیث سنائی کہ حق تعالیٰ شانہ کا معاملہ بھی اسی طرح ہے، اللہ تعالیٰ ہر بندے کے ساتھ اس کی حیثیت کے مطابق فیصلہ فرماتے ہیں، یہ اللہ تعالیٰ کے مقبول بندے تھے، ایک مستحب ترک ہوا تو اس پر غیب سے ڈانٹ پڑی کہ محبت کے دعوے کرتے ہو؟ حالانکہ ان بے چاروں نے دعویٰ کب کیا تھا؟ یہاں تو دعوے کی نفی ہوگئی تھی، مطلب یہ ہے کہ بزرگ بنے پھرتے ہیں اور مستحب کا التزام نہیں، ان کو ایک دن ایک مستحب پر ٹوک دیا گیا، غیب سے ٹوک دیا گیا، اور ہم فرائض کو بھی ہضم کرتے پھریں، ہمیں کوئی ٹوکنے والا نہیں، ہمارے ساتھ ہماری حیثیت کے مناسب معاملہ کیا جاتا ہے، اور ان اکابر رحمہم اللہ کے ساتھ ان کی حیثیت کے مناسب معاملہ کیا جاتا ہے۔

اس لئے بزرگ فرماتے ہیں کہ: مقرباناں بیش بود حیرانی، جتنے زیادہ مقرب ہوتے ہیں، اتنی حیرانی ان کو زیادہ ہوتی ہے، تم سمجھتے ہو کہ یہ جو بزرگ ہوتے ہیں، بہت امن میں ہوتے ہوں گے، نہیں بھائی! ان پر تو ہر وقت کپکپی طاری رہتی ہے، یہ مضمون انشاءاللہ کسی دوسرے وقت میں آجائے گا۔

وآخر دعوانا ان الحمدللہ رب العالمین

آدابِ تعلیم وتربیت

حضرات انبیاءِ کرام علیہم السلام کو حق تعالیٰ نے تمام اخلاق اور کمالات کی استعداد پیدا کرکے مبعوث فرمایا، ان کے بدن میں اور ان کی ظاہری اور باطنی قوتوں میں کسی قسم کا کوئی نقص نہیں ہوتا، اللہ تعالیٰ ان کو کامل و مکمل پیدا کرتے ہیں، اور ہمارے آنحضرت تو سید المرسلین ہیں، سید الخلائق ہیں، سید الاولین و الآخرین ہیں، صلی اللہ علیہ وسلم۔ تمام کمالات جو انسانیت کے ہوسکتے ہیں وہ حق تعالیٰ نے اپنی کمال قدرت سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ودیعت فرمادیئے تھے، رکھ دیئے تھے، کوئی انسانی کمال ایسا نہیں تھا جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات عالی میں نہ رکھا گیا ہو، اور کوئی نقص ایسا نہیں تھا جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات عالی میں رکھا گیا ہو۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم
الحمد للہ وسلام علی عبادہ الذین اصطفیٰ!

”عَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: اِنَّ اللهَ اَدَّبَنِىْ فَاَحْسَنَ تَأْدِيْبِىْ، ثُمَّ اَمَرَنِىْ بِمَكَارِمِ الْاَخْلَاقِ۔“ (کشف الخفاءٗ ج:۱ ص:۷۰)

ترجمہ:......”میرے رب نے مجھے ادب سکھایا، بس بہت اچھا ادب سکھایا، پھر مجھے اچھے اخلاق کا حکم دیا۔“

ادب کہتے ہیں طریقہ کو، جو طریقہ کہ انسان کے لئے پسندیدہ ہے، اور جسے پسندیدہ سمجھنا چاہئے، اس طریقے کو اختیار کرنے کا نام ادب ہے۔

تربیت کے اعتبار سے لوگوں کی قسمیں:

ایک بزرگ فرماتے ہیں کہ لوگ دو قسم کے ہیں۔ بعض وہ ہیں جن کو اللہ تعالیٰ فطری طور پر اخلاق پر پیدا فرماتے ہیں، ان کی معمولی نوک پلک درست کرنے سے وہ چل پڑتے ہیں۔ اور بعض وہ ہوتے ہیں جن کو فطری طور پر یہ چیز حاصل نہیں ہوتی، ان کے لئے مجاہدے کی ضرورت ہوتی ہے، ریاضت کی ضرورت ہوتی ہے، نفس

کو پابند بنانے کی ضرورت ہوتی ہے، اور مہذب بنانے کی ضرورت ہوتی ہے۔

وفد عبدالقیس کے رئیس کی محبوب خصلتیں:

رسول اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بحرین سے عبدالقیس قبیلہ کا وفد آیا تھا، جب یہ حضرات دور کا سفر کرتے ہوئے مدینہ پہنچے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اشتیاق میں اونٹوں سے اتر کر ہی دوڑ پڑے، لیکن اس وفد کے رئیس جن کو ''اشج'' کہتے تھے۔ دراصل ''اشج'' کہتے ہیں اس شخص کو جس کی پیشانی پر زخم کا نشان ہو، چونکہ ان کی پیشانی پر زخم کا نشان تھا، اس لئے ان کو ''اشج'' کہا جاتا تھا۔ انہوں نے تمام سواریوں کو بٹھایا، ان کے بوجھ اتارے، ان کو باندھا، اپنی سواریاں بھی اور اپنے رفقا کی سواریاں بھی باندھیں، اس کے بعد غسل کیا، صاف کپڑے پہنے، پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے۔

ایک انداز تو وہ تھا، جو دوسرے رفقا نے اختیار کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کے لئے ایسے بے تاب ہوئے کہ سواریوں کو بٹھانے اور بوجھ اتارنے کا بھی ہوش نہ رہا، اور ایک انداز وہ تھا جو ان کے رئیس نے اختیار کیا، جن کا نام غالبًا منذر بن عائذ تھا، جب یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں حاضر ہوئے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''ان فیک لَخَصْلَتَیْنِ یحبھما اللہ: الحلم والاناءۃ۔'' (مشکوٰۃ ص:۴۲۹) تم میں دو خصلتیں اور دو عادتیں ایسی پائی جاتی ہیں جن کو اللہ تعالیٰ محبوب رکھتے ہیں، یعنی جو اللہ تعالیٰ کو محبوب ہیں اور پسندیدہ ہیں: ایک حلم اور دوسری سوچ سمجھ کر اطمینان کے ساتھ کام کو کرنا، جلد بازی سے کام نہ لینا۔

''حلم'' کے معنی ہیں تحمل کرنا اور حوصلہ کرنا، جلدی سے مشتعل نہ ہوجانا۔

اور اناءۃ کے معنی ہیں آہستگی اور اطمینان کے ساتھ کسی کام کو کرنا، انہوں نے عرض کیا: یا رسول اللہ! یہ دونوں خصلتیں میرے اندر فطری ہیں، یعنی اللہ تعالیٰ نے

پیدا فرمادی ہیں یا کسبی ہیں کہ میں نے محنت کے ساتھ حاصل کی ہیں؟ فرمایا: فطری ہیں! اللہ تعالیٰ نے ایسے ہی بغیر محنت کے پیدا فرمادی ہیں، یہ سن کر انہوں نے کہا: اس اللہ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ہے جس نے مجھے ایسی دو خصلتوں پر پیدا کیا ہے جو اللہ تعالیٰ کو محبوب ہیں۔

تو بعض لوگوں میں فطری طور پر آداب و اخلاق پائے جاتے ہیں، ان کے لئے ذرا سی راہنمائی کی ضرورت ہوتی ہے، جس سے ان کے جوہر کھل جاتے ہیں۔

اور بعض حضرات ایسے ہیں کہ ان میں کمی ہوتی ہے، ان کو تعلیم وتربیت کی ضرورت ہوتی ہے۔

قبولیت تربیت کے اعتبار سے لوگوں کی اقسام:

پھر تعلیم وتربیت کے اعتبار سے لوگوں کی دو قسمیں ہوتی ہیں:

۱:......بعض وہ ہوتے ہیں جو تعلیم وتربیت کا اثر جلدی قبول کر لیتے ہیں اور ان پر جلدی رنگ آجاتا ہے۔

۲:......بعض حضرات وہ ہوتے ہیں جن پر اثر بہت دیر سے ہوتا ہے، اور بہت کمزور ہوتا ہے، استعداد ناقص ہوتی ہے۔

ایک مثال:

ایک بزرگ کے پاس کوئی صاحب بیعت ہونے کے لئے آئے، انہوں نے بیعت فرمالیا، دو چار دن رہے رخصت ہونے لگے تو ان کو خلافت عطا فرمادی، جو لوگ دس دس سال سے پڑے ہوئے تھے، مجاہدے کر رہے تھے، ان کو شکایت ہوئی، شیخ کو بھی اس کی اطلاع ہوئی، شیخ نے فرمایا: لکڑیاں درختوں سے کاٹ کر لاؤ، گیلی لکڑیاں لائی گئیں پھر فرمایا: ان کو آگ لگاؤ! مگر ان سے آگ جلتی نہیں تھی، بھلا گیلی لکڑی سے آگ کیسے جلے گی؟ پھر فرمایا: گھاس پھوس لاؤ! وہ لے آئے تو اس کو آگ لگائی تو وہ

فوراً جل پڑی، فرمایا: یہ تمہاری اور ان کی مثال ہے، یہ پہلے تیار ہوکر آئے تھے، صرف ماچس دکھانے کی ضرورت تھی، اور تم ہو گیلی لکڑیاں، دس سال ہوگئے تم کو سکھاتے ہوئے لیکن اب تک سوکھ کے نہیں دیئے ہو، ابھی تک پانی موجود ہے۔

پوشیدہ صلاحیت کی مثال:

تو بزرگ فرماتے ہیں کہ آدابِ شرعیہ کے لحاظ سے لوگوں کی استعدادیں مختلف ہوتی ہیں، بعد میں استعداد ظاہر ہوتی ہے، حقیقت میں ان کے اندر استعداد چھپی ہوئی ہوتی ہے، ان کی ذرا سی تربیت کی ضرورت ہوتی ہے، اور فرماتے ہیں کہ ان کی مثال ایسی ہے جیسے کھجور کی گٹھلی کے اندر کھجور کا درخت چھپا ہوا ہے، صرف ان کو کاشت کرنے کی تھوڑی سی محنت ہوگی، یا زنادا ایک لکڑی ہے، اس کو رگڑتے ہیں تو اس میں سے آگ نکلتی ہے، فرماتے ہیں کہ اس لکڑی کے اندر آگ چھپی ہوئی ہے، صرف ذرا سا رگڑنے کی ضرورت ہے۔ تو بعض حضرات تو ایسے ہیں اور بعض حضرات ایسے ہیں کہ ان کے اندر استعداد پیدا کرنے کی ضرورت پیش آتی ہے اور محنت و ریاضت کے بعد استعداد پیدا ہوتی ہے۔

محنت کے میدان:

ہمارے حضرت ڈاکٹر عبدالحئی عارفی صاحب نور اللہ مرقدہٗ فرمایا کرتے تھے کہ بھئی ہمارا گھر ہے، دوست احباب کا حلقہ ہے، ملنے جلنے والوں کا حلقہ ہے، بازار ہے، یہ سارے کے سارے ہمارے مجاہدے کے میدان ہیں، ہمارا برتاؤ گھر والوں کے ساتھ کیسا ہے؟ ہمارا برتاؤ دوست احباب کے ساتھ کیسا ہے؟ اور ملنے والوں کے ساتھ، تعلق والوں کے ساتھ کیسا ہے؟ بہت سی ناگواریاں پیش آئیں گی، بہت ساری چیزیں مزاج کے خلاف پیش آئیں گی، فرماتے ہیں کہ یہ سارے کا سارا مجاہدے کا میدان ہے، ان میدانوں میں ہماری تربیت کے جوہر کھلتے ہیں، ہمارا مزاج کیسا ہے؟

ہماری تربیت کیسی ہے؟ ہمارے اخلاق کیسے ہیں؟ ہم کس حد تک آداب کو لئے ہوئے ہیں؟

حضرات انبیاؑ کی تربیت:

میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا جو ارشاد شروع میں پڑھا ہے کہ: میرے رب نے مجھے ادب سکھایا ہے، بہت اچھا ادب سکھایا ہے، اور میرے رب نے مجھے اچھے اخلاق کی تعلیم دی۔

حضرات انبیاؑ مجموعہ کمالات:

حضرات انبیاؑ کرام علیہم السلام کو حق تعالیٰ نے تمام اخلاق اور کمالات کی استعداد پیدا کرکے مبعوث فرمایا، ان کے بدن میں اور ان کی ظاہری اور باطنی قوتوں میں کسی قسم کا کوئی نقص نہیں ہوتا، اللہ تعالیٰ ان کو کامل ومکمل پیدا کرتے ہیں، اور ہمارے آنحضرت تو سید المرسلین ہیں، سید الخلائق ہیں، سید الاولین والآخرین ہیں، صلی اللہ علیہ وسلم۔ تمام کمالات جو انسانیت کے ہوسکتے ہیں وہ حق تعالیٰ نے اپنی کمال قدرت سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ودیعت فرمادیئے تھے، رکھ دیئے تھے، کوئی انسانی کمال ایسا نہیں تھا جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات عالی میں نہ رکھا گیا ہو، اور کوئی نقص ایسا نہیں تھا جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات عالی میں رکھا گیا ہو، اس کے باوجود آپ صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں کہ: ”اللہ تعالیٰ نے مجھے ادب سکھایا اور مجھ کو تعلیم دی۔“

نبی کا معلّم؟

اب نبی کا معلّم تو اللہ تعالیٰ ہی ہوتا ہے، نبی کو ادب سکھانے والے خود اللہ تعالیٰ ہی ہوتے ہیں، کوئی دوسرا ادب سکھانے والا نہیں ہوتا اور انبیاؑ تمام انسانیت کے معلّم ہوتے ہیں، حضرات انبیاؑ کرام تمام انسانیت کے مؤدب ہوتے ہیں، انسانیت کو

ادب سکھانے والے ہوتے ہیں، اور دنیا بھر کے حکیم اور فلاسفر ان کے سامنے زانوئے ادب طے کرتے ہیں، لیکن ان کی تعلیم وتربیت اللہ تعالیٰ خود فرماتے ہیں۔

جب نبی ادب کا محتاج ہے تو دوسرے کس قدر ہوں گے؟

میں جو بات سمجھانا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کے اندر کمالات پیدا فرماتے ہیں اور رکھتے ہیں اور اس کے بعد پھر تعلیم بھی دیتے ہیں، ادب بھی سکھاتے ہیں، ان تمام کمالات کے باوجود ان حضرات کو اللہ تعالیٰ سے ادب سیکھنے اور علم سیکھنے کی ضرورت پیش آتی ہے، اب اس سے اندازہ فرما سکتے ہیں کہ دوسرے لوگ، خواہ اللہ تعالیٰ نے ان میں کتنی استعداد رکھی ہو وہ تعلیم اور تأدیب کے کس قدر محتاج ہوں گے؟

نبی کی تعلیم عین فطرت ہے:

اور پھر یہ تعلیم وتأدیب اگر آپ دوسروں سے سیکھیں گے تو ہلاک ہوجائیں گے، بگڑ جائیں گے، پہلے سے زیادہ بگڑ جائیں گے، اپنی استعداد کو برباد کرلیں گے، اور اگر حضرات انبیاءؑ سے سیکھیں گے تو ان کی تعلیم اور تأدیب عین فطرت انسانی کے مطابق ہوگی، آپ انسانِ کامل بنیں گے۔

نبی کی ذات نمونۂ تربیت ہے:

ہمارے حضرت ڈاکٹر صاحب نور اللہ مرقدہٗ فرماتے تھے کہ بھئی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مثال ایسی ہے کہ ایک آقا نے حکم دیا کہ ایسی چیز بنا کے لاؤ، سمجھا دیا گیا کہ یہ کرو، یہ کرو، یہ کرو، لیکن انہوں نے کہا کہ: حضور! کوئی نمونہ دے دیں، اس نمونے کے مطابق یہ چیز ہم بنادیں گے، ایسے سمجھانے سے تو ممکن ہے کہ بات سمجھ میں نہ آئے اور حضور کی منشا کے مطابق نہ ہوسکے، تو آقا نے اپنے نوکر کو ایک نمونہ دے دیا کہ اس نمونے کے مطابق بنا کے لاؤ۔ حضرت قدس سرہٗ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ انسان بن کے دکھاؤ، اپنے بندوں کو حکم دیا کہ انسان بن کے

دکھاؤ، ہمارے بندے بن کے دکھاؤ۔ بندوں نے کہا کہ: یا اللہ! کیسے بندے بنیں؟ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: یہ کیا کرو، یہ کیا کرو، لیکن بات پھر بھی قابو میں نہ آئی، تو اللہ تعالیٰ نے ایک نمونہ پیش کردیا، محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ عالی کا کہ تمہیں انسانِ کامل کا ایک نمونہ دے دیتا ہوں، بس اس کی نقل اتار کے آؤ، جیسے یہ ہیں، اپنے آپ کو ان کی شکل میں، ان کے اخلاق میں، ان کے آداب میں ڈھال کے لاؤ۔ اب جتنا کوئی شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اعمال، اخلاق، آداب میں آپ کی مشابہت کرے گا، اتنا ہی انسان کامل ہوگا، اور اتنا ہی اللہ تعالیٰ کے ہاں محبوب ہوگا، اور جتنا اس معاملے میں کسی کے اندر نقص ہوگا اتنا ہی وہ ناقص رہے گا۔ قرآن کریم میں ہے:

”قُلۡ اِنۡ كُنۡتُمۡ تُحِبُّوۡنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوۡنِىۡ يُحۡبِبۡكُمُ اللّٰهُ......“ (آل عمران:۳۱)

ترجمہ:......”کہہ دیجئے کہ اگر تم اللہ تعالیٰ سے محبت کا دعویٰ کرتے ہو تو پھر میرے پیچھے پیچھے آجاؤ، میری پیروی کرو جیسے جیسے میں کرتا ہوں تم بھی ویسے ہی کرو، تم میری نقل کروگے تو اللہ تعالیٰ کے محبوب بن جاؤ گے، اللہ تعالیٰ تم سے محبت فرمائیں گے۔“

تم تو چلے تھے اللہ تعالیٰ کا محبّ بننے کے لئے، اللہ تعالیٰ سے محبت کرنے کے لئے لیکن جو دولت ہاتھ آئے گی وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے محبوب بن جاؤ گے، اللہ تعالیٰ تم سے محبت فرمائیں گے۔

فطری استعداد کے لئے تربیت کی ضرورت:

خلاصہ یہ ہے کہ فطری طور پر انسان میں اللہ تعالیٰ نے آداب و اخلاق کی استعداد رکھی ہے، اور اس استعداد کے لئے تربیت کی ضرورت ہے، بغیر تربیت کے یہ

استعداد کامل نہیں ہوگی، فائدہ کچھ نہیں ہوگا، کھجور کی گٹھلی کو اگر زمین میں دبا دو گے تو درخت نکل آئے گا، اور اگر زمین کے اوپر سو سال بھی پڑی رہی تو وہ گٹھلی کی گٹھلی رہے گی، تو جو استعداد اللہ تعالیٰ نے انسان کے اندر آدمی بننے کی اور انسانیت کے اخلاق و استعداد کی رکھی ہے، اس کے لئے ضرورت ہے تربیت کی اور تربیت کے طریقے مختلف ہیں، کچھ طریقے اس استعداد کو بگاڑنے والے ہیں اور کچھ طریقے اس استعداد کو سنوارنے والے ہیں۔ حضرات انبیائے کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام اور بالخصوص ہمارے آقا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم انسانیت کے معلّم بن کر آئے ہیں۔

ہماری غلط فہمی:

ہم لوگوں کو غلط فہمی ہے یا ہمارے دلوں میں غلط فہمی ڈال دی گئی ہے کہ انبیائے کرام علیہم السلام صرف نماز، روزہ سکھانے کے لئے آتے ہیں، یہ بھی ٹھیک ہے، نماز، روزہ بھی سکھاتے ہیں، لیکن اگر آپ مجھ کو معاف کریں تو میں کہوں گا کہ ہگنا موتنا، پیشاب اور دوسری چیزوں کے بارے میں بھی سکھاتے ہیں، یہ بے ادبی کا لفظ بول رہا ہوں، ان کی تعلیم کے بغیر آپ کو یہ بات بھی نہیں آسکتی۔

صحیح مسلم میں حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے کہ:

”عَنْ سَلْمَانَ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ قَالَ: قِیْلَ لَہٗ قَدْ عَلَّمَکُمْ نَبِیُّکُمْ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ کُلَّ شَیْءٍ حَتَّی الْخِرَاءَۃَ۔ قَالَ: فَقَالَ: اَجَلْ! لَقَدْ نَھَانَا اَنْ نَّسْتَقْبِلَ الْقِبْلَۃَ لِغَائِطٍ اَوْ بُوْلٍ وَاَنْ نَّسْتَنْجِیَ بِالْیَمِیْنِ اَوْ اَنْ نَّسْتَنْجِیَ بِاَقَلَّ مِنْ ثَلَاثَۃِ اَحْجَارٍ ..... الخ۔“ (صحیح مسلم ج:۱ ص:۱۳۰)

ایک یہودی نے ان سے کہا کہ تمہارا نبی تم کو ہر چیز سکھاتا ہے، حتیٰ کہ ہگنا موتنا بھی سکھاتا ہے، یعنی پیشاب پاخانہ کے بھی آداب سکھاتے ہیں، حضرت سلمان

فارسی رضی اللہ عنہ نے اس کے جواب میں فرمایا: جی ہاں! ٹھیک کہتے ہو، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں منع فرمایا ہے کہ پاخانے پیشاب کے لئے بیٹھو تو قبلہ کی طرف منہ نہ کرو، اور دائیں ہاتھ سے استنجا نہ کرو، تین ڈھیلے استعمال کیا کرو وغیرہ وغیرہ۔

نبی کی تربیت کا کمال:

علماء فرماتے ہیں کہ اس یہودی کا اشارہ یا تو نعوذ باللہ! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر اعتراض کرنا تھا، یا مسلمانوں پر اعتراض کرنا مقصود تھا۔ مسلمانوں پر اعتراض کرنا مقصود ہو تو اس کی تقریر یہ تھی کہ تم ایسے بدھو ہو کہ تمہیں پیشاب پاخانہ سکھانے کی ضرورت پیش آتی ہے کہ اس طرح پیشاب کے لئے بیٹھا کرو، اس طرح استنجا کیا کرو، تم کو آج تک یہ بات بھی نہیں آئی تھی، یہ بھی نبی سے سیکھنے کی ضرورت تھی تو جواب کا خلاصہ یہ ہوگا کہ ہاں ٹھیک کہتے ہو، ہمیں نہیں آتا تھا، ہم نے سیکھ لیا اور تم جہل مرکب میں مبتلا رہے، تم کو ابھی تک نہیں آیا، کیونکہ تم نے سیکھا ہی نہیں اور تم کو آیا ہی نہیں۔
اور اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں گفتگو ہو تو اس کے اعتراض کی تقریر یہ ہوگی کہ نبی کا کام تو اونچی باتیں بتانا ہوتا ہے، معرفت کی باتیں بتائے، تعلق مع اللہ کی باتیں بتائے، جنت اور دوزخ کی باتیں بتائے، اونچے علوم جو انسانی عقل سے ماوراء ہیں ان باتوں کو بتائے، یہ چھوٹی چھوٹی چیزوں کی تعلیم دینا یہ نبی کا کام نہیں ہوتا، یہ کیسا نبی ہے جو چھوٹی چھوٹی باتوں کی تعلیم دیتا ہے، حتیٰ کہ پیشاب پاخانہ، ہگنا موتنا بھی سکھاتا ہے؟ حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ نے جواب دیا کہ ہاں! ٹھیک کہتے ہو، نبی کا کمال یہ ہے کہ نبی چھوٹی چھوٹی باتوں کی ایسی تعلیم دیتا ہے کہ یہ بھی معرفت الٰہی کا ذریعہ بن جاتی ہیں اور قرب الی اللہ کا ذریعہ بن جاتی ہیں۔

چھوٹی سی سنت پر عمل مدارس کی تعمیر ایسے بڑے عمل سے افضل ہے:

ہمارے حضرت شاہ عبدالغنی محدث دہلوی رحمہ اللہ ''ابن ماجہ'' کے حاشیہ

(ابن ماجہ حدیث شریف کی کتاب ہے اس) میں شروع کے دوسرے صفحے پر حدیث آئی ہے: ”ہر بدعت گمراہی ہے۔“ اس کے نیچے لکھتے ہیں کہ بدعت بعض ایسی ہوتی ہیں کہ جو کسی دین کے کام کا ذریعہ ہیں ان کو گمراہی نہیں کہا جاتا، جیسے مدرسہ بنانا، کتابیں لکھنا، ظاہر بات ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں یہ چیزیں نہیں تھیں، لیکن مقصود چونکہ اس سے تعلیم ہے اور تعلیم شریعت کے مقاصد میں سے ہے اور یہ چیزیں ذریعہ ہیں، اس لئے ان کو بدعت نہیں کہا جائے گا، بلکہ اس کو ”بدعت حسنہ“ کہیں گے۔ بدعت ضلالت نہیں، بلکہ بدعت حسنہ کہا جائے گا۔ اس کے بعد حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ علماً کا اتفاق ہے اس بات پر کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کو اختیار کرنا بڑی سے بڑی بدعت حسنہ سے افضل ہے، حتیٰ کہ استنجا خانہ میں جاتے ہوئے بایاں قدم پہلے رکھنا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم ہے استنجا خانہ میں جاؤ تو بایاں قدم پہلے رکھو اور جب نکلو تو دایاں قدم پہلے نکالو۔ مسجد میں آؤ تو دایاں قدم پہلے داخل کرو اور باہر جاؤ تو بایاں قدم پہلے نکالو۔ گھر میں آؤ تو دایاں قدم پہلے رکھو اور گھر سے نکلو تو بایاں قدم پہلے نکالو۔ تو شاہ صاحب رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ بیت الخلاء میں اتباع سنت کی نیت سے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کی پیروی کی نیت سے بایاں قدم استنجا خانہ میں پہلے رکھنا یہ مدارس کے بنانے سے افضل ہے۔

تربیت میں نبی بمنزلہ باپ کے ہے:

تو میں گفتگو اس پر کر رہا تھا کہ ہمارے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تو ہر چیز ہمیں سکھائی ہے۔ ایک حدیث میں فرمایا:

”اِنَّمَا اَنَا لَکُمْ بِمَنْزِلَةِ الْوَالِدِ ....“

(ابوداؤد ج:۱ ص:۳)

ترجمہ:......”میری مثال ایسی ہے جیسے کوئی بیٹے کے

لئے باپ ہوتا ہے۔‘‘

نادان بچے کو باپ ہر چیز سکھاتا ہے کہ بیٹا ایسے کیا کرتے ہیں، ایسے کیا کرتے ہیں، نہایت شفقت کے ساتھ، نہایت محبت کے ساتھ اس کو سکھاتا ہے، آداب کی تعلیم اس کو دیتا ہے، فرمایا: میں تمہارے لئے بمنزل باپ کے ہوں۔ زندگی کی تمام چیزیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں سکھائی ہیں، اور سکھائی بھی نہایت شفیقانہ انداز سے، جس طرح کہ باپ بیٹے کو سکھاتا ہے، صرف نماز، روزہ نہیں، بلکہ شریعت کے تمام آداب، زندگی کے تمام آداب، کھانے کے آداب، پینے کے آداب، لیٹنے اور چلنے پھرنے کے آداب، نہایت شفیقانہ انداز کے ساتھ ہمیں سکھائے، جیسے باپ اپنے بیٹے کو سکھاتا ہے، تو صرف نماز، روزہ نہیں، بلکہ شریعت کے تمام آداب، زندگی کے تمام آداب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں سکھائے ہیں، سعادت مند ہیں وہ لوگ جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ادب سیکھیں اور بہت ہی بدنصیب ہیں وہ لوگ جن کو اتنا بڑا معلّم اللہ تعالیٰ نے عطا فرمایا ہو اور وہ اس سے استفادہ نہ کریں، مغرب کی طرف دیکھتے ہیں، یورپ کی طرف دیکھتے ہیں۔

ایک کفن چور کا عجیب قصہ:

ایک کفن چور کہنے لگا: حضرت جی! میں کیا بتاؤں، عجیب بات تو یہ دیکھی کہ مسلمان مردوں کو دفن کرکے آتے ہیں اور منہ قبلہ کی طرف کرکے آتے ہیں، لیکن جب میں کفن چرانے کے لئے جاتا تھا تو سب کا منہ قبلے کی طرف سے ہٹا ہوا ہوتا تھا، سوائے چند افراد کے، میں نے سب کا منہ قبلے سے ہٹا ہوا پایا اور مجھے اس پر بڑا تعجب ہوا کہ منہ ہٹ کیسے جاتا ہے؟ اور کیوں ہٹ جاتا ہے؟

قبر میں قبلہ سے منہ ہٹ جانے کا سبب؟

وہ بزرگ فرمانے لگے کہ بھائی! بالکل ہٹنا چاہیئے، اس لئے کہ زندگی کا قبلہ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ہے، تمہاری زندگی کا قبلہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ہے، قبر میں منہ قبلے کی طرف ان لوگوں کا رہتا ہے جن کا منہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کی طرف ہو اور جن لوگوں نے قبلہ اپنا بنالیا ہو، کسی نے روس والوں کو قبلہ بنالیا، ان کا جھنڈہ لے کر پھرتے ہیں، کسی نے مغرب کو اپنا قبلہ بنالیا ان کی سنتوں پر عمل کر رہے ہیں، یہ چاہتے ہیں کہ قبر میں ان کا منہ قبلہ کی طرف رہے، انہوں نے زندگی بھر منہ قبلہ کی طرف نہیں کیا تو مرنے کے بعد ان کا منہ قبلے کی طرف کیسے رہے گا؟ العیاذ باللہ!

تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کو اپنا قبلہ بناؤ اور آنخضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جن اخلاق کی، جن اعمال کی، جن آداب کی ہدایت فرمائی ہے، تعلیم فرمائی ہے ان کو اپناؤ، اللہ تعالیٰ کے محبوب بن جاؤ گے، اللہ تعالیٰ ہم سب کو توفیق عطا فرمائے، آمین!

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

قلوب کی اقسام

حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ یہ فرما کر فرماتے ہیں کہ اگر کوئی شخص یہ دیکھنا چاہے کہ آیا اس کے دل نے فتنوں کو قبول کیا ہے یا نہیں؟ اس کا ایک طریقہ بتا دیتے ہیں، (بڑا خوفناک ہے، ڈرنے کی چیز ہے) وہ یہ دیکھ لے کہ پہلے ایک چیز حلال سمجھتا تھا، اب اس کو حرام سمجھنے لگا، پہلے ایک چیز کو حرام سمجھتا تھا اور اب حلال سمجھنے لگا، یہ علامت ہے اس بات کی کہ فتنہ اس کے دل کے اندر گھس گیا ہے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم
الحمد للہ وسلام علی عبادہ الذین اصطفی!

الف:......”عَنْ حُذَیْفَةَ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْهُ قَالَ: اَلْقُلُوْبُ اَرْبَعَةٌ: قَلْبٌ اَغْلَفُ فَذَالِکَ قَلْبُ الْکَافِرِ، وَقَلْبٌ مَصَفَّحٌ فَذَالِکَ قَلْبُ الْمُنَافِقِ، وَقَلْبٌ اَجْرَدُ فِیْهِ سِرَاجٌ یَزْهَرُ فَذَاکَ قَلْبُ الْمُؤْمِنِ، وَقَلْبٌ فِیْهِ نِفَاقٌ وَاِیْمَانٌ، فَمَثَلُ الْاِیْمَانِ کَمَثَلِ شَجَرَةٍ یَمُدُّهَا مَاءٌ طَیِّبٌ، وَمَثَلُ النِّفَاقِ مَثَلُ قَرْحَةٍ یَمُدُّهَا قَیْحٌ وَدَمٌ فَاَیُّهُمَا غَلَبَ عَلَیْهِ غَلَبَ۔“ (حلیۃ الاولیاً ج:۱ ص:۲۷۶)

ب:......”عَنْ حُذَیْفَةَ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْهُ قَالَ: اِنَّ الْفِتْنَةَ تُعْرِضُ عَلَی الْقُلُوْبِ، فَاَیُّ قَلْبٍ اَشْرَبَهَا نُکِتَتْ فِیْهِ نُکْتَةٌ سَوْدَآءُ، فَاِنْ اَنْکَرَهَا نُکِتَتْ فِیْهِ نُکْتَةٌ بَیْضَاءُ، فَمَنْ اَحَبَّ مِنْکُمْ اَنْ یَّعْلَمَ اَصَابَتْهُ الْفِتْنَةُ اَمْ لَا؟ فَلْیَنْظُرْ فَاِنْ کَانَ یَرٰی حَرَامًا کَانَ یَرَاهُ حَلَالًا، اَوْ یَرٰی حَلَالًا مَا کَانَ یَرَاهُ حَرَامًا فَقَدْ اَصَابَتْهُ الْفِتْنَةُ۔“ (حلیۃ الاولیاً ج:۱ ص:۲۷۲)

ج:......"عَنْ حُذَيْفَةَ رَضِىَ اللهُ عَنْهُ قَالَ: اِيَّاكُمْ وَالْفِتَنَ! لَا يَشْخَصُ اِلَيْهَا اَحَدٌ فَوَاللهِ! مَا شَخَصَ فِيْهَا اَحَدٌ اِلَّا نَسَفَتْهُ كَمَا يَنْسِفُ السَّيْلُ الدِّمَنُ انها مُشْبِهَةٌ مُقْبِلَةً حَتّٰى يَقُوْلُ الْجَاهِلُ هٰذِهٖ تَشَبُّهٌ وَتَبَيُّنٌ مُدْبِرَةٌ فَاِذَا رَأَيْتُمُوْهَا فَاجْثِمُوْا فِىْ بُيُوْتِكُمْ وَكَسِّرُوْا سُيُوْفَكُمْ وَقَطِّعُوْا اَوْتَارَكُمْ۔" (حلیۃ الاولیاً ج:۱ ص:۲۷۳)

الف:......ترجمہ:......"امام ابونعیمؒ نے حلیۃ میں حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا کہ: قلوب چار قسم کے ہیں:

۱:......بعض دل تو وہ ہیں جو پردہ میں لپٹے ہوئے ہیں، یہ کافر کا دل ہے۔

۲:......اور ایک دل وہ ہے جو کہ دو رُخ پر ہے، یہ منافقت کا دل ہے۔

۳:......اور ایک دل ہے جو برہنہ ہے، اس میں چراغ ہے تو جل رہا ہے، یہ مؤمن کا دل ہے۔

۴:......اور ایک قلب وہ ہے جس میں نفاق بھی ہے اور ایمان بھی ہے۔

ایمان کی مثال تو اس درخت جیسی ہے جس کو عمدہ پانی پہنچتا ہے، اور نفاق کی مثال اس پھنچھی کی ہے کہ اس کو پیپ اور لہو پہنچتا ہے، ان میں سے جو غالب آجائے گا، پس وہ غالب آجائے گا۔"

ب:......ترجمہ:......’’حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کا یہ بھی ارشاد ہے کہ فتنے قلوب کے سامنے پیش کئے جاتے ہیں، بس جس دل نے اس کو جذب کرلیا اس میں سیاہ نکتہ لگادیا جائے گا اور اگر اس نے انکار کردیا تو سفید نکتہ لگادیا جائے گا۔ اور جو شخص یہ چاہتا ہو کہ یہ جان لے کہ اس کو فتنہ پہنچا ہے یا نہیں؟ وہ یہ دیکھ لے کہ اگر وہ کسی حلال چیز کو حرام دیکھے، جس کو پہلے وہ حرام نہیں سمجھتا تھا، یا کسی حرام کو حلال دیکھے جس کو وہ حلال نہیں سمجھتا تھا تو سمجھے کہ اس کو فتنہ پہنچ چکا ہے۔‘‘

ج:......ترجمہ:......’’امام ابونعیمؒ نے حلیہ میں حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کا ارشاد نقل کیا ہے کہ: فتنوں سے بچا کرو، کوئی شخص فتنوں کی طرف نہ جائے، پس اللہ کی قسم! جو شخص ان میں کھڑا ہوگا اس کو اسی طرح اڑادیں گے جیسے کہ سیلاب نرم زمین کو اڑادیتا ہے، ان کا پتا نہیں چلتا، جاہل آدمی کہتا ہے کہ یہ (فتنے) واپس جارہے ہیں، حالانکہ وہ واپس نہیں جارہے ہوتے، بلکہ وہ آرہے ہوتے ہیں، اور جب تم ان کو دیکھو تو اپنے گھروں میں جم کے بیٹھ جاؤ، اپنی تلواریں توڑدو اور کمانوں کے تان کاٹ دو۔‘‘

یہ حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کے ارشادات تھے۔ پہلے فقرہ میں یا پہلی روایت میں فرمایا کہ: قلوب کی چار قسمیں ہیں۔ ایک تو وہ دل ہیں جو پردہ میں لپٹے ہوئے ہیں، یہ کافر کا دل ہے، قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے یہود کا قول نقل کیا ہے کہ:

’’وَقَالُوا قُلُوبُنَا غُلْفٌ بَلْ لَّعَنَهُمُ اللّٰهُ بِكُفْرِهِمْ۔‘‘

(البقرہ:۸۸)

ترجمہ:...... ''اور انہوں نے کہا کہ ہمارے دل غلافوں میں لپٹے ہوئے ہیں، نہیں بلکہ اللہ نے ان پر لعنت کی ہے، ان کے کفر کی وجہ سے۔''

یہود کے دل غلاف صلابت میں ہیں:

بھائی! یہود جو یہ کہتے ہیں کہ ہمارے دل غلاف میں لپٹے ہوئے ہیں، ان کا مطلب یہ تھا کہ تم ہمیں جتنا چاہو سمجھاتے رہو، ہم پر تمہارے وعظ ونصیحت کا اثر نہ ہوگا، ہمارے دل پردے میں ہیں، یہود یہ بات فخریہ کہا کرتے تھے کہ تمہارا وعظ و نصیحت کرنا ہم پر اثر انداز نہ ہوگا، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ: نہیں بلکہ اللہ نے ان کے اس کفر کی وجہ سے ان پر لعنت کی ہے، ان کو کتنا ہی سمجھاؤ، مگر وہ نہ سمجھیں گے، جیسا کہ ایک چیز پردہ میں محفوظ ہوتی ہے اس پر کسی چیز کا اثر نہیں ہوتا ہے، اسی طرح کافر کا دل بھی پردہ میں ہے جو متأثر نہیں ہوتا، ورنہ آدمی کسی وقت کچھ تو سوچتا ہے کہ بھائی یہ جو بات کہہ رہا ہے، آیا یہ صحیح بھی ہے یا غلط ہے؟ غلط وصحیح کی تحقیق کرتا ہے، اس کے بارے میں پوچھ گچھ کرتا ہے۔

مرزائی اس پر فخر کیا کرتے ہیں کہ ہمارے آدمی بڑے پکے ہیں، ان پر اثر نہیں ہوتا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ جی ہاں! واقعی بڑے پکے ہیں، ان پر اثر ہی نہیں ہوتا ہے اس لئے کہ صلاحیت ہی موقوف ہوچکی ہے، ممکن ہی نہیں کہ اثر ہو۔

منافق دورُخا ہوتا ہے:

دوسری قسم جو دورُخہ دل ہوتا ہے، کبھی اِدھر کو ہوگیا، کبھی اُدھر کو ہوگیا، یہ منافق کا دل ہے، اس بے چارے کو رسّی ہاتھ میں نہیں آئی، جو جی میں اچھا لگا، اس کے پیچھے چل پڑا، اور جو چیز مطلب کے مطابق ہوئی، اس کو اختیار کرلیا۔

مسلمان کا دل صاف اور ننگا ہوتا ہے:

تیسرا دل اجرد ہے، بے لباس، بالکل ننگا اور اس میں چراغ چمک رہا ہے، یہ مؤمن کا دل ہے۔

خواب میں ننگا دیکھنا:

حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا مہاجر مدنی نور اللہ مرقدہٗ سے کسی شخص نے کہا کہ میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ آپ بالکل ننگے ہیں۔ فرمایا: اللہ تعالیٰ نصیب فرمائے، اس لئے کہ کسی شخص کا ننگا ہونا اس کی تعبیر یہ ہے کہ تمام آلات اس کے ختم ہوگئے۔ تنہا، مجرد۔

مجھے بھی بہت سے آدمیوں نے خط لکھا کہ آپ کو بالکل ننگا دیکھا، میں نے کہا کہ اللہ نصیب فرمائے، یہ دولت ہمیں نصیب ہوجائے تو پھر کیا بات ہے۔ یہ لباس تو ہم نے مخلوق سے چھپانے کے لئے پہنا ہوا ہے، ورنہ ماں کے پیٹ سے تو بچہ ننگا ہی پیدا ہوتا ہے، اور قبر میں جاتا ہے تو حیاء کے طور پر اس کو کپڑوں میں لپیٹ دیتے ہیں، ورنہ اندر ننگا ہی ہوتا ہے، تو مؤمن کے دل کی خصوصیت یہ ہے کہ بالکل اجرد، سامنے کوئی پردہ نہیں ہے، تمام مسائل اس کے سامنے عکس پذیر ہوتے ہیں، ہر چیز اپنی اصلی حالت میں اس کے سامنے آتی ہے، سیاہ ہے تو سیاہ نظر آئے گا، سفید ہے تو سفید نظر آئے گا، اچھا ہے تو اچھا نظر آئے گا اور برا ہے تو برا نظر آئے گا، ایک تو اس کی یہ خصوصیت، دوسری خصوصیت یہ ہے کہ: ”فِيهِ سِرَاجٌ يَّذْهَرُ“ اس میں ایک چراغ ہوتا ہے چمکتا ہوا، جس طرح کہ آفتاب چمک رہا ہے، لطف یہ ہے کہ اس کا رخ نہیں، کوئی رخ نہیں آفتاب کا کہ فلاں طرف اس کا منہ ہے اور فلاں طرف اس کی پیٹھ ہے، چمک رہا ہے اور اس کی روشنی چاروں طرف پھیل رہی ہے، اسی لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ”سِرَاجًا مُّنِيرًا“ فرمایا ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مثال آفتاب کی

ہے، ہر طرف روشنی ہی روشنی آرہی ہے، یہ نہیں کہ اس طرف منہ ہے تو اسی طرف روشنی جائے، اس طرف روشنی نہ جائے۔ نہیں، یہ نہیں، بلکہ حضور علیہ السلام کا آفتاب نبوت ہر طرف چمک رہا ہے، اور یہ ہی مثال ہے قلب مؤمن کی کہ مؤمن کے قلب میں ایک چراغ ہوتا ہے چمکتا ہوا، ہر طرف چمکتا ہے، اللہ تعالیٰ ہمیں یہ دولت نصیب فرمائے، آمین! اس لئے کہ اس چراغ سے سیاہ سیاہ نظر آنے لگتا ہے اور سفید سفید نظر آتا ہے، ہر چیز اپنے اصلی رنگ میں نظر آتی ہے، اور یہ بہت بڑی دولت ہے۔

ایمان و نفاق ملا دل:

اور ایک قلب وہ ہے کہ اس میں ایمان بھی ہے، نفاق بھی ہے، کبھی ایمان پر آجاتا ہے، کبھی نفاق پر، خالص نہیں۔ پہلا خالص کافر تھا، دوسرا خالص منافق تھا، تیسرا خالص مؤمن تھا اور یہ چوتھا ہے کہ اس میں ایمان بھی ہے اور نفاق بھی ہے، کبھی وہ غالب آجاتا ہے اور کبھی وہ، اس میں جو ایمان ہے اس کی مثال ایسی ہے جیسا کہ ایک درخت ہے، فرض کرو انار کا درخت ہے، بہت عمدہ پانی، آب و ہوا اور اچھی زمین اس کی مدد کرتی ہے، اس لئے اس پر پھل آتا ہے، لیکن ساتھ کے ساتھ کیڑا بھی لگ جاتا ہے، نفاق کی وجہ سے اس کی ایسی حالت ہوجاتی ہے کہ گویا اس میں پھوڑا ہو، اس سے پیپ اور کچ لہو بہتا رہتا ہے، بس ان میں سے جو چیز غالب آجائے گی، وہ اپنا اثر کر ڈالے گی، اگر ایسا دل ہے جس میں ایمان بھی ہے، نفاق بھی ہے تو اگر ایمان غالب آگیا اور اللہ کرے اس پر خاتمہ ہوگیا تو بیڑا پار اور اگر نفاق کا غلبہ ہوا تو اللہ تعالیٰ پناہ میں رکھے۔

دوسری حدیث میں حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ فتنے قلوب پر پیش کئے جاتے ہیں۔ صحیح مسلم میں حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے کہ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بات ارشاد فرمائی:

"تُعْرَضُ الْفِتَنُ عَلَى الْقُلُوْبِ كَالْحَصِيْرِ عُوْدًا عُوْدًا فَاَىُّ قَلْبٍ اُشْرِبَهَا نُكِتَتْ فِيْهِ نُكْتَةٌ سَوْدَاءُ، وَاَىُّ قَلْبٍ اَنْكَرَهَا نُكِتَتْ فِيْهِ نُكْتَةٌ بَيْضَاءُ حَتّٰى تَصِيْرَ عَلٰى قَلْبَيْنِ .....الخ۔" (مسلم ج:۱ ص:۸۲)

ترجمہ:...... "فتنے قلوب کے سامنے پیش کئے جاتے ہیں، جیسا کہ چٹائی پر ایک ایک تنکا پیش کیا جاتا ہے (چٹائی بنتے ہوئے یا کپڑا بنتے ہوئے ایک ایک تان ایک ایک تار اس میں لگائی جاتی ہے، بوریا بنتے ہیں تو اس میں ایک ایک تان لگائی جاتی ہے اور چٹائی بنتے ہیں تو چٹائی کے اندر بھی ایک ایک تنکا لگایا جاتا ہے، تو مطلب یہ ہے کہ فتنوں کی لائن میں سے ایک ایک فتنہ دلوں پر پیش کیا جاتا ہے کہ اس کو قبول کرتے ہو کہ نہیں) اب دو قسموں کے دل ہوں گے، پس جو دل ایسا ہو کہ اس نے ان فتنوں کو قبول کرلیا اور وہ اس کے اندر رچ بس گئے، اس میں ایک سیاہ نکتہ لگادیا جاتا ہے، جس دل نے اس کا انکار کردیا اس میں ایک سفید لکیر لگادی جاتی ہے، یہاں تک کہ تمام دل دو حصوں پر تقسیم ہوجاتے ہیں، ایک سفید لکیر لگتی گئی تو سفید ہوگیا، دل ابیض (سفید سنگ مرمر کی طرح) اور دوسری اسود (کالا بھجنگ کوے کی طرح سیاہ) اس میں ہدایت کی کوئی بات نہیں آتی سوائے اس کے جو اس کے قلب میں پہلے سے موجود ہو۔"

پہلی مثال مؤمن دل کی ہے، اس میں سوائے نیکی اور اچھائی کے کوئی چیز اثر نہیں کرتی، اور دوسری مثال ہے سیاہ دل کی کہ سوائے گندگی اور برائی کے کوئی چیز اس

کے اندر اثر نہیں کرتی، اس حدیث میں حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ: فتنے دلوں کے سامنے پیش کیے جاتے ہیں تو اب قلوب ان فتنوں کو قبول کریں گے یا ان کا انکار کردیں گے، جس دل نے ان فتنوں کو قبول کرلیا، اس میں سیاہ لکیر ڈال دی جائے گی اور جس دل نے ان فتنوں کو قبول نہیں کیا، ان کا انکار کیا، ان میں ہر فتنہ کے مقابلہ میں ایک سفید دھاری ڈال دی جائے گی، اس کا نتیجہ وہی ہے جو میں نے ذکر کیا، یہاں تک کہ دو قسمیں ہوجائیں گی، سیاہ وسفید۔

دل کے فتنہ قبول کرنے کی علامت:

حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ یہ فرما کر فرماتے ہیں کہ اگر کوئی شخص یہ دیکھنا چاہے کہ آیا اس کے دل نے فتنوں کو قبول کیا ہے یا نہیں؟ اس کا ایک طریقہ بتادیتے ہیں، (بڑا خوفناک ہے، ڈرنے کی چیز ہے) وہ یہ دیکھ لے کہ پہلے ایک چیز حلال سمجھتا تھا، اب اس کو حرام سمجھنے لگا، پہلے ایک چیز کو حرام سمجھتا تھا اور اب حلال سمجھنے لگا، یہ علامت ہے اس بات کی کہ فتنہ اس کے دل کے اندر گھس گیا ہے، اپنے کو تو یہ بات سمجھ میں نہ آئی، اپنے کو تو کوئی پلے نہیں پڑا کہ پہلے ایک چیز کو حلال سمجھتا تھا اور اب حرام سمجھنے لگا یا پہلے ایک چیز کو حرام سمجھتا تھا، اب حلال سمجھنے لگا، حلال کو حرام اور حرام کو حلال سمجھنے لگا، یہ علامت ہے ماؤف دل کی۔

دل میں فتنہ کی مثالیں:

اس کی مثال میں بیان کرتا ہوں، میرے شیخ حضرت مولانا سید محمد یوسف بنوری رحمہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرمایا کرتے تھے کہ: جوانی کے زمانے میں جن گناہوں کا وسوسہ تک نہیں آتا تھا، اب دل میں ان کا تصور آتا ہے۔

ہمارے شیخ نور اللہ مرقدہٗ نے ایک واقعہ لکھا ہے کہ ایک بادشاہ تھا، اس کی ایک ملاح (کشتی بان) کے ساتھ دوستی تھی، وہ بادشاہ فوت ہوگیا، اس کا لڑکا تخت پر

بیٹھا، اس نے بڑے بڑے کارنامے انجام دیئے، بعض ایسے کام کیئے جو اس کے باپ نے بھی نہیں کیئے تھے، کچھ عرصہ کے بعد اپنے باپ کے دوست بوڑھے ملاح کو کہتا ہے کہ: آپ بتلائیں میرا زمانہ اچھا ہے یا میرے باپ کا زمانہ اچھا تھا؟ ملاح کہنے لگا: حضور! میں کیا کہہ سکتا ہوں، تمہارا زمانہ اچھا ہے یا تمہارے باپ کا زمانہ اچھا تھا، لیکن ایک بات بتلا دیتا ہوں، اسی سے آپ اندازہ کرلینا کہ کون سا زمانہ اچھا تھا؟

رات کے وقت میری کشتی میں ایک مسافر سوار ہوا تھا اور لوگ بھی ہوں گے، وہ مسافر اپنی ہمیانی بھول گیا یعنی روپیہ کی پیٹی، لوگ اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے اور وہ ہمیانی میری کشتی میں پڑی رہی، میں نے اس کو کندھے پر ڈالا، گھر لاکر اپنی ایک کوٹھری میں رکھ دیا، (ہمارے دیہات میں کچی دیواروں کی ایک کوٹھی ہوتی ہے یعنی چھوٹا سا بنایا ہوا حجرہ اس میں لوگ چیزیں رکھ دیتے ہیں)، کوئی ایک سال کے بعد وہ آیا اور کہنے لگا کہ: یار میں تمہاری کشتی میں ایک پیٹی بھول گیا تھا، میں نے کہا کہ وہ موجود ہے، میں اس کو گھر لے آیا اور بچوں سے کہا کہ وہ نکالو، کہاں ہے؟ وہ مٹی کے پیچھے پھینکی ہوئی تھی، اس طرح وہ نکالی تو کچھ اس پر جالے والے لگے ہوئے تھے، وہ تھیلی نکال کر اس کے سامنے رکھ دی، میں نے کہا کہ دیکھ لیجئے کہ یہ آپ ہی کی ہے؟ اس نے کہا کہ: ہاں میری ہے، اس میں کوئی ہزار روپیہ تھا یا کتنا تھا، نکال کر مجھے اس نے دس روپے یا بیس روپے یا سو روپے دینا چاہا، میں نے کہا کہ شرم کرنی چاہیئے، اگر مجھے اس کے پیسے لینے ہوتے تو کیا میں اس کو سنبھال کر رکھتا؟ ٹھکانے نہ لگا دیتا، ہرچند اس نے پیسے دینے کی کوشش کی، لیکن میں نے قبول نہیں کیا، یہ تو تمہارے باپ کا زمانہ تھا، اب تمہارا زمانہ آیا تو مجھے بار بار خیال آتا ہے کہ تجھ سے زیادہ بڑا بے وقوف کون ہوگا، وہ مسافر سال کے بعد اپنی ہمیانی لینے کے لئے آیا تھا، کوئی اس کے پاس گواہ نہیں تھا، کوئی اس نے شناخت اور پہچان نہیں بتائی تھی، اس نے تو کہا کہ میں پیٹی بھول گیا ہوں، تم نے کہا کہ ہاں موجود ہے، تم انکار کر دیتے اور پیسہ خود رکھ لیتے،

پھر اس زمانہ میں وہ مجھے پیسے دینا چاہتا تھا، میں نے نہیں لئے اور اب تمہارا دور جو آیا ہے، حالانکہ مجھے معلوم نہیں کہ وہ کون آدمی تھا کون نہیں تھا؟ اس کی رقم کتنی تھی؟ لیکن میرے دل میں اب یہ وسوسہ آتا ہے، اب تم بہتر جانو کہ تمہارے باپ کا زمانہ اچھا تھا یا تمہارا زمانہ اچھا ہے؟

یہ میں نے دو مثالیں آپ کو بتادی ہیں، خود ہمارے ساتھ بھی یہ قصے پیش آئے ہیں، اب تو قبر کی تیاری ہے، لیکن پہلے بہت سی چیزوں سے بچتے تھے، لیکن اب ان کو کرتے ہیں، لیکن اللہ کا شکر ہے کہ حرام کا ارتکاب نہیں کرتے، وساوس کے درجہ میں یہ چیزیں ہیں، لیکن مقام شکر ہے کہ حرام کا ارتکاب نہیں کرتے۔ حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اگر کوئی شخص یہ دیکھنا چاہتا ہو کہ اس کا دل فتنوں میں مبتلا ہوا ہے یا نہیں؟ وہ یہ دیکھ لے کہ پہلے ایک چیز کو حلال سمجھتا تھا، اب حرام سمجھنے لگا ہے یا پہلے ایک چیز کو حرام سمجھتا تھا، اب اس کو حلال سمجھنے لگا ہے، شریعت کے خلاف، تو سمجھے کہ یہ شخص مبتلا فتنہ ہو چکا ہے۔

آدمی بدلتا رہتا ہے:

آدمی کچھ ایسا واقع ہوا ہے کہ اس میں تبدیلی آتی رہتی ہے، یہ گھڑی چلتی ہے ناں! جس طرح ہمہ دم رفتار میں رہتی ہے، اسی طرح آدمی کا دل بھی بدلتا رہتا ہے، لیکن اگر اس کی رفتار ہمیشہ کفر پر رہی، ایمان پر نہیں آئی تو پھر اس کا انجام تمہیں معلوم ہے، اور اگر ایمان پر اس کی رفتار رہی کفر پر نہیں گئی تو اس کا انجام بھی معلوم ہے۔

اپنے جائزہ کی ضرورت:

ایک آدمی نے بیس سال تک زندگی گزاری، کبھی اللہ کے بندے سوچ کر تو دیکھ لیتے کہ میری حالت میں کچھ تغیر بھی پیدا ہوا ہے یا نہیں؟ اتنا عرصہ بزرگوں کی

خدمت میں بیٹھا ہوں، ان کی شکلیں دیکھی ہیں، ان کے چہرے پر نظر ڈالی ہے، میں نے ان سے کچھ جذب بھی کیا ہے یا نہیں؟ اخذ بھی کیا ہے یا نہیں؟ یا میری حالت وہی ہے۔ تو حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ دیکھو تو سہی تمہارے دلوں پر فتنوں نے اثر کیا ہے، سیاہ لکیریں لگادی ہیں یا سفید لکیریں لگادی ہیں؟

فتنوں سے بچنے کی ضرورت:

تیسری حدیث میں فرماتے ہیں کہ فتنوں سے بچنے کی کوشش کرو، فتنوں کا زمانہ ہے اور یہ فتنوں کا دور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے بعد شروع ہوگیا۔ میں نے گزشتہ خطبہ میں عرض کیا تھا کہ امیر المؤمنین حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے انہی حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے فرمایا تھا کہ فتنوں کا یہ بند جو تم کہتے ہو یہ توڑ دیا جائے گا؟ یا دروازہ کھول دیا جائے گا؟ تو حضرت حذیفہؓ نے فرمایا تھا کہ امیر المؤمنین! دروازہ نہیں کھولا جائے گا، بلکہ بند توڑ دیا جائے گا، اس پر آپؓ نے فرمایا تھا کہ: انا للہ وانا الیہ راجعون! اگر دروازہ کھول دیا جاتا تو زور زبردستی کے ساتھ اس کو بند کیا جاسکتا تھا، زیادہ لوگ زور لگاتے، لیکن اب جب توڑ ہی دیا گیا تو اس کی مرمت کون کرے گا؟ تو حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ کوئی شخص فتنوں کو دیکھ کر ان کے مقابلے میں سینہ تان کر کھڑا نہ ہو، بچنے کی کوشش کرے۔

فتنے بہالے جائیں گے:

ہمارے نوجوان اور نئی فوج یہ کہتی ہے کہ جی حرج کیا ہے؟ یہ چیزیں پڑھنی چاہئیں، کافر کی لکھی ہوئی ہیں، منافق کی لکھی ہوئی ہیں، بے ایمان کی لکھی ہوئی ہیں، کس کی لکھی ہوئی ہیں پرواہ نہیں، اور صحیح ہے یا غلط ہے؟ اچھا ہے یا برا ہے؟ اس کی پرواہ ہی نہیں، اپنے دل کی حفاظت کرنے کے لئے کوئی اہتمام نہیں۔ فرماتے ہیں کہ جو

شخص ان فتنوں کو دیکھ کر کھڑا ہو جائے گا، وہ فتنے اس آدمی کو اس طرح اڑا کر لے جائیں گے، جس طرح کہ نرم زمین کو سیلاب بہا کر لے جاتا ہے، کچی زمین ہوتی ناں! اس مٹی کو سیلاب بہالے جاتا ہے، یوں معلوم ہوتا ہے کہ یہ فتنے جارہے ہیں، دور جارہے ہیں، حالانکہ دور نہیں جارہے، بلکہ آرہے ہیں، جاہل سمجھتا ہے، فتنہ ٹل گیا، فتنہ ٹل نہیں گیا بلکہ فتنہ آکر دبوچ رہا ہے، حضرت فرماتے ہیں کہ اگر کوئی شخص خدانخواستہ ان فتنوں کی لپیٹ میں آجائے تو یوں کرے کہ اپنے گھر میں بیٹھ جائے، کنڈا بند کردے، پتھر مار کر تلوار کی دھار کو توڑ ڈالے اور کمان کی تان توڑ دے، مطلب یہ ہے کہ جتنا اسلحہ اس کے پاس ہے، جس کے ساتھ دوسرے کو نقصان پہنچایا جاسکتا ہے توڑ دے۔

اسلحہ مسلمانوں کے بجائے کافروں کے لئے ہو:

ہمارے یہاں کہتے ہیں کہ لائسنس لے لے، نیا اسلحہ خرید لے، اسلحہ کے مقابلہ میں اسلحہ، ٹھیک ہے بھائی اگر اس طرح تم اپنی حفاظت کرسکتے ہو تو کرو، لیکن میرے جیسا آدمی جو بے چارا اٹھ نہیں سکتا، وہ دوسرے کو اپنے ہتھیار سے نقصان کیا پہنچائے گا، ریوالور بھی رکھ لیا اور جو اب گنیں ونیں چلی ہوئی ہیں وہ بھی رکھ لیں، لیکن نتیجہ؟ اگر تمہارے ہاتھ پاؤں چلتے ہوں گے، تو لوگوں کو نقصان پہنچاؤ گے، اور اگر تمہارے ہاتھ پاؤں نہیں چلتے تو خود نقصان اٹھاؤ گے، یہ اسلحہ تو کافروں کے مارنے کے لئے ہوتا ہے بھائی! مسلمانوں کے مارنے کے لئے نہیں ہوتا، اب کافروں سے تو تم نے نجات پالی ہے، کیونکہ اب ہم کافروں کے ساتھ نہیں رہنا چاہتے، مسلمانوں کے ساتھ رہنا چاہتے ہیں، اسی لئے پچاس سال پہلے پاکستان بنایا تھا نا، سولہ یا سترہ سال تو اس وقت میری عمر تھی، اسی لئے پاکستان تم نے بنایا تھا کہ کافروں کے ساتھ ہم نہیں رہنا چاہتے، لیکن اسلحہ کی ضرورت اب کاہے کی پیش آرہی ہے؟ تو بہتر نہیں تھا

کہ تم وہیں رہتے، بتلاؤ؟ اب تمہارے گھروں میں اسلحہ کے انبار لگے ہوئے ہیں اور تم نے انسانیت کے امن کو برباد کرڈالا ہے، کہلاتے ہو مسلمان! اور قتل کرتے ہو مسلمان کو، اس کے بجائے اگر خود مرجاؤ، تو اچھا ہے برا تو نہیں ہے بھائی۔

دوسرے مسلمان کو قتل کرنے کے بجائے خود قتل ہوجانا افضل ہے:

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ:

”..... فَاِنْ دَخَلَ عَلٰی اَحَدٍ مِّنْکُمْ فَلْیَکُنْ کَخَیْرِ اِبْنَیْ اٰدَمَ۔“ (مشکوٰۃ ص:۴۶۴)

ایک صحابی نے پوچھا تھا کہ یا رسول اللہ! صاحب فتنہ، یعنی کوئی فتنہ والا آدمی مجھے قتل کرنا چاہے تو میں تو اس کو قتل نہیں کروں گا، لیکن اگر وہ مجھے قتل کرنا چاہے؟ تو فرمایا آدم علیہ السلام کے دو بیٹوں میں سے بہتر بیٹے جیسا ہوجا۔

حضرت آدم علیہ السلام کے دو بیٹے تھے، قابیل اور ہابیل۔ قابیل قاتل تھا اور ہابیل مقتول، ہابیل نے کہا تھا: بھائی میں نہیں مارتا تم کو اور تمہاری مرضی، قتل کردو مجھے۔ قتل ہوجاؤ گے، تو اللہ کے پاس پہنچ جاؤ گے، ویسے بھی پہنچنا ہی ہے ناں! ایک دو دن آگے یا پیچھے، فساد کا علاج فساد سے نہیں ہوتا، میں پہلے بھی اس کو ذکر کرچکا ہوں، فساد کا علاج اصلاح سے ہوتا ہے اسی پر ختم کرتا ہوں۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

جھگڑے کے اسباب!

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ:

”جس شخص نے حق پر ہوتے ہوئے لڑائی جھگڑے کو چھوڑ دیا تو اللہ تعالیٰ اس کو جنت کے درمیان میں محل عطا فرمائیں گے، اور جس شخص نے ناحق پر ہوتے ہوئے جھگڑا چھوڑ دیا اس کو اللہ تعالیٰ جنت کے طرف یعنی کنارے میں محل عطا فرمائیں گے۔“

بسم اللہ الرحمن الرحیم
الحمدللہ وسلام علی عبادہ الذین اصطفی!

شیخ شہاب الدین سہروردی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ صوفیا کے اخلاق میں سے ہے کہ لڑائی جھگڑے کا ترک کردینا اور غصے کو چھوڑ دینا مگر حق کے ساتھ، نرمی اور بردباری کو اختیار کرنا اور اس پر اعتماد کرنا۔

لڑائی سے نفسانیت ظاہر ہوتی ہے:

فرماتے ہیں: وجہ اس کی یہ ہے کہ لڑائی جھگڑے میں آدمی کی نفسانیت ظاہر ہوتی ہے، کیونکہ لڑائی جھگڑے کے موقع پر دو فریقوں میں سے ہر فریق کا منشا، مدعا اور مقصد یہ ہوتا ہے کہ دوسرے پر غالب آجائے، لڑائی میں ہار ماننے کو کسی کا جی نہیں چاہے گا، جب لڑائی ہو اور ایک فریق یہ چاہے کہ میں اس لڑائی میں ہار جاؤں، یہ کبھی کوئی نہیں چاہے گا، بلکہ دونوں فریق یہ چاہیں گے کہ میں غالب آجاؤں۔ تو لڑائی اور جھگڑے میں نفس کو نمایاں ہونے کا موقع ملتا ہے اور اللہ کے نیک بندوں کا یہ طریق ہے کہ جب نفس سر اٹھاتا ہے تو اس کا مقابلہ کرتے ہیں، نفس جو کہتا ہے یہ اللہ کے بندے اس کے الٹ کرتے ہیں، نفس کہتا ہے کہ میں ہار نہیں مانوں گا، وہ کہتے ہیں کہ

ہم تم کو ہرا کر چھوڑیں گے، جب ایک فریق چپ کر جاتا ہے تو لڑائی مٹ جاتی ہے، ختم ہوجاتی ہے۔

جھگڑے کے اسباب بغض وکینہ:

اس کے بعد ارشاد فرماتے ہیں کہ: ''یہ لڑائی اور جھگڑے کا وصف نہیں مٹتا، مگر انہی نفوس سے جو کہ بغض اور کینہ سے پاک ہوں۔'' مطلب یہ ہے کہ لڑائی جھگڑا پیدا ہوتا ہے کینہ سے، دو آدمیوں کے درمیان لڑائی اور جھگڑا اس وقت ہوگا جبکہ دونوں کے دلوں میں ایک دوسرے سے نفرت، ایک دوسرے کی دشمنی اور ایک دوسرے سے کینہ ہو، جن دلوں کے درمیان الفت اور محبت ہو، ان کے درمیان جھگڑا نہیں ہوتا اور یہ چیز پیدا ہوتی ہے یعنی غصے کا آنا، کینہ کا پیدا ہونا منافست کی وجہ سے۔

کینہ کا سبب:

دنیا کی کسی چیز کو اچھا اور نفیس سمجھ کر دو آدمی حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں، ایک کہتا ہے کہ مجھے ملنی چاہئے، دوسرا کہتا ہے کہ مجھے ملنی چاہئے۔ ظاہر ہے کہ ان دونوں میں سے کسی ایک کو ملے گی، وہ دونوں کو تو نہیں مل سکتی، اب جس کو یہ ملے گی اس کے دل میں تو کبر پیدا ہوگا کہ شاید میں بڑا آدمی بن گیا ہوں کہ یہ چیز مجھے مل گئی ہے اور جس کو نہیں ملی، اس کے دل میں کینہ پیدا ہوگا۔

کینہ کا علاج:

تو معلوم ہوا کہ کینہ دل سے نہیں مٹ سکتا جب تک کہ منافست نہ چھوڑ دی جائے، یعنی دنیا کی چیزوں کے لئے ایک دوسرے سے بڑھنا، ایک دوسرے سے آگے نکلنے کی کوشش کرنا، یعنی دل کا تزکیہ ہوجائے گا، جب دنیا کی حقارت اور ذلت کا مضمون دل میں پیدا ہوجائے، آخرت کی عظمت دل میں آجائے اور حق تعالیٰ شانہ کا تعلق پیدا ہوجائے تو کینہ مٹ جائے گا، دلوں کے اندر الفت پیدا ہوجائے گی تو لڑائی

جھگڑے خود بخود ختم ہو جائیں گے۔

جھگڑا چھوڑنے پر انعام:

اسی لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ:

”قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ: مَنْ تَرَکَ الْکَذِبَ وَھُوَ بَاطِلٌ بُنِیَ لَہٗ فِیْ رَبَضِ الْجَنَّۃِ، وَمَنْ تَرَکَ الْمِرَاءَ وَھُوَ مُحِقٌّ بُنِیَ لَہٗ فِیْ وَسْطِ الْجَنَّۃِ....الخ۔“ (مشکوٰۃ ص:۴۱۲)

ترجمہ:......”جس شخص نے حق پر ہوتے ہوئے لڑائی جھگڑے کو چھوڑ دیا (دو آدمیوں کے درمیان مقدمہ چل رہا تھا یا جھگڑا چل رہا تھا، بحث چل رہی تھی، ایک ان میں سے حق پر تھا، دوسرا ناحق پر تھا، ایک نے باوجود حق پر ہونے کے جھگڑا چھوڑ دیا کہ چلو بھائی! میں ہارا تم جیتے معاملہ ختم) تو اللہ تعالیٰ اس کو جنت کے درمیان میں محل عطا فرمائیں گے، اور جس شخص نے ناحق پر ہوتے ہوئے جھگڑا چھوڑ دیا اس کو اللہ تعالیٰ جنت کے طرف یعنی کنارے میں محل عطا فرمائیں گے۔ (حالانکہ اس کو تو چھوڑنا ہی چاہئے تھا ناں! جب ناحق پر تھا تو چھوڑنا ہی چاہئے تھا لیکن اللہ تعالیٰ اس کو بھی انعام عطا فرمائیں گے)۔“

مگر یہاں یہ بات یاد رکھنی چاہئے کہ جب دو آدمی جھگڑ رہے ہوں اور ان کے درمیان مقابلہ ہو رہا ہو تو اکثر یہ ہوتا ہے کہ ان میں سے ہر آدمی جانتا ہے کہ میں حق پر ہوں یا حق پر نہیں ہوں؟ یہ بالکل کھلی ہوئی بات ہوتی ہے، بہت سے لوگ باوجود ناحق پر ہونے کے جھگڑا کرتے ہیں، مقدمہ تک کر دیتے ہیں اور مقدمہ میں

جیت بھی جاتے ہیں۔

ناحق مقدمہ بازی کا قصہ:

میرے ایک دوست بتا رہے تھے کہ میرے ایک عزیز تھے، (انہوں نے آتے ہوئے مجھے وہ دوکان بھی بتائی، کہنے لگے کہ یہ جگہ ہے)، انہوں نے چالیس ہزار کی دوکان خریدی تھی، ساٹھ ہزار اس کے اوپر لگادیا، ان کا انتقال ہوگیا تو اس دوکان کے پیچھے ایک چارپائی کی چھوٹی سی جگہ تھی، وہاں ایک ملنگ سا پڑا رہتا تھا، اس کو کسی نے اکسایا، اور شاید پیسے ویسے بھی دیئے ہوں گے کہ تم مقدمہ کردو کہ یہ جگہ میری ہے، اس نے مقدمہ کردیا اور مقدمہ جیت گیا، دوسرے فریق نے اپیل کی، ہائی کورٹ تک پہنچا، ہائی کورٹ میں بھی جیت گیا، جب وہ مرگیا تو اس کا کوئی وارث نہیں تھا، مگر اس کے دور کے وارث جاگ اٹھے، وہ مدعی بن گئے، انہوں نے مجھے یہ عجیب وغریب لطیفہ سنایا تھا۔ اور عجیب بات یہ کہ کسی اور کے مکان کا نمبر دے کر کے انہوں نے اس پر مقدمہ کیا، اب جب بعد میں معلوم ہوا کہ یہ تو اس کا نمبر ہی نہیں جس دکان پر جھگڑا چل رہا تھا، تو اس قسم کی بہت ساری صورتیں پیدا ہوتی ہیں۔

ہماری عدالتوں میں جتنے مقدمے چل رہے ہیں، خصوصاً دیوانی مقدمات، ان میں سے اللہ تعالیٰ مجھے معاف فرمائے ساٹھ فیصد لوگ ایسے ہیں کہ جانتے ہیں کہ میں جھوٹا ہوں، مقدمے کا ایک فریق جانتا ہے کہ میں غلط ہوں۔

حرص و ہوا - جھگڑے کا سبب:

شیخ سعدی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ایک دفعہ ایک صاحب کو قاضی بنادیا گیا، یعنی جج بنادیا گیا، دوست احباب آکر اس کو مبارک باد دینے لگے، تو ایک دوست جب ان کو مبارک باد دینے کے لئے آئے تو وہ بیٹھا رو رہا تھا، کہنے لگے: یار! ہم تو تمہیں مبارکباد دینے آئے ہیں اور تم رو رہے ہو، رونے کی کیا بات ہے؟ کہنے لگا کہ: رونے

کی بات یہ ہے میں سوچ میں ہوں کہ دو فریق میرے پاس مقدمہ لے کر آتے ہیں، وہ خود صاحب واقعہ ہیں، جو واقعہ گزرا ہوگا وہ ان کے علم میں ہے، ان میں سے ہر فریق یہ بھی جانتا ہے کہ میں کتنا حق پر ہوں، کتنا باطل پر ہوں؟ اس کے باوجود وہ دونوں اپنا تصفیہ نہیں کرسکتے، تو میں ایک اجنبی آدمی ہوں، مجھے کچھ نہیں معلوم کہ کیا واقعہ ہے، کیا واقعہ نہیں ہے؟ میں اس قصے کا تصفیہ کیسے کروں گا؟ جب خود صاحبِ واقعہ اس کا تصفیہ نہیں کرسکے تو قاضی اور جج بے چارہ جس کے علم میں کوئی چیز نہیں ہے، وہ اس کی تہہ تک کیسے پہنچے گا؟ حق کو باطل سے کیسے پہچانے گا؟ ظالم اور مظلوم کے درمیان امتیاز کیسے کرے گا؟ اس سوچ نے مجھے پریشان کر رکھا ہے۔ وہ کہنے لگے: بس اتنی سی بات ہے! کہنے لگے: ہاں اتنی ہی بات ہے! وہ کہنے لگے کہ: اس میں رونے کی کیا بات ہے؟ میں تمہارا عقدہ حل کئے دیتا ہوں، بات یہ ہے کہ جیسے تم نے کہا وہ صاحبِ واقعہ ہیں اور صاحبِ واقعہ ہونے کی وجہ سے ان کو پوری کہانی معلوم ہے، لیکن اس کے باوجود اس لئے جھگڑتے ہیں کہ حرص و ہوا اور خواہش نفسانی نے ان کی آنکھوں پر پٹی باندھ دی ہے، ان کو اندھا کردیا ہے، جیسا کہ قرآن کریم میں ہے:

”لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا وَلَهُمْ اَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُوْنَ بِهَا وَلَهُمْ اٰذَانٌ لَّا يَسْمَعُوْنَ بِهَا۔“ (الاعراف:۱۷۹)

ترجمہ:......”ان کے دل ہیں مگر سمجھتے نہیں، ان کی آنکھیں ہیں مگر دیکھتے نہیں، ان کے کان ہیں مگر سنتے نہیں۔“

تو جھگڑا اس لئے کر رہے ہیں کہ ان کی آنکھوں پر حرص و ہوا کی پٹی بندھ گئی ہے اور آنکھیں اندھی ہوگئی ہیں، دل کی آنکھیں اندھی ہوگئی ہیں۔ دوست نے کہا کہ: اگر تم حق و انصاف کے لئے عدالت کی کرسی اور مسند پر بیٹھو گے، تو اللہ تعالیٰ تمہیں بصیرت عطا فرمائیں گے کہ تم حق کو باطل سے پہچانو گے، لیکن اگر تم نے رشوت لینا شروع کردی تو تمہاری آنکھوں پر بھی حرص و ہوا کی پٹی بندھ جائے گی اور تم بھی

اندھے ہو جاؤ گے، پھر تم حق و باطل کے درمیان شناخت نہیں کرسکو گے۔

اس لئے ایک حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ:

”مَنْ جُعِلَ قَاضِيًا بَيْنَ النَّاسِ فَقَدْ ذُبِحَ بِغَيْرِ سِكِّيْنٍ۔“ (مشکوٰۃ ص:۳۲۴)

ترجمہ:...... ”جس کو قاضی اور جج بنا دیا گیا اس کو بغیر چھری کے ذبح کردیا گیا۔“

قضا مشکل کام ہے:

یہ بہت نازک مسئلہ ہے! آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ سے فرمایا تھا:

”يَا اَبَاذَرٍّ! اِنِّی اَرَاکَ ضَعِيْفًا وَاِنِّی اُحِبُّ لَکَ مَا اُحِبُّ لِنَفْسِیْ لَا تَأَمَّرَنَّ عَلَی اثْنَيْنِ وَلَا تَوَلَّيَنَّ مَالِ يَتِيْمٍ۔“ (مشکوٰۃ ص:۳۲۰)

ترجمہ:...... ”اے ابوذر! تم کمزور ہو اور میں تمہارے واسطے وہی چیز پسند کرتا ہوں جو اپنے واسطے پسند کرتا ہوں، دو کام کبھی نہ کرنا، ایک تو یہ کہ دو آدمیوں کے درمیان کبھی امیر نہ بننا اور دوسرے یہ کہ یتیم کا مال کبھی اپنے پاس نہ رکھنا، (اس لئے کہ تم سے بارِ امانت نہیں اٹھ سکے گا اس لئے کہ تم کمزور ہو)۔“

عین حق و انصاف یعنی کانٹے کے تول پر آدمی فیصلہ کرے کہ نہ اِدھر اور نہ اُدھر یہ بہت بڑا کام ہے، چھوٹا کام نہیں ہے اور ہر ایک کا کام نہیں ہے۔

دورِ حاضر کی قضا:

ہمارے حضرت تھانوی قدس سرہ نے قصہ لکھا ہے کہ انگریز کا زمانہ آیا تھا تو

وہ منصف بنادیا کرتے تھے، کوئی معزز آدمی دیکھا، اس کو منصف بنادیا، تو ایک بالکل ان پڑھ اور جاہل قسم کے آدمی کو منصف بنادیا گیا، اس نے وہاں کے جو لوگ تھے ان سے پوچھا کہ فیصلہ کیسے کرتے ہیں؟ مجھے تو یہ معلوم نہیں، اس کو بتادیا گیا کہ جو پہلے منصف صاحب تھے ناں! جس چیز کو منظور کرنا ہوتا اس کو اِدھر منہ کرکے کہہ دیتے کہ: منظور!، اور جس کو نامنظور کرنا ہوتا وہ اُدھر منہ کرکے کہہ دیتے کہ: نامنظور! کہنے لگا کہ: بس اتنا ہی کام ہے؟ یہ تو بہت آسان کام ہے۔ جو بھی مقدمہ آتا کبھی اِدھر منہ کرکے کہہ دیتا: منظور! اور کبھی اُدھر منہ کرکے کہہ دیتا کہ: نامنظور! تو جن لوگوں کے فیصلے منظور اور نامنظور پر چلتے ہوں ان کی بات نہیں ہے، جس کے بارے میں جو چاہا فیصلہ کردیا۔

عدل وانصاف - ایک امانت:

حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ کے بارے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جو بات فرمائی تھی میں نے اس کو بڑا پلے باندھا ہے۔ بھائی! بارِ امانت ہم سے نہیں اٹھتا، فیصلہ کرنا بھی ایک امانت ہے، اور یتیم کے مال کی حفاظت کرنا بھی ایک امانت ہے۔ اور ان دو چیزوں کا ذکر اس لئے فرمایا کہ یتیم کے مال میں اگر کوئی گڑبڑ کروگے تو کوئی مطالبہ کرنے والا نہیں ہوگا، کسی اور نے تمہارے پاس امانت رکھ دی، خدانخواستہ اس میں گڑبڑ کروگے تو مطالبہ کرنے والا موجود ہے، تمہارا گریبان پکڑنے والا موجود ہے، یتیم کے مال میں کوئی گڑبڑ کروگے تو کوئی پوچھنے والا نہیں ہے۔ اب یتیم بے چارہ تو پوچھ بھی نہیں سکتا، اس لئے کہ ناسمجھ ہے۔ اسی طرح اگر دو آدمیوں کے درمیان تم انصاف کرنے بیٹھے اور عدل وانصاف کا فیصلہ نہیں کیا تو وہ دونوں کیا کہہ سکتے ہیں؟

توہین عدالت:

اب ہماری عدالتیں فیصلے کرتی ہیں، جس فریق کے خلاف فیصلہ ہوتا ہے وہ بے چارا قاضی کو کیا کہہ سکتا ہے؟ خصوصاً جبکہ انگریز کے قانون کے مطابق یہ دستور بھی ہو کہ عدالت کے فیصلہ پر تبصرہ نہیں ہوسکتا، سبحان اللہ! ورنہ توہین عدالت ہے، کیا بات ہے! قرآن اور حدیث کے فیصلے پر تم تنقیدیں کرو اور تمہاری زبان پکڑنے والا کوئی نہیں ہے، اور ملک میں کوئی ایسا قانون بھی نہیں کہ کوئی شخص اگر قرآن و حدیث کے فیصلے پر تنقید کرے تو وہ قانون اسے سزا دے، لیکن عدالت کے فیصلے پر تنقید کرنا اس کے لئے توہین عدالت کا قانون موجود ہے۔

ہمارے ججوں کا معیار:

اب بتائیے صاحب! جج نے فیصلہ کیا اور کھلم کھلا رشوت لے کر فیصلہ کیا ہے پھر یہ بھی دیکھا جائے کہ عدالت کی کرسی پر ان کو بٹھایا جاتا ہے جن میں عقل، نہ دین، نہ ایمان! غرض ان کو کوئی چیز ظلم سے روکنے والی نہیں ہے، عقل روکنے والی ہے وہ نہیں ہے، ظلم کرنے اور غلط فیصلے کرنے سے دین روکنے والا ہے، وہ نہیں ہے، پرہیز گاری نہیں ہے، تقویٰ نہیں ہے، ورع نہیں ہے، ان لوگوں کے فیصلوں کو حرفِ آخر سمجھا جاتا ہے اور ان پر تنقید کرنے کو جرم قرار دیا جاتا ہے۔

زبردستی کی مقدمہ بازی:

خیر میں عرض یہ کر رہا تھا کہ اکثر و بیشتر جھگڑا کرنے والوں میں یہ احساس موجود ہوتا ہے کہ میں حق پر ہوں یا ناحق پر ہوں؟ اور کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک غریب آدمی کو خواہ مخواہ گھسیٹ لیا جاتا ہے، مدعا علیہ ہے اس کو گھسیٹ لیا ناحق۔ اس لئے ہماری کتابوں میں مدعی کی تعریف یہ کی ہے کہ: ”من اذا تَرک تُرک۔“ مدعی اور مدعا علیہ کے درمیان تمیز کرنا بڑا مشکل ہوتا ہے، سب سے مشکل کام قاضی کے لئے

مدعی اور مدعا علیہ کے درمیان تمیز کرنا ہوتا ہے کہ مدعی کون ہے؟ اور مدعا علیہ کون ہے؟ تو مدعی کی تعریف یہ کی گئی ہے کہ اگر وہ اپنی بات کو چھوڑ دے تو کوئی اس کا پیچھا نہ کرے، اچھا بھئی! ٹھیک ہے وہ کہتا ہے کہ میں اپنا مقدمہ واپس لیتا ہوں، ٹھیک ہے، کوئی اعتراض نہیں، لیکن اگر مدعا علیہ کہے کہ میں مقدمہ واپس لیتا ہوں، تو کیا اس کو چھوڑ دیا جائے گا؟ تو بعض فریق مقدمہ بے چارے ایسے بھی ہوتے ہیں کہ وہ چاہیں، نہ چاہیں ان کو بہرحال اس مقدمے کو چلانا ہے، کیونکہ وہ مدعی نہیں ہے مدعا علیہ ہے، ان کو مقدمے میں گھسیٹا گیا ہے وہ چھوڑنا بھی چاہے تو نہیں چھوڑ سکتے۔

میں یہ مضمون پہلے بھی ذکر کرچکا ہوں کہ ایسے ظالم لوگ کبھی نہیں پنپیں گے، جو جانتے ہیں کہ ہم ناحق پر ہیں لیکن اس کے باوجود دعویٰ دائر کیا ہوا ہے، رشوت دے کر جیت بھی جائیں گے، تو اکثر لوگ تو جانتے ہیں، بلکہ ہر فریق مقدمے کا جانتا ہے۔

وکلاءٗ کا کمال:

اور ہمارے وکلاءٗ! اللہ تعالیٰ ان کو خوش رکھے، جب سے یہ انگریزی عدالتیں پیدا ہوئی ہیں اس وقت سے وکلاءٗ کا طبقہ بھی پیدا کیا گیا ہے، یہ لازم و ملزوم ہیں، انگریزی عدالت وکیلوں کے بغیر نہیں چل سکتی، کیونکہ قانون دان نہیں ہیں، ان وکیلوں نے ایک اصول قائم کردیا ہے کہ اپنی جگہ فریق مقدمہ خواہ کتنا ہی سچا ہو، لیکن جب تک وہ جھوٹ کی آمیزش نہ کرے اس وقت تک مقدمے میں کامیاب نہیں ہوسکتا، آپ عدالت میں مقدمہ لے کر جائیں وکیل کرنا ہوگا، وکیل کو آپ صحیح صحیح واقعہ بتادیں، لیکن وہ کہے گا کہ ایسا نہیں، تم یہ کہنا، تم یہ کہنا، تم یہ کہنا.... اگر دس باتیں ان میں سچ ہیں تو ان میں نوے جھوٹ ملاکر ان کو سو پوری کرے گا۔ یعنی جو جھوٹا ہے وہ تو جھوٹا ہے ہی، ہمارے وکلاءٗ کا کام ہے کہ عدالت میں سچے کو جھوٹا بنانا اور جھوٹے کو سچا بنانا، اور لطف

کی بات یہ ہے کہ بیان کے شروع میں حلف لیا جاتا ہے کہ لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ! میں جو کچھ کہوں گا حق اور صحیح بات کہوں گا! قسم کھا کر جھوٹ بلوایا جاتا ہے۔

حضرت عارفیؒ کی وکالت:

ہمارے حضرت ڈاکٹر صاحب نور اللہ مرقدہ نے وکالت پڑھی تھی، حضرت ڈاکٹر عبدالحیٔ عارفی صاحب، حضرت تھانوی قدس سرہ سے پہلے ہی سے تعلق تھا مگر بیعت نہیں ہوئے تھے، حضرت تھانویؒ کو خط لکھا کہ حضرت میں وکالت کا امتحان دینا چاہتا ہوں دعا فرمایئے کامیابی کی، حضرتؒ نے لکھا کہ دعا تو کرواتے ہو یہ بھی معلوم کرلیا کہ یہ جائز بھی ہے کہ نہیں؟ ڈاکٹر صاحبؒ نے جواب میں لکھا کہ حضرت جو وکیل جھوٹ نہ بولے، صحیح صحیح مقدمہ لے، جھوٹ اس میں نہ بولے اور کوئی غلط بات نہ کرے تو اس میں ناجائز ہونے کی کیا وجہ ہے؟ حضرتؒ نے جواب میں لکھا کہ: جس قانون کے مطابق یہ فیصلہ کروانا چاہتا ہے اگر وہ قانون ہی غلط ہو تو پھر اس کی کاروائی کیسے صحیح ہوگی؟ اس کا جواب ان کے پاس نہیں تھا، خاموش رہے، لیکن بات دل میں نہیں اُتری، اس وقت حضرتؒ سے بیعت نہیں تھے، خاموش رہے۔ قانون پاس کرلیا بعد میں بیعت ہوگئے، اپنی وکالت شروع کردی، حضرت ڈاکٹر صاحبؒ سے میں نے خود سنا ہے فرماتے ہیں کہ: غلط مقدمہ میں نہیں لیتا تھا، سچے میرے پاس آتے نہیں تھے، بھلا ایک داڑھی والا مولوی بیٹھا ہے وکیل بن کر، اس کے پاس کون جائے گا؟ اس لئے میں سارا دن بیٹھا رہتا تھا، میرے پاس بہت کم لوگ آتے تھے۔

ترکِ وکالت پر خلافت:

میرا کام چلا نہیں، اس لئے میں نے طب کا کام سیکھ لیا اور میں نے آہستہ آہستہ وکالت کو چھوڑ دیا، اور جس دن مکمل طور پر وکالت چھوڑ کر مطب کرنے کا فیصلہ کرلیا، اس دن میں نے حضرتؒ کو خط لکھا کہ حضرت! وہ میرا کام چلتا نہیں تھا، جھوٹ

میں بولتا نہیں تھا اور سچ وہاں عدالت میں چلتا نہیں، اس لئے میں نے وہ پیشہ ترک کردیا اور یہ پیشہ اختیار کرلیا ہے۔ حضرت ڈاکٹر صاحبؒ فرماتے ہیں کہ ایک سال پہلے حضرت تھانویؒ نے چند اپنے مریدوں کے نام کا اشتہار دیا تھا کہ ان صاحبوں میں مجھے بعض چیزوں کا انتظار ہے، اگر وہ چیزیں پیدا ہوجائیں تو میں ان کو مجاز بنادوں گا، اجازت دے دوں گا، خلیفہ بنادوں گا، اور ان میں میرا نام بھی تھا، ساتھ ہی حضرتؒ نے لکھ دیا تھا کہ کسی کو یہ پوچھنے کا حق نہیں ہوگا کہ وہ کیا بات ہے؟ خودبخود وہ چیزیں پیدا ہوجائیں، مجھ سے پوچھی نہ جائیں، جب میں نے مطب شروع کیا، وکالت چھوڑ دی اور حضرتؒ کو اطلاع دی تو جواب میں حضرتؒ نے فرمایا کہ: ماشآءَ اللہ مجھے تمہارے بارے میں اسی چیز کا انتظار تھا، اللہ تعالیٰ مبارک کرے، تمہیں اللہ تعالیٰ پر توکل کرتے ہوئے اجازت دیتا ہوں۔ خلافت مل گئی، وکالت چھوڑی خلافت مل گئی۔ تو گفتگو میں اس میں کررہا تھا کہ اکثر لوگ تو جانتے ہیں کہ میں حق پر ہوں یا باطل پر ہوں؟ یا کتنا حق پر ہوں کتنا باطل پر ہوں؟ یا کتنا سچا ہوں کتنا جھوٹا ہوں؟

نفس و شیطان کی تاویلیں:

لیکن ایک مرحلہ اس کے بعد آتا ہے کہ نفس اور شیطان تاویلیں کرکر کے جس طرح کہ ہمارے وکیل سچ کو جھوٹ اور جھوٹ کو سچ بناتے ہیں شیطان اور نفس یہ بڑے وکیل ہیں، یہ وکیلوں سے زیادہ دلائل جانتے ہیں، یہ بعض دفعہ ایسی تاویلیں کرتے ہیں کہ آدمی کو سچ اور جھوٹ کے درمیان امتیاز ہی نہیں رہتا اور ہوتا یہ ہے کہ جھوٹا ہے لیکن اپنے آپ کو سچا سمجھتا ہے، چنانچہ دونوں فریق اپنے آپ کو حق پر سمجھتے ہیں۔ عدالت میں مقدمہ لے کر جاتے ہیں، اپنے آپ کو دونوں حق پر سمجھتے ہیں اس لئے کہ شیطان نے تاویلیں کرکے، نفس نے تاویلیں کرکے حق کو باطل اور باطل کو حق بنادیا، یہ حالت بڑی خطرناک ہے بھائی! اللہ تعالیٰ معاف کرے اور آپ دیکھیں گے

بہت سے جھگڑا کرنے والوں میں، مقدمہ کرنے والوں میں اس قسم کے لوگ بھی پائے جاتے ہیں۔

خطرناک عادت:

ایک فریق سے آپ پوچھیں وہ اپنے آپ کو حق پر بتائے گا، دوسرے فریق سے پوچھیں وہ اپنے آپ کو حق پر بتائے گا، ان مقدموں کے علاوہ رشتے داروں کے درمیان، عزیزوں کے درمیان، دوستوں کے درمیان جو رنجشیں ہوجاتی ہیں، لڑائیاں ہوجاتی ہیں ان میں ہر ایک فریق اپنے آپ کو حق پر سمجھتا ہے، اس سے بات کیجئے تو وہ اپنے آپ کو حق پر سمجھے گا، اپنے آپ کو مظلوم اور دوسرے کو ظالم بتائے گا، اور دوسرے سے پوچھئے تو وہ اپنے آپ کو مظلوم اور دوسرے کو ظالم ثابت کرے گا، کوئی بھی قصور نہیں مانے گا، یہ عادت بڑی خطرناک ہے، اس لئے کہ جب آدمی اپنا قصور ہی نہ سمجھے تو پھر اس سے رجوع کیوں کرے گا؟ اور دو آدمیوں کے درمیان صلح کیسے ہوگی؟ جب ان میں سے ہر ایک آدمی اپنے کو مظلوم اور دوسرے کو ظالم سمجھتا ہے۔

اسلام میں جھگڑا چھوڑنے کی حوصلہ افزائی:

واللہ اعلم! یہی وجہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جو شخص حق پر ہوتے ہوئے جھگڑا چھوڑ دیتا ہے اس کو اللہ تعالیٰ جنت کے درمیان میں محل عطا فرمائیں گے، اور جو باطل پر ہوتے ہوئے جھگڑا چھوڑ دیتا ہے اللہ تعالیٰ اس کو جنت کے کنارے میں محل عطا فرمائیں گے، تاکہ ہر ایک جھگڑنے والے کو جھگڑا چھوڑنے کی حوصلہ افزائی ہو کہ اگر حق پر ہوں تب بھی نفع میں ہوں، اور باطل پر ہوں تب بھی نفع میں ہوں، دو آدمیوں کے درمیان جب جھگڑا پیدا ہوگا تو اس کا منشا ہے کینہ اور منافست، ایک دوسرے کا کینہ اور ایک دوسرے سے منافست کرنا، یعنی چھینا جھپٹی جس کو کہتے ہیں، دو آدمی ایک چیز کو حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں، ایک

آدمی آگے بڑھ کر چھین لیتا ہے، دوسرے کو نہیں ملتی اور اس کا علاج کیا ہوگا؟

جھگڑے کا علاج بالضد:

اس کا علاج بھی دو چیزیں ہوئیں، علاج بالضد ہے ناں! اس جھگڑے کا علاج دو چیزیں ہوگئیں۔ ایک کینہ کی جگہ الفت کا پیدا ہونا، دوسرے منافست کی جگہ زہد کا پیدا ہوجانا، جب کینہ کی جگہ الفت پیدا ہوجائے گی تو جن دلوں کے درمیان الفت ہوتی ہے ان میں جھگڑا نہیں ہوتا، جوڑ پیدا ہوگیا ناں! جھگڑا ختم، کینہ نہیں رہا، ایک دوسرے سے نفرت نہیں رہی، ایک دوسرے سے بغض نہیں رہا۔

مسلمانوں کے تین فریق:

قرآن کریم میں حق تعالیٰ شانہ نے سورۂ حشر میں مسلمانوں کے تین فریق ذکر کئے ہیں، اور پھر مال فئے کا تذکرہ آرہا ہے، ان کا ذکر کرتے ہوئے حق تعالیٰ شانہ فرماتے ہیں:

مہاجرین کی اولو العزمی:

”لِلْفُقَرَآءِ الْمُهَاجِرِيْنَ الَّذِيْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَاَمْوَالِهِمْ يَبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا وَّيَنْصُرُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ۔“ (الحشر:۸)

ترجمہ:......”(یہ مالِ فئے) حق ہے ان فقرائے مہاجرین کا جن کو ان کے گھروں سے اور مالوں سے نکال دیا گیا محض اس خاطر کہ یہ لوگ اللہ تعالیٰ کی رضامندی اور اس کے فضل کے متلاشی تھے اور یہ لوگ مددگار ہیں اللہ کے اور اس کے رسول کے اور یہ لوگ ہیں سچے۔“

جتنے مہاجرین مکہ مکرمہ سے ہجرت کر کے مدینہ طیبہ آئے، جن کو ان کے گھروں سے اور ان کے مالوں سے نکالا گیا، اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے فتویٰ دیا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے فضل اور اس کی رضامندی کے متلاشی ہیں اور اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کے مددگار ہیں، اللہ اکبر! اور آخر میں فرمایا یہ سچے ہیں۔

اب مجھے بتاؤ! جن کو قرآن کریم سچا کہتا ہے تو جو ان کو جھوٹا کہے اس سے بڑا جھوٹا کون ہوگا؟ سوچو! یہ تھے مہاجرین جو اپنے گھروں میں کھاتے پیتے تھے، اللہ تعالیٰ کا دیا سب کچھ تھا لیکن فقراء بن گئے، صرف اس لئے کہ ان کو ہجرت کر کے آنا پڑا اور اپنا سب کچھ پیچھے چھوڑنا پڑا، کس لئے؟ اس لئے نہیں کہ یہاں آکر ملازمتیں ملیں گی، یہاں آکر جائدادوں پر قابض ہوجائیں گے، نہیں! صرف اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی خوشنودی اور اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی مدد، یہ ان کا مطمح نظر تھا اور کچھ بھی نہیں تھا۔ انہی کے بارہ میں فرمایا گیا: ”اُولٰٓـئِکَ ھُمُ الصّٰدِقُوْنَ۔“ (یہ ہیں سچے)۔ سن رہے ہو سچے مہاجر کس کو کہتے ہیں؟ سچے مہاجر بنو بھائی! سچے مہاجر کا بڑا اعزاز ہے، بہت بڑا اعزاز ہے، اللہ تعالیٰ ہمیں توفیق عطا فرمائے۔

انصار کی وسعت قلبی:

مسلمانوں کا دوسرا فریق انصار کا ہے، جس کی عظمت کو قرآن کریم میں یوں بیان فرمایا گیا ہے:

”وَالَّذِیْنَ تَبَوَّءُوا الدَّارَ وَالْاِیْمَانَ مِنْ قَبْلِھِمْ یُحِبُّوْنَ مَنْ ھَاجَرَ اِلَیْھِمْ وَلَا یَجِدُوْنَ فِیْ صُدُوْرِھِمْ حَاجَةً مِّمَّآ اُوْتُوْا وَیُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓی اَنْفُسِھِمْ وَلَوْ کَانَ بِھِمْ خَصَاصَةٌ وَمَنْ یُّوْقَ شُحَّ نَفْسِہٖ فَاُولٰٓـئِکَ ھُمُ الْمُفْلِحُوْنَ۔“

(الحشر:۹)

ترجمہ:...... ”اور وہ لوگ جو ٹھکانہ پکڑے ہوئے تھے دارالاسلام اور دارالایمان میں ان سے پہلے، یہاں کے پہلے سے باشندے ہیں انہوں نے دارالاسلام میں ٹھکانہ پکڑا ہوا ہے اور ایمان میں اپنا گھر کیا ہوا ہے جو ان کے پاس ہجرت کر کے آتا ہے وہ اس سے محبت کرتے ہیں (بغض نہیں)، اور ان مہاجرین کو جو کچھ دیا جائے اس کی وجہ سے ان کو دل میں تنگی پیدا نہیں ہوتی (کہ ان کو کیوں دے دیا گیا؟ ان کا کیا حق تھا؟ ہمیں ملنا چاہئے تھا) اور ترجیح دیتے ہیں دوسروں کو اپنے اوپر اگرچہ خود بھوکے بیٹھے ہیں، اور جس کو بچا دیا جائے اپنے نفس کی حرص سے وہ لوگ ہیں بھلائی پانے والے کامیاب۔“

وطنیت کی بنا پر تقسیم شیطانی نعرہ ہے:

بھئی یہ باتیں تو ہم نے پہلے بھی عقلاً سے سنی تھیں اور سنتے ہی چلے آئے تھے کہ ایک چیز آپ کو وراثت میں مل گئی یا آپ نے اس کو خرید لیا یا آپ نے اس کو پیدا کرلیا، کسی طرح بنالیا وہ چیز آپ کی ملکیت ہے، یہ تو ہم سنتے چلے آئے ہیں عقلاً سے، لیکن یہ بات کبھی نہیں سنی تھی کہ چونکہ میں سندھی ہوں لہٰذا سندھ سارا میرا ہے، میں پنجابی ہوں لہٰذا پنجاب سارا میرا ہے، میں بلوچی ہوں لہٰذا بلوچستان سارا میرا ہے اور اب سندھ میں کسی غیر سندھی کے لئے، پنجاب میں کسی غیر پنجابی کے لئے، بلوچستان میں کسی غیر بلوچی کے لئے کوئی گنجائش نہیں! یہ بات تو ہم نے کبھی عقلاً سے نہیں سنی تھی۔ یہ وطنیت کی بنا پر تقسیم سندھی اور غیر سندھی، پنجابی اور غیر پنجابی یہ جاہلیت کا وہ نعرہ ہے جو شیطان نے مسلمانوں کے درمیان میں تفرقہ ڈالنے کے لئے ایجاد کیا ہے۔

یہ مسلمانوں کا شعار نہیں:

کسی مہاجر نے کسی سندھی کی جائیداد پر قبضہ کرلیا ہے، میں بھی تمہارا ساتھ دوں گا اس مہاجر کے خلاف اور آپ سب کو بھی اس کا ساتھ دینا چاہیئے، لیکن اگر کسی سندھی کی جائیداد پر قبضہ نہیں کیا مہاجر نے تو جھگڑا کیا ہے؟ مجھے بتاؤ! یہ شیطان نے نعرے لگا دیئے ہیں، ''وَلَا يَجِدُوْنَ فِيْ صُدُوْرِهِمْ حَاجَةً مِّمَّآ اُوْتُوْا۔'' ان کو جو کچھ دیا گیا اپنے سینے میں کوئی حرج نہیں پاتے تھے، تنگی نہیں پاتے تھے اور ترجیح دیتے ہیں دوسروں کو اپنے اوپر اگرچہ خود بھوکے بیٹھے ہیں۔

یہ ہیں انصار اور وہ تھے مہاجر اور جس شخص کو بچا دیا جائے اپنے نفس کی حرص سے وہ لوگ ہیں بھلائی پانے والے کامیاب۔

رسول اقدس صلی اللہ علیہ وسلم مہاجرین مکہ کے ساتھ جب یہاں مدینہ طیبہ تشریف لائے تھے تو زمینیں مدینے والوں کی تھیں، مکان مدینے والوں کے تھے، متروکہ مکان نہیں تھے، متروکہ جائدادیں نہیں تھیں، ان مدینہ والوں کی ملکیت تھیں، یہاں سے کوئی ہندو چھوڑ کر نہیں گئے تھے، اُن کے مکان تھے، اُن کی زمینیں تھیں، اُن کی جائدادیں تھیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے اور تشریف لاکر کے ایک مہاجر کو ایک انصاری کا بھائی بنادیا اور اس کی جائداد دونوں کے درمیان تقسیم کردی، کبھی سنا ہے یہ؟ ایثار کا یہ نقشہ کبھی سننے میں آیا؟ انصاری کی جائداد ہے، اس کا مکان ہے، مہاجر کو اس کا بھائی بنادیا اور آدھی جائداد تقسیم کرکے مہاجر کو دلوادی، آدھا مکان اس کو دے دیا، ۷ھ میں خیبر فتح ہوا، چھ سال یہ ہی قصہ رہا، جب خیبر فتح ہوا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انصارِ مدینہ کو بلایا اور بلواکر فرمایا کہ: ہم نے تمہاری جائدادیں مہاجروں کو تقسیم کردی تھی اور ان کو تمہارے برابر کا شریک بنادیا تھا، اب اللہ تعالیٰ نے ہمیں فتوحات عطا فرمائیں ہیں، خیبر کی زمینیں مل گئی ہیں، میرا یہ جی

چاہے گا کہ مدینے کی زمینیں تمہیں واپس کردی جائیں اور خیبر کی زمینوں میں سے تمہیں حصہ نہ دیا جائے، مہاجروں کو دے دیا جائے، یہاں بھی ترجیح مہاجروں کو ہوئی ناں؟ یعنی اس میں بھی برابر کے دونوں ہیں اور حق دونوں کا بنتا ہے، مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ میرا یہ جی چاہتا ہے کہ تمہیں مدینے کی وہ زمینیں لوٹادی جائیں جو تم نے مہاجروں کو دے رکھی ہیں اور خیبر کی زمینیں مہاجروں کو دے دی جائیں، تمہیں نہ دی جائیں، تمہارا کیا خیال ہے؟ انصار کا جواب یہ تھا کہ: یا رسول اللہ! خیبر کی زمینیں بھی مہاجروں کو دے دی جائیں اور مدینے کی جو جائدادیں ہیں وہ ہم ان کو دے چکے ہیں وہ بھی ان کے پاس رہنے دی جائیں۔ یہ ہے ”وَيُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ.....“ کہ دوسروں کو ترجیح دیتے ہیں اپنی ذات پر۔

مسلمانوں کا تیسرا فریق:

اور تیسرا فریق ذکر کیا ہے اللہ تعالیٰ نے:

”وَالَّذِيْنَ جَآءُوْا مِنْۢ بَعْدِهِمْ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَلِاِخْوَانِنَا الَّذِيْنَ سَبَقُوْنَا بِالْاِيْمَانِ وَلَا تَجْعَلْ فِيْ قُلُوْبِنَا غِلًّا لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ......“ (الحشر:۱۰)

ترجمہ:......”اور وہ لوگ جو آئے ان کے بعد، (کن کے بعد؟ مہاجرین و انصار کے بعد اور اس فریق میں بشرطیکہ ہم اس شرط کو پورا کریں قیامت تک آنے والے سب شریک ہیں اس تیسرے فریق میں کیونکہ اللہ تعالیٰ نے تو سارے مسلمانوں کو شریک کردیا ہے۔ پہلے ایک طبقہ تھا مہاجرین کا، دوسرا طبقہ تھا انصار کا اور تیسرے طبقے کا ذکر کیا ہے اور وہ لوگ جو آئے ان کے بعد) یہ کہتے ہوئے کہ: اے ہمارے پروردگار! ہماری بخشش

فرما اور ہمارے جو بھائی ہم سے پہلے ہوچکے ہیں ایمان کے ساتھ، ان کی بھی بخشش فرما اور اے اللہ! نہ ڈال کینہ ہمارے دلوں میں کسی ایمان والے کی جانب سے (کسی مسلمان کی جانب سے ہمارے دل میں کینہ نہ ڈال، کینہ نہیں ہوگا تو لڑائی بھی نہیں ہوگی بھائی!)۔''

بس اسی پر اکتفا کرتا ہوں۔

وآخر دعوانا ان الحمدللہ رب العالمین

''صبر''
تمام مسائل کا علاج ہے

صابرین کون ہیں؟ جب ان کو کوئی سی بھی مصیبت پہنچے، چھوٹی سے چھوٹی مصیبت بھی پہنچے، بڑی تو ہے ہی، اگر چھوٹی سے چھوٹی مصیبت بھی اُنہیں پہنچے تو کہتے ہیں کہ ہم اللہ کے لئے ہیں اور اللہ کی طرف لوٹنے والے ہیں، ہم اللہ کا مال ہیں اور مالک کو حق پہنچتا ہے جیسے چاہے تصرف کرے، تو کوئی شکایت نہیں کرتے۔ جیسے آپ کپڑا خرید کر لائے ہیں، چاہیں تو اس کے تکیے گدّے بنالیں، چاہے پردے بنالیں اور چاہے اپنا لباس تیار کرلیں۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم
الحمد للہ وسلام علی عبادہ الذین اصطفی!

الف:......''عَنْ شُرَحْبِیْلٍ اَنَّ اَبَا الدَّرْدَاءِ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ کَانَ اِذَا رَایٰ جَنَازَۃً قَالَ: اُغْدُوْا فَاِنَّا رَائِحُوْنَ، اَوْ رُوْحُوْا فَاِنَّا غَادُوْنَ، مَوْعِظَۃً بَلِیْغَۃً وَغَفْلَۃً سَرِیْعَۃً کَفٰی بِالْمَوْتِ وَاعِظًا، یَذْھَبُ الْاَوَّلُ فَالْاَوَّلُ وَیَبْقٰی الْآخَرُ لَا حِلْمَ لَہٗ۔'' (حلیۃ الاولیأ: ج:۱ ص:۲۱۷)

ب:......''عَنْ عَوْنِ بْنِ عَبْدِاللّٰہِ عَنْ اَبِی الدَّرْدَاءِ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ قَالَ: مَنْ یَّتَفَقَّدْ یَفْقِدْ، وَمَنْ لَّا یُعِدُّ الصَّبْرَ لِفَوَاجِعِ الْاُمُوْرِ یَعْجِزْ، اِنْ قَارَضْتَ النَّاسَ قَارَضُوْکَ، وَاِنْ تَرَکْتَھُمْ لَمْ یَتْرُکُوْکَ۔ قَالَ: فَمَا تَأْمُرُنِیْ؟ قَالَ: اِقْرِضْ مِنْ عِرْضِکَ لِیَوْمِ فَقْرِکَ۔''

(حلیۃ الاولیأ ج:۱ ص:۲۱۸)

ترجمہ:......''شرحبیل رحمہ اللہ سے روایت ہے کہ حضرت ابودرداأ رضی اللہ عنہ جب جنازہ دیکھتے تھے تو فرماتے تھے

کہ تم صبح کو جاؤ، ہم شام کو آجائیں گے، یا تم شام کو جاؤ، ہم صبح آئیں گے، بڑی مؤثر نصیحت ہے اور بڑی تیز غفلت ہے، موت نصیحت کے لئے کافی ہے، لوگ وقفہ وقفہ سے جارہے ہیں اور پیچھے رہ جاتے ہیں وہ لوگ جن کے پاس نہ عقل ہے نہ حوصلہ۔“

ترجمہ:...... ”حضرت عون بن عبداللہ سے روایت ہے کہ حضرت ابودرداؓ رضی اللہ عنہ نے ان سے فرمایا: جو شخص راحت کو تلاش کرتا پھرے گا، وہ گم پائے گا، اور جو صبر کو دردناک امور کے لئے تیار نہیں کرتا، وہ عاجز آجائے گا، تو اگر لوگوں سے مقابلہ کرے تو وہ لوگ تجھے کاٹ ڈالیں گے، اور اگر تو ان کو چھوڑ دے تو وہ تجھے نہیں چھوڑیں گے۔ انہوں نے کہا کہ: آپ مجھے کیا حکم دیتے ہیں؟ فرمایا: اپنی عزت کا ایک حصہ کاٹ کر ان کو دے دو، اپنے فقر کے دن کے لئے۔“

حضرت ابودرداءؓ کے مواعظ:

یہ حضرت ابودرداؓ رضی اللہ عنہ کے مواعظ ہیں کہ جب وہ کسی جنازہ کو دیکھتے تو جنازہ کو اور میت کو مخاطب کرکے کہتے تھے کہ: تم صبح جارہے ہو، ہم تمہارے پیچھے پیچھے شام کو آرہے ہیں، یا تم شام کو جارہے ہو، ہم صبح کو پہنچ رہے ہیں۔ مطلب یہ کہ زیادہ فاصلہ نہیں ہے، مرنے والے کے درمیان اور پیچھے رہ جانے والے کے درمیان زیادہ فاصلہ نہیں ہے، بس صبح شام کا فرق ہے، صبح گئے یا شام کو گئے، ایک دن یا اس کا بھی کچھ حصہ پیچھے رہنے والوں کو مزید پورا کرنا ہے۔ اس کے بعد ارشاد فرماتے تھے کہ موت بڑی مؤثر نصیحت ہے، کسی جنازے کو دیکھنا، اس سے جتنی نصیحت حاصل ہوتی ہے، اتنی کسی چیز سے حاصل نہیں ہوتی، مگر عجیب بات ہے کہ غفلت بھی بہت جلدی طاری ہوجاتی ہے۔

مجذوبؒ کی نصیحت:

بقول ہمارے حضرت مجذوبؒ کے کہ:

دفن خود صدہا کیے زیر زمیں
تجھے مرنے کا نہیں پھر بھی یقیں

کچھ تو عبرت چاہئے، نفس لعین اپنے ہاتھ سے دفن کرتا ہے، لحد میں اتارا، بہت سارے لوگوں کو مرتے دیکھا، ان کے جنازے کے ساتھ گئے مگر ہمیں عبرت نہ ہوئی، بھول گئے۔

ایک بزرگ کی نصیحت:

ایک بزرگ فرماتے ہیں کہ جب تو قبر کی طرف کسی جنازہ کو اٹھا کے لے جائے تو پھر یوں سمجھا کر کہ اب کسی کو اٹھا کر لے جارہا ہوں، اس کے بعد میرا نمبر ہے، لوگ مجھے اٹھا کر لے جائیں گے۔

موت سب سے بڑا واعظ ہے:

پھر حضرت ابودرداءؓ رضی اللہ عنہ فرماتے تھے کہ موت کافی واعظ و نصیحت کرنے والا ہے، اس سے بڑا کوئی واعظ نہیں، کیونکہ واعظ صاحب یہی کہیں گے کہ مرجاؤ گے، تم کو حساب کتاب دینا ہوگا، اس غریب کے تو الفاظ ہی الفاظ ہیں، لیکن موت تو سامنے نقشہ کھینچ دیتی ہے کہ ایک جنازے کو دیکھ کر پورا منظر ہمارے سامنے آجاتا ہے، موت مشاہدہ کروادیتی ہے، تو اس سے بڑھ کر واعظ کون ہوسکتا ہے؟ اور جس کو اس بڑے واعظ سے بھی نصیحت نہ ہوئی، وہ اس چھوٹے واعظ سے نصیحت کیسے حاصل کرسکتا ہے؟

عقل، فہم، سوچ اور تحمل کا فقدان:

شیخ فرماتے ہیں کہ لوگ یکے بعد دیگرے، ایک کے پیچھے دوسرا، دوسرے کے پیچھے تیسرا، ایک لائن لگی ہوئی ہے اور پیچھے وہ لوگ رہ جاتے ہیں جن کے پاس نہ عقل، نہ فہم، نہ سوچ، نہ حوصلہ و تحمل، مرنے والا مرگیا، پیچھے بھائی جائیداد پر لڑ رہے ہیں، باپ کے جانے کے بعد اولاد اس کی وراثت میں لڑ رہی ہے، اتنا نہیں سوچتے کہ جس نے اس مال کو بڑی محنت سے جمع کیا، رات کی نیند اور دن کی راحت اس کے لئے قربان کی، سختی اور گرمی برداشت کی، اس مال نے اس کے ساتھ وفا نہ کی، ہمارے ساتھ کیا کرے گا؟ لیکن لڑ رہے ہیں اور لڑتے بھی اس چیز پر ہیں جس کی واقعتاً کوئی قیمت نہیں ہے، بے قیمت چیز پر لڑ رہے ہیں، اس لئے کہ اگر کسی کو تھوڑی ملی جب بھی، زیادہ ملی جب بھی، گزر تو اس کی ہو ہی جائے گی، الحمدللہ! وقت گزر جائے گا، لوگ پہلے اپنے لئے کماتے ہیں، جب بوڑھے ہوجاتے ہیں تو پھر اولاد کا خیال آتا ہے کہ ان کے لئے پیچھے چھوڑ کر جائیں، خلاصہ یہ ہے کہ موت سے نصیحت حاصل کرنی چاہیے۔

حضرت عزرائیل علیہ السلام کی اطلاع کا انداز:

ہمارے شیخ نور اللہ مرقدہٗ نے ایک قصہ لکھا ہے کہ: ایک شخص کی حضرت عزرائیل علیہ السلام کے ساتھ دوستی ہوگئی تھی، تو اس سے کہنے لگے کہ دوستی کا حق بھی ادا کرو گے؟ حضرت عزرائیل علیہ السلام کہنے لگے: فرمایئے! کہنے لگے کہ: جانے کا وقت آئے تو مجھے پہلے ہی بتا دینا، تاکہ میں کچھ تیاری کرلوں۔ حضرت عزرائیل علیہ السلام کہنے لگے کہ: بہت اچھا! کچھ مدت کے بعد حضرت عزرائیل علیہ السلام کہنے لگے کہ: چلئے! پوچھنے لگے کہ: وقت ہوگیا؟ فرمایا کہ: ہاں وقت ہوگیا! کہنے لگے کہ: یار میں نے کہا تھا کہ مجھے پہلے بتا دینا! فرمایا کہ: میں نے بتایا تو تھا، لیکن آپ نے میری

زبان سمجھی نہیں، آپ کو یاد ہوگا کہ ایک دن میں اُس طرف آیا تھا، اور ایک دن میں اِس طرف آیا تھا۔ کہنے لگے کہ: ہاں یہ تو معلوم ہے! فرمایا کہ: تجھے بتانے کے لئے آیا تھا کہ تیرا وقت قریب آگیا ہے، تو تیاری کرلے، ہم اسی زبان میں بتایا کرتے ہیں، ہم نے بتادیا تھا، لیکن تم نے سمجھا نہیں۔

جو باپ کی موت سے نصیحت نہ پکڑے:

حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کی خدمت میں ایک شخص حاضر ہوا، کہنے لگا کہ حضرت جی! مجھے نصیحت فرمائیں۔ آپ نے فرمایا کہ: برخوردار! تیرے والد زندہ ہیں؟ اس آدمی نے کہا: نہیں! فرمایا: میری مجلس سے اٹھ جا، جس کو باپ کی موت نے نصیحت نہیں کی، اس کو عمر بن عبدالعزیز کیا نصیحت کرسکتا ہے؟ باپ کے مرنے پر جس کو عبرت نہیں ملی، اس کو اور کیا نصیحت ہوسکتی ہے؟

ہماری حماقت کی شکلیں:

کسی کے مرنے پر روتے پیٹتے بھی ہیں، اپنے اپنے رنگ میں افسوس بھی کرتے ہیں، کوئی کہتا ہے کہ اچھا خاصا آدمی تھا، اس کے کھانے پینے کے دن تھے، چلا گیا۔ کیا آگے جاکر وہ بھوکا رہے گا؟ کھانے پینے کے دن یہی تھے؟ اگلے جہاں کا اعتماد نہیں ہے؟ مؤمن کے کھانے پینے کی جگہ یہ نہیں، کھانے پینے کی جگہ تو آگے ہے۔

جس نے پیدا کیا وہی کفالت بھی کرے گا:

کوئی کہتا ہے کہ چھوٹے چھوٹے بچے چھوڑ گیا ہے، کیا پہلے بچوں کی خدائی اس پر تھی؟ جس مالک نے بچوں کو پیدا کیا ہے، وہ ان کی تربیت بھی کرے گا، میں نے اور آپ نے سینکڑوں مثالیں اس کی دیکھی ہوں گی کہ والدین موجود ہیں اور اولاد نالائق ہے، اور میں نے اور آپ نے بہت ساری مثالیں اس کی بھی دیکھی ہوں گی کہ باپ کی شکل اور ماں کی شکل دیکھنا نصیب نہیں ہوئی، لیکن یہ یتیم بچے ایسے لائق و فائق

ہوئے کہ کیا کہنے! ظاہری تربیت اور باطنی تربیت، جسمانی تربیت بھی، روحانی تربیت بھی ماں باپ پر منحصر نہیں۔

والدین کی حیثیت سرکاری ملازم کی ہے:

والدین کو اللہ تعالیٰ نے ذریعہ ضرورت بنایا ہے اور اس اعتبار سے والدین، اولاد کے سب سے بڑے محسن ہیں، لیکن والدین کی حیثیت سرکاری ملازم کی ہے اور سرکار کو حق پہنچتا ہے کہ اپنے ملازم بدل دے، والدین کے بجائے کسی اور کو ان کی تربیت پر مقرر کردے۔

یتیم سے محبت کا راز!

یہی وجہ ہے کہ جس بچے کے والدین انتقال کرجاتے ہیں، اللہ تعالیٰ والدین کی شفقت و محبت کو لوگوں کے دلوں میں تقسیم کردیتا ہے، فطری طور پر ہر شخص کی یتیم بچے کے ساتھ شفقت، محبت اور رحمت ہوتی ہے، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اس کی ترغیب دلائی ہے، چنانچہ ارشاد فرماتے ہیں:

''مَنْ مَسَحَ رَأْسَ یَتِیْمٍ لَّمْ یَمْسَحُهُ اِلَّا لِلّٰہِ کَانَ لَهٗ بِکُلِّ شَعْرَةٍ یَمُرُّ عَلَیْهَا یَدَهٗ حَسَنَاتٍ.....''

(مشکوٰۃ ص:۴۲۳)

ترجمہ:...... ''جو شخص اللہ کی رضا کے لئے کسی یتیم کے سر پر ہاتھ پھیرے اس کے ہاتھ کے نیچے جتنے بال آئیں گے، اتنی ہی نیکیاں ملیں گی۔''

دوسری روایت میں ہے:

''اِنَّ رَجُلًا شَکَا اِلَی النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَسْوَۃَ قَلْبِهٖ، قَالَ: اِمْسَحْ رَأْسَ الْیَتِیْمِ وَاَطْعِمِ الْمِسْکِیْنَ۔''

(مشکوٰۃ ص:۴۲۵)

ترجمہ:......''ایک صاحب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں حاضر ہوئے، کہا: یا رسول اللہ! کچھ دل میں سختی معلوم ہوتی ہے۔ فرمایا: یتیم کے سر پر ہاتھ پھیرا کر اور مسکین کو کھانا کھلایا کر، دل کی سختی دور ہوجائے گی۔''

یتیموں سے محبت کی ترغیب:

یتیموں کے ساتھ رحمت کرنا، پیار کرنا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی ترغیب دلائی ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ والدین کی جگہ اب دوسرے لوگوں کو ان کی تعلیم وتربیت پر مقرر کردیا گیا ہے، اللہ تعالیٰ اپنے مقبول بندوں کا تذکرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''وَيُطْعِمُوْنَ الطَّعَامَ عَلٰى حُبِّهٖ مِسْكِيْنًا وَّيَتِيْمًا وَّاَسِيْرًا۔ اِنَّمَا نُطْعِمُكُمْ لِوَجْهِ اللّٰهِ۔'' (الدہر:۸)

ترجمہ:......''اور کھانا کھلاتے ہیں اس کی محبت پر (اس کھانے کی یا اللہ تعالیٰ کی) مسکین کو، یتیم کو اور قیدی کو محض اللہ کی رضا کے لئے۔''

مسکین اپنی مسکنت کی وجہ سے کھانا کھلانے کا مستحق ہے۔

مسکین سکون سے ماخوذ ہے:

علماء فرماتے ہیں کہ مسکین کا لفظ ''سکون'' سے لیا گیا ہے کہ جب آدمی کے پاس مال ہوتا ہے تو ایسا ہوتا ہے جیسے بدن میں طاقت، بدن میں طاقت ہوتی ہے تو حرکت کرتا ہے، چلتا پھرتا ہے اور پہلوانی کرتا ہے لیکن جب طاقت نہیں ہوتی تو بستر سے لگا ہوا ہوتا ہے، حرکت نہیں کرسکتا، اسی طرح جب اس کے پاس مال ہوتا ہے تو ہواؤں میں اڑتا ہے اور مال نہیں ہوتا تو کہیں آجا بھی نہیں سکتا۔ تو مسکنت بھی ایک قسم

کا سکون پیدا کر دیتی ہے، تو ان مسکینوں کو مسکینی کی وجہ سے کھانا کھلانا، یتیم کو اس کی یتیمی کی وجہ سے کھانا کھلانا، یعنی یتیم کے حال پر شفقت کرنا اور قیدی کو کھانا کھلانا اسی وجہ سے ہے، اس لئے کہ جیل کی چاردیواری میں ان کو دنیا سے کاٹ دیا گیا۔ سیدنا حضرت یوسف علیہ السلام جیل سے رہا ہوئے تھے تو کہتے ہیں کہ جیل کے دروازے کے اوپر لکھ کر آئے تھے کہ تو زندوں کی قبر ہے۔

اپنی اور بچوں کی دنیا کی فکر ہے، مگر آخرت کی پرواہ نہیں:

تو عرض کر رہا تھا کہ والدین تو سرکاری ملازم ہیں، آپ کی تربیت ان کے اختیار میں نہیں، تربیت کے اسباب اللہ تعالیٰ پیدا فرمادیتے ہیں، یہ تو ملازم ہیں، مویشی کو چارہ ڈالنے والے۔ اور مالک کو حق ہے کہ ایک ملازم کی جگہ دوسرا ملازم رکھے، تو ہم لوگ پہلے تو اپنی فکر کرتے ہیں کہ ہماری زندگی کیسے گزرے گی؟ اور خود بوڑھے ہو جاتے ہیں تو اپنی زندگی سے مایوس ہو جاتے ہیں، لیکن اولاد کی فکر ستائے رکھتی ہے، کسی وقت بھی چین نہیں ہے، کسی وقت بھی سکون نصیب نہ ہوا اور جو چیز فکر کی تھی، اس کے لئے ہم کبھی پریشان نہیں ہوئے، جو آتا ہے کہتا ہے کہ پریشان ہوں، بہت پریشان ہوں۔ کیا ہوا بھائی؟ ملازمت نہیں ہے، ملازمت ختم ہوگئی ہے، کوئی کہتا ہے کہ میں بیمار ہوں، کوئی کچھ کہتا ہے، کوئی کچھ کہتا ہے، لیکن ساری پریشانیاں اپنی دنیاوی ماحول کی ذکر کرتے ہیں، مرنے کے بعد قبر میں بھی کوئی پریشانی ہوگی کہ نہیں؟ تذکرہ ہی نہیں کرتے کہ مجھے یہ پریشانی لاحق ہے کہ مرنے کے بعد میرا کیا حال ہوگا؟

غفلت کا غلبہ:

اس کو کہتے ہیں غفلت! ہم پر بہت تیزی سے غفلت طاری ہو جاتی ہے میت کو اپنے ہاتھوں سے دفن کر کے آئے اور فاتحہ پڑھ لی بس، سب اپنے اپنے کام میں لگ گئے، وہی لڑائی، وہی جھگڑا، وہی دھوکا، وہی دغابازی، وہی دنیا کے دھندے، وہی

آخرت سے نفرت، وہی اللہ تعالیٰ سے نافرمانی، کوئی فرق نہیں پڑتا۔

تم لوگ جانتے ہو کہ (میرے گھر میں تو ٹی وی نہیں ہے) میت ہوجانے پر کتنے دن ٹی وی بند رکھتے ہو؟ غالبًا ''تیجے'' تک تو بند رکھتے ہوں گے، میت کا تیجا ہوگیا، تمہارا ٹی وی چالو ہوگیا، انا للہ وانا الیہ راجعون!

موت سے عبرت ہو تو زندگیاں بن جائیں

اے کاش! کہ مرنے والوں سے زندوں کو عبرت ہوجاتی تو زندگیاں بن جاتیں، وہ بے چارہ جانے والا تو لوٹ کر نہیں آتا اور ہم جانے والوں سے عبرت حاصل نہیں کرتے۔

مرنے والوں کی تمنا:

جانے والوں سے اگر کہا جائے تم کو واپس لوٹاتے ہیں لیکن دنیا میں تم کو کیا چیز چاہئے؟ وہ کہے گا کہ کچھ نہیں چاہئے صرف اللہ تعالیٰ کی عبادت کروں گا، دو چار لمحات مجھے اور مل جائیں گے تو میں توبہ و استغفار کرلوں گا، قرآن کریم میں ہے قیامت کے دن کفار بھی کہیں گے کہ:

''فَقَالُوْا یٰلَیْتَنَا نُرَدُّ وَلَا نُکَذِّبَ بِاٰیٰتِ رَبِّنَا وَنَکُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ..... وَلَوْ رُدُّوْا لَعَادُوْا لِمَا نُھُوْا عَنْهُ وَاِنَّھُمْ لَکٰذِبُوْنَ۔'' (الانعام:۲۷،۲۸)

ترجمہ:...... ''کاش! ہم کو واپس لوٹا دے اور اس کے بعد ہم کسی قسم کی کوتاہی نہیں کریں گے ..... اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ یہ جھوٹ بولتے ہیں، اگر ان کو واپس کردیا جائے تو یہ پھر وہی حرکتیں کریں گے جو کرتے آئے ہیں۔''

اب تو تلچھٹ باقی ہے:

یہاں کے جہان کی آب و ہوا ایسی آلودہ ہے جیسے کہتے ہیں کہ کراچی میں بہت آلودگی ہے، یہاں کی آب و ہوا غفلت سے آلودہ ہے، یہاں آئیں گے، پھر بھول جائیں گے اور حدیث شریف میں آتا ہے کہ:

''لَتُنْتَقَوُنَّ كَمَا يُنْتَقَى التَّمْرُ مِنْ اَغْفَالِهِ فَلْيَذْهَبَنَّ خِيَارُكُمْ۔'' (ابن ماجہ ص: ۲۹۲)

ترجمہ:......''نیک لوگ یکے بعد دیگرے چلے جائیں گے حتیٰ کہ لوگوں کی تلچھٹ پیچھے رہ جائے گی، جیسے کھجوروں کی اور جو کی تلچھٹ رہ جاتی ہے۔''

یہاں تک کہ لوگوں کی تلچھٹ پیچھے رہ جائے گی، برتن میں کھجوریں رکھی ہوئی ہیں اور لوگ چن چن کر کھاتے رہتے ہیں اور گندی کھجوریں رہ جاتی ہیں، اور پھر گندی کھجوروں میں سے جو اچھی ہوتی ہیں، ان کو چن چن کر کھالیتے ہیں، پیچھے ایسی رہ جاتی ہیں کہ وہ کھانے کے قابل نہیں ہوتیں، فرمایا کہ اسی طرح اللہ تعالیٰ چھانٹ چھانٹ کر لوگوں کو اٹھاتے رہیں گے، پیچھے رہ جائیں گے بالکل تلچھٹ اور اللہ تعالیٰ ان کی کوئی پرواہ نہیں کرے گا۔

میں تو اللہ تعالیٰ سے کہا کرتا ہوں کہ ہم تو تلچھٹ رہ گئے ہیں، ہماری آپ کو کیا پرواہ ہے! یہی وجہ ہے کہ ایک عورت کو ہم پر مسلط کیا ہوا ہے، ظالم حکومت کو ہم پر مسلط کیا ہوا ہے، ڈاکو اور چور ہم پر مسلط ہیں، انسانی قیمت باقی نہیں رہی، ہمارے اندر انسانیت باقی نہیں رہی۔

دنیا میں مکمل راحت نہیں ملے گی:

دوسری روایت میں عون بن عبداللہ کہتے ہیں کہ حضرت ابودردائؓ رضی اللہ عنہ

نے ان کو نصیحت کرتے ہوئے فرمایا: جو شخص راحت وسکون کی تلاش میں مارا مارا پھرے، وہ عاجز آ کر تھک جائے گا، لیکن یہ چیز نہیں ملے گی، اس جہاں کا خمیر ہی ایسا تیار کیا ہے کہ کوئی شخص اگر چاہے تو نہیں ملے گی، دنیا میں ہے ہی نہیں تو آپ ایسی چیز کو تلاش کرنے چلے ہیں جس کا وجود ہی نہیں، ہم میں سے ہر شخص اس کا خواہش مند ہے کہ راحت وسکون ملے، کوئی پریشانی نہ ہو، کوئی بیماری نہ ہو، تو اس جہاں میں یہ چیز نہیں ملتی، حضرت! کسی اور جہاں میں تلاش کریں، اس جہاں میں قدم رکھا ہے تو یہ سوچ کر رکھیں کہ یہاں مسئلہ ملا جلا ہے، سکون بھی ہے، ساتھ پریشانی بھی ہے، راحت بھی ہے، تکلیف بھی ہے، یہاں کوئی راحت ایسی نہیں جس کے آگے پیچھے کوئی تکلیف نہ ہو اور کوئی تکلیف ایسی نہیں جس کے پیچھے راحت نہ ہو۔

دنیا میں پھر راحتیں ہی راحتیں ہیں:

آپ بیمار پڑ گئے، تکلیف کی چیز ہے، لیکن ذرا غور فرمائیں کہ اللہ تعالیٰ نے آگے پیچھے کتنی رحمتیں رکھی ہیں؟ گھر ہے رہنے کے لئے، پانی پینے کے لئے، کھانا کھانے کے لئے، دوائی وغیرہ پیدا کر دی ہے، اللہ تعالیٰ نے تیماردار پیدا کر دیئے ہیں، معاون پیدا کر دیئے ہیں، پوچھنے والے پیدا کر دیئے ہیں، آپ کی ایک بیماری کتنی راحتوں کا سامان بن گئی ہے، اور آپ کی ایک بیماری نے کتنے خدام کو خدمت کا موقع دے دیا، یہ سب کی سب نعمتیں نہیں تو اور کیا ہے؟ لیکن اگر قبر میں خدانخواستہ کسی کو تکلیف ہوگئی تو کوئی پوچھنے والا ہوگا؟

دنیا میں ایک جہان ہماری خدمت پر مامور ہے:

اگر ہم دنیا میں بیمار ہوجائیں تو کوئی سر دبا دے گا، کوئی پاؤں دبا دے گا، کوئی کہتا ہے کہ میں پانی آپ کے لئے لے کر آؤں؟ اور کوئی کہتا ہے کہ میں ڈاکٹر کو بلا لاتا ہوں؟ کوئی کہتا ہے کہ سر درد کی گولی کھالو، قبر میں کوئی ہوگا؟ ایک لقمہ آپ

کھاتے ہیں، کتنا لذیذ ہے، لیکن آگے پیچھے اس کے کتنی مشقتیں ملادی ہیں، اس کے بارے میں تو سوچئے! کھانے کے دسترخوان پر آنے سے پہلے پہلے اس پر کتنی محنت لگائی گئی ہے؟ اور ایک عالم کا عالم، جہاں کا جہاں اس کی تیاری میں مصروف رہا ہے، ہمیں تو پسند نہیں آتی روٹی، اور ہم تو لذیذ ہونے نہ ہونے کے فیصلے کے بعد جلدی سے بیٹھنے کی کرتے ہیں، لیکن تم نے کبھی غور بھی کیا کہ مالک نے اپنے کارخانہ کے کتنے ملازموں کو استعمال کیا ہے؟ آسمان والوں کو بھی، زمین والوں کو بھی، اللہ تعالیٰ نے ان غذاؤں کو تیار کرنے کے لئے فرشتوں کو، ہوا کو، سورج کی روشنی کو، چاند کی چاندنی کو، گرمی اور سردی کو، زمین کی حرارت کو، پانی کو اور دوسرے جو محنت کرنے والے ہوتے ہیں کسان، ان کی محنت کو، ذرا غور تو فرمائیں اور اندازہ تو لگائیں، آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ اس ایک لقمہ کی تیاری پر کارخانۂ عالم کا کتنا خرچ آیا ہوگا؟ اور حضرت کو پسند نہیں آئی! کھانے کے دسترخوان پر آنے سے پہلے اس پر کتنی مشقتیں ہوئیں۔

انسان کے جسم کے اندر کا کارخانہ:

آپ نے لقمہ منہ میں ڈال لیا اور آپ اندازہ فرمائیں کہ اس چبانے پر آپ کی کتنی قوت استعمال ہو رہی ہے، کسی حکیم، ڈاکٹر سے پوچھیں کہ اس کے چبانے پر کتنی رگیں حرکت کرتی ہیں؟ اور یہ کارخانہ خدائی کے لشکر ہیں جو خدمت میں لگے ہوئے ہیں، پھر آپ نے لقمہ اندر پہنچا دیا، معدہ نے وصول کیا۔

میں چھوٹا بچہ تھا تو مجھے اس پر بہت تعجب ہوتا تھا کہ سائیکل میں ہوا بھر دیتے ہیں، لیکن نکلتی نہیں ہے، تو میں نے کہا کہ جب ہوا داخل کرتے ہیں ٹائر کے اندر تو پھر اس کو باہر بھی نکل جانا چاہئے، یہ جو اس کے اندر وال ہوتا ہے، اس کا فلسفہ میری سمجھ میں نہیں آیا تھا، آپ نے اپنے معدہ میں داخل تو کر لیا، تو آپ غور فرمائیں کہ اللہ تعالیٰ اس پر ڈھکن دے دیتے ہیں، پھر اس کو نکلنے نہیں دیتے اور خدانخواستہ اگر نکلے تو

پھر ہر وقت قے ہوتی رہے، یہ چھوٹا سا انتظام ہے۔

پھر اس کے بعد جگر کی قوتیں الگ الگ ہیں، قوت جاذبہ الگ ہے، قوت ماسکہ الگ ہے، ہاضمہ کی قوت الگ ہے، وہ اپنے کام کر رہے ہیں، اور جگر اپنا کام کرتا ہے، پھر انتڑیوں میں پہنچایا جاتا ہے، وہ اپنا کام کرتی ہیں۔ یہاں اوپر کے راستے سے اندر پہنچانے تک اور خالی ہونے والے راستے سے خارج ہونے تک، کتنے مراحل اس پر گزرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ نے کتنی مشینیں اندر لگا رکھی ہیں تو یہ آسانی سے کھاتے نہیں ہیں، بلکہ اس پر بھی طاقت صرف ہوتی ہے۔

شادی کی آفتیں:

اسی طرح شادی کرتے ہیں، گھر آباد کرتے ہیں، لیکن کتنی آفتیں شادی ساتھ لے کر آتی ہے، اس سے پوچھو، حضرت علی رضی اللہ عنہ سے کسی نے پوچھا تھا کہ: حضرت! شادی کی کیا تعریف ہے؟ فرمایا: "سُرُوْرُ شَهْرٍ!" ایک ماہ کی خوشی، اس کا نام شادی رکھا، شادی خوشی کو کہتے ہیں۔ عرض کیا گیا: اس کے بعد پھر کیا ہوتا ہے؟ فرمایا: "لُزُوْمُ مَهْرٍ" مہر لازم آجاتا ہے، اس کے بعد "غُمُوْمُ دَهْرٍ" دنیا بھر کے، زمانے بھر کے فکر۔ کہا کہ: پھر کیا ہوتا ہے؟ فرمایا: "كُسُوْرُ ظَهْرٍ" کمر ٹیڑھی ہوجاتی ہے! تو کون سی خوشی یہاں ایسی ہے جو مشقت کے اندر لپٹی ہوئی نہ ہو اور کون سی مشقت ایسی ہے جس کے اردگرد انعاماتِ الٰہیہ کا احاطہ نہ ہو؟ اگر آپ چاہیں ہر وقت یہاں خوشی ملا کرے، تو آپ ایک ایسی چیز کے طالب بن کر جا رہے ہیں، جو اس دنیا میں نہیں پائی جاتی، اس پر حضرت ابو درداءؓ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: جو شخص کسی چیز کو ڈھونڈنے کے لئے نکلے گا، اس کو گم پائے گا۔

ان تمام مسائل کا حل صبر ہے:

یہاں بہت سارے امور ایسے پیش آجاتے ہیں، بلکہ کہنا چاہئے کہ قدم قدم

پر پیش آتے ہیں، جو آدمی کے سینے کو چھلنی کردیتے ہیں، دل کو زخمی کردیتے ہیں، دردمند کردیتے ہیں، آدمی بلبلا اٹھتا ہے، بہت اچھا! لیکن چارہ کیا ہے؟ اس کا علاج کیا ہے؟ ''صبر'' اس کا علاج ہے! اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ:

''وَلَنَبْلُوَنَّكُم بِشَىْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَالْاَنْفُسِ وَالثَّمَرَاتِ وَبَشِّرِ الصَّابِرِيْنَ الَّذِيْنَ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌ قَالُوْٓا اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ۔'' (البقرہ:۱۵۶)

ہم تمہاری آزمائش کریں گے اور واللہ! آزمائش کریں گے، قسم کھا کر فرماتے ہیں، ان کی تاکید کا نام ''قسم'' ہے، بخدا! ہم تمہاری ضرور بالضرور آزمائش کریں گے اور یہ تمہاری آزمائش کے لئے جو ہورہا ہے، تم امتحان میں بیٹھے ہو، ممتحن تمہارے نمبر لگائے گا، ویسے ہی امتحان نہیں لیا جاتا، اس کو نمبر دیئے جاتے ہیں، ''پاس'' اور ''فیل'' کا فیصلہ کیا جاتا ہے، پھر ''پاس'' ہے تو اعلیٰ درجہ کے نمبر ہیں یا کم درجہ کے نمبر ہیں یا درمیانے درجہ کے نمبر ہیں، تو ہم تمہاری آزمائش کریں گے۔ پرچہ کیا ہے جس کا امتحان ہوگا؟ خوف دے کر، جان مال اور پھلوں میں کمی دے کر تمہاری آزمائش کریں گے اور صبر کرنے والوں کو خوشخبری دیں گے، تمہارے صبر کا امتحان ہے، تم جانتے ہو کہ جتنا کوئی حوصلہ رکھتا ہے اتنا بڑا آدمی ہوتا ہے اور جتنا کم ظرف ہوتا ہے، اتنا ہی چھوٹا ہوتا ہے۔ جو لوگ صبر کرنے والے ہیں، ان کو خوشخبری دے دیجئے، اللہ تعالیٰ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرما رہے ہیں، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے خوشخبری سن کر مسلمانوں کو کتنی تسکین ہوگی۔

صابر کون ہیں؟

صابرین کون ہیں؟ جب ان کو کوئی سی بھی مصیبت پہنچے، علمأ فرماتے ہیں

''مصیبةٌ'' پر تنوین تنکیر کی ہے، یعنی چھوٹی سے چھوٹی مصیبت بھی پہنچے، بڑی تو ہے ہی، اگر چھوٹی سے چھوٹی مصیبت بھی اُنہیں پہنچے تو کہتے ہیں کہ ہم اللہ کے لئے ہیں اور اللہ کی طرف لوٹنے والے ہیں، ہم اللہ کا مال ہیں اور مالک کو حق پہنچتا ہے جیسے چاہے تصرف کرے، تو کوئی شکایت نہیں کرتے۔ جیسے آپ کپڑا خرید کر لائے ہیں، چاہیں تو اس کے تکیے گدّے بنالیں، چاہے پردے بنالیں اور چاہے اپنا لباس تیار کرلیں۔

کسی کے سینے سے لگنا آسان نہیں:

اکابر رحمہم اللہ فرماتے ہیں کہ ایک لباس کو دیکھ لو، کن مراحل سے گزرتا ہوا تمہارے سینے سے لگا ہے؟ سب سے آخر میں درزی نے اس کے بند بند پر اس کی تار تار پر سوئیاں چبھوئی ہیں، تب تمہارے پہننے کے قابل ہوا ہے۔ کسی کے سینے سے لگنا آسان کام ہے اور پھر جب ذرا سا میلا ہوتا ہے تو اس کو دھلائی کے لئے دیتے ہیں اور پھر دھوبی اس کو پٹختا ہے، جب کوئی مصیبت پہنچے تو کہتے ہیں انا للہ! ہم اللہ کے ہیں، ہمارے ساتھ جو معاملہ ہو رہا ہے، مالک کی جانب سے ہو رہا ہے، اور وہ مالک رحیم ہے، کریم ہے، شفیق ہے، ہمارا خیر خواہ ہے، وہ حکیم ہے، جو معاملہ بھی کرتا ہے ہمارے ساتھ حکمت کا کرتا ہے۔

اللہ شفیق اور حکیم ہیں:

بعض لوگ شفیق ہوتے ہیں، لیکن حکیم نہیں ہوتے، بعض لوگ حکیم ہوتے ہیں مگر شفیق نہیں ہوتے، ہمارا مالک ایسا ہے، وہ سب سے زیادہ رحیم ہے اور شفیق بھی ہے اور حکیم بھی ہے، اور جب اس کی شفقت پر اور حکمت پر اعتماد ہے تو تم کیوں گھبراتے ہو؟ پریشانی سے خوش ہوجاؤ، الحمدللہ! بچہ تو نادان ہوتا ہے، ماں کپڑے اتار کر ذرا سا پانی میں ڈال دیتی ہے تو بچہ چیخنے چلانے لگتا ہے، حالانکہ بزرگ فرماتے ہیں کہ آدمی کھا کر تو پریشان ہوجاتا ہے، مگر نہا کر نہیں پریشان ہوتا، وہ یہی تو کرے گی

کہ میل اتار دے گی، بدن صاف کردے گی، لیکن نادان ہے، اپنی ماں کی اتنی شفقت پر بھی اس کو اعتماد نہیں۔ اے انسان! تو بچے سے بھی زیادہ نادان ہے کہ اپنے مالک کی شفقت پر تجھ کو اعتماد نہیں، تھوڑی سی مزاج کے خلاف بات ہوجاتی ہے تو چیختا ہے، چلاتا ہے، انا للہ! ہم اللہ کے لئے ہیں، وانا الیہ راجعون! اور ہم اس کی طرف لوٹ کر جانے والے ہیں، ایک ادنیٰ سے ادنیٰ چیز پر بھی ہمیں اجر وثواب عطا فرماتے ہیں، حتیٰ کہ ایک بندہ کے پیسے جیب میں تھے، ایک کونے میں تلاش کرتا رہا، مگر دوسرے کونے میں پیسے پڑے ہوئے تھے، اتنی جو پریشانی ہوئی اللہ تعالیٰ اس پر بھی اجر وثواب عطا فرماتے ہیں۔

یہ وہ لوگ ہیں جن پر ان کے مالک کی طرف سے، ان کے رب کی طرف سے شاباش اور رحمتیں ہیں اور عنایات ہیں، یہ ہی سیدھے راستے پر ہیں۔ تمام مسائل کا علاج ''صبر'' ہے، حضرت ابودرداءؓ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: جو شخص صبر کو ان تکالیف کے لئے ڈھال نہیں بناتا، وہ عاجز ہوکر رہ جائے گا۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

جھوٹی گواہی، بدترین سود اور شرک

جھوٹ ایک ایسی برائی ہے جو کسی مذہب وملت میں اور کسی انسانی معاشرے میں اچھی نہیں سمجھی جاتی، بے دین سے بے دین معاشرے میں بھی جھوٹ کو برا سمجھا جاتا ہے۔ تمام معاشروں کا سنگِ بنیاد یہ ہے کہ افراد ایک دوسرے پر اعتماد کریں، اگر آپ ایسا معاشرہ فرض کرتے ہیں جس میں کسی آدم کو دوسرے پر اعتماد نہ ہو تو اس کو معاشرہ کہنا صحیح نہیں، اسی طرح اگر ایک گھر میں کسی کو کسی پر اعتماد نہیں، تو آپ سوچ سکتے ہیں کہ اس گھر کی کیفیت کیا ہوگی؟ اسی طرح معاشرے کو سمجھ لیجئے، تو تمام معاشروں کا سنگِ بنیاد ہے ''اعتماد باہمی'' ایک دوسرے پر اعتماد کرنا، اس کے بغیر معاشرت قائم ہی نہیں ہوسکتی۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم
الحمدللہ وسلام علی عبادہ الذین اصطفی!

۱:......”عَنْ اَیْمَنَ بْنِ خُرَیْمٍ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ قَالَ: قَامَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ خَطِیْبًا، فَقَالَ: یَا اَیُّھَا النَّاسُ! عُدِلَتْ شَھَادَۃُ الزُّوْرِ اِشْرَاکًا بِاللّٰہِ۔ (قَالَھَا) ثَلَاثًا، ثُمَّ قَرَأَ: فَاجْتَنِبُوا الرِّجْسَ مِنَ الْاَوْثَانِ وَاجْتَنِبُوْا قَوْلَ الزُّوْرِ۔“
(مسند احمد ج:۴ ص:۱۷۸)

۲:......”عَنْ اَنَسِ بْنِ مَالِکٍ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ قَالَ: خَطَبَنَا رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَذَکَرَ اَمْرَ الرِّبَا وَعَظَّمَ شَأْنَہٗ وَقَالَ: اِنَّ الدِّرْھَمَ یُصِیْبُہُ الرَّجُلُ مِنَ الرِّبَا اَعْظَمُ عِنْدَ اللّٰہِ فِی الْخَطِیْئَۃِ مِنْ سِتٍّ وَّثَلَاثِیْنَ زَنْیَۃً یَزْنِیْھَا الرَّجُلُ، وَاِنَّ اَرْبَی الرِّبَا عِرْضُ الرَّجُلِ الْمُسْلِمِ۔“
(الترغیب والترہیب ج:۳ ص:۵۰۳)

۳:......”عَنْ اَبِیْ مُوْسَی الْاَشْعَرِیِّ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ قَالَ: خَطَبَنَا رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ ذَاتَ یَوْمٍ

فَقَالَ: یَا اَیُّھَا النَّاسُ! اِتَّقُوا الشِّرْکَ! فَاِنَّهٗ اَخْفٰی مِنْ دَبِیْبِ النَّمْلِ۔ فَقَالَ مَنْ شَاءَ اَنْ یَّقُوْلَ: وَکَیْفَ نَتَّقِیْهِ وَھُوَ اَخْفٰی مِنْ دَبِیْبِ النَّمْلِ یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ؟ قَالَ: قُوْلُوْا: اَللّٰھُمَّ اِنَّا نَعُوْذُ بِکَ اَنْ نُّشْرِکَ بِکَ وَنَحْنُ نَعْلَمُهٗ وَنَسْتَغْفِرُکَ لِمَا لَا نَعْلَمُهٗ۔" (کنز العمال ج:۲ ص:۱۶۹)

۱:......ترجمہ:......"حضرت ایمن بن خریم رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں خطبہ دیا، اس میں ارشاد فرمایا کہ: اے لوگو! جھوٹی شہادت شرک باللہ کے برابر ہے، یہ بات آپ نے تین مرتبہ ارشاد فرمائی، پھر آپ نے قرآن کریم کی یہ آیت کریمہ تلاوت فرمائی: "فَاجْتَنِبُوا الرِّجْسَ مِنَ الْاَوْثَانِ وَاجْتَنِبُوْا قَوْلَ الزُّوْرِ۔" سو تم بچو گندگی سے بتوں کی اور بچو جھوٹی بات سے۔"

۲:......ترجمہ:......"حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے خطبہ ارشاد فرمایا آپ نے سود کی قباحت اور شناعت بیان کی اور فرمایا ایک درہم سود جس کو آدمی حاصل کرتا ہے، اس کا گناہ اللہ کے نزدیک چھتیس مرتبہ زنا کرنے سے زیادہ ہے، اور بے شک سب سے بڑا سود کسی مسلمان آدمی کی عزت میں زبان کھولنا ہے۔"

۳:......ترجمہ:......"حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دن خطبہ دیا، فرمایا کہ: لوگو! شرک سے بچو! اس لئے کہ وہ چیونٹی کی چال سے بھی زیادہ پوشیدہ ہے۔ ایک آدمی نے کہا کہ: یا رسول اللہ!

جو چیز کہ چیونٹی کی چال سے بھی زیادہ پوشیدہ ہو، اس سے ہم کیسے بچیں؟ فرمایا کہ: یہ دعا کیا کرو کہ اے اللہ! ہم تیری پناہ چاہتے ہیں، اس بات سے کہ ہم تیرے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرائیں جان بوجھ کر، اور ہم استغفار کرتے ہیں تجھ سے اس چیز کا جس کو ہم جانتے نہیں۔"

یہ آنخضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے چھوٹے چھوٹے تین خطبے ہیں، جن میں بعض کبیرہ گناہوں کا بھی تذکرہ ہے۔

جھوٹی گواہی بت پرستی کے برابر ہے:

ان میں سے پہلی چیز جھوٹی گواہی دینا ہے۔ آنخضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بڑے اہتمام سے اس کے لئے خطبہ دیا اور ارشاد فرمایا کہ جھوٹی گواہی اللہ تعالیٰ کے ساتھ شریک ٹھہرانے کے برابر ہے، اور یہ بات مکرر تین مرتبہ ارشاد فرمائی، اور اس کے بعد آنخضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیت شریفہ تلاوت فرمائی:

"فَاجْتَنِبُوا الرِّجْسَ مِنَ الْاَوْثَانِ وَاجْتَنِبُوْا قَوْلَ الزُّوْرِ۔"

ترجمہ:......"سو تم لوگ گندگی سے جو کہ بت ہیں بچو، اور تم لوگ جھوٹی بات سے بچو۔"

بت پرستی اور جھوٹ بولنا یعنی جھوٹی گواہی دینا ان دونوں کو اللہ تعالیٰ نے ایک جگہ ذکر فرمایا، بت پرستی سے بچنے کی تلقین فرمائی، اور جھوٹ بولنے سے یعنی جھوٹی شہادت دینے سے بچنے کی تلقین فرمائی، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں کہ ان دونوں سے ایک ہی جگہ اللہ تعالیٰ کا منع فرمانا یہ گویا اس طرف اشارہ ہے کہ جھوٹی شہادت شرک باللہ کے برابر ہے، بت پرستی کے برابر ہے، جھوٹی گواہی دینا کسی

مسلمان کو نقصان پہنچانے کے لئے، اس کی عزت یا اس کے مال کا نقصان کرنے کے لئے ہے، ایسی گواہی ان سات گناہوں میں سے ہے جن کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اکبر الکبائر فرمایا، سب سے بڑے گناہ۔ ایک حدیث شریف میں ہے:

"اِجْتَنِبُوا السَّبعَ الْمُوبِقَاتِ! قَالُوا: یَا رَسُوْلَ اللهِ! وَمَا هُنَّ؟ قَالَ: اَلشِّرْکُ بِاللهِ، وَالسِّحْرُ، وَقَتْلُ النَّفْسِ الَّتِی حَرَّمَ اللهُ اِلَّا بِالْحَقِّ، وَاَکْلُ الرِّبٰوا، وَاَکْلُ مَالِ الْیَتِیْمِ، وَالتَّوَلِّیْ یَوْمَ الزَّحْفِ، وَقَذْفُ الْمُحْصَنَاتِ الْمُؤْمِنَاتِ الْغَافِلَاتِ۔" (مشکوٰۃ ص:۱۷)

ترجمہ:......"سات گناہ جو آدمی کو ہلاک تباہ کر کے چھوڑتے ہیں، ان سے بچو!

۱:......اللہ کے ساتھ شریک ٹھہرانا۔

۲:......اور جادو کرنا یا کرانا۔

۳:......ناحق کسی جان کو قتل کرنا۔

۴:......سود کھانا۔

۵:......یتیم کا مال کھانا۔

۶:......میدان جہاد سے بھاگنا۔

۷:......کسی پاک دامن پر تہمت لگانا۔"

اور صحیح بخاری کی روایت میں ہے کہ:

"اَلْکَبَائِرُ: اَلْاِشْرَاکُ بِاللهِ، وَعُقُوْقُ الْوَالِدَیْنِ، وَقَتْلُ النَّفْسِ، وَالْیَمِیْنُ الْغَمُوْسُ۔ وَفِیْ رِوَایَةٍ: شَهَادَةُ الزُّوْرِ۔" (مشکوٰۃ ص:۱۷)

ترجمہ:......"کبیرہ گناہ: اللہ کے ساتھ شرک کرنا، اور

والدین کی نافرمانی کرنا، ناحق قتل کرنا، اور جھوٹی گواہی دینا۔“

اور بخاری ہی کی ایک روایت میں ہے:

”وَجلَس وَکَانَ مُتَّکِئًا فقَال: اَلا وَقوْلَ الزُّورِ فَمَا زَالَ یُکرِّرُھَا حَتّٰی قُلْنَا لَیتَهٗ سَکتَ۔“

(صحیح بخاری ج:۱ ص:۳۶۲)

ترجمہ:...... ”آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سہارا لگائے ہوئے تشریف فرما تھے جب یہ بات ارشاد فرمائی تو سیدھے ہوکر بیٹھ گئے اور مکرر فرماتے رہے: ”وَقوْلَ الزُّورِ، وَقوْلَ الزُّورِ، وَقوْلَ الزُّورِ“ جھوٹی گواہی دینا، جھوٹی گواہی دینا، جھوٹی گواہی دینا۔ صحابہؓ فرماتے ہیں کہ: ”حَتّٰی قُلْنَا لَیتَهٗ سَکتَ!“ یہاں تک کہ ہم نے کہا کاش! آپ ﷺ خاموش ہوجائیں، اور ہمیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر ترس آنے لگا، اسی کو یمین غموس (جھوٹی قسم) کہتے ہیں۔“

جھوٹی قسم کا وبال:

جھوٹی قسم کھانا یہ بھی کبیرہ گناہوں میں سے ہے، اور غموس کا لفظ غمس سے ہے، غمس کے معنی غوطہ دینا اور ڈبو دینا یعنی جھوٹی قسم آدمی کو ڈبونے والی ہے۔

مجھے لوگ خطوط لکھتے رہتے ہیں، بہت سارے لوگوں نے یہ لکھا ہے کہ قرآن کریم کی جھوٹی قسم کھائی تھی، اور اس وقت سے آج تک عذاب میں مبتلا ہوں، کیا کروں؟ لوگ قرآن کی جھوٹی قسم کھاتے ہیں اور جھوٹ موٹ سے قرآن کریم سر پر اٹھالیتے ہیں، پھر قرآن کی مار پڑتی ہے تو روتے ہیں، اول تو آدمی کو جھوٹ بولنا ہی نہیں چاہیے اس لئے کہ ایک حدیث شریف میں فرمایا گیا ہے کہ: بندہ سچ بولتا ہے اور سچ بولنے کا اہتمام کرتا ہے، ”حَتّٰی یُکْتَبَ عِنْدَ اللّٰہِ صِدِّیْقًا۔“ (مشکوٰۃ ص:۴۱۲)

یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ کے دفتر میں اس کا نام صدیق لکھ دیا جاتا ہے، بہت سچ بولنے والا کہ رگ و پے میں صدق ہی صدق ہے، اور ایک بندہ جھوٹ بولتا ہے اور پرواہ نہیں کرتا جھوٹ بولتا ہی رہتا ہے، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ کے دفتر میں کذاب لکھ دیا جاتا ہے، جھوٹا، نعوذ باللہ! استغفر اللہ!

جھوٹ کسی مذہب و ملت میں اچھا نہیں:

جھوٹ ایک ایسی برائی ہے جو کسی مذہب و ملت میں اور کسی انسانی معاشرے میں اچھی نہیں سمجھی جاتی، بے دین سے بے دین معاشرے میں بھی جھوٹ کو برا سمجھا جاتا ہے۔

معاشرہ کا سنگ بنیاد:

بات یہ ہے کہ تمام معاشروں کا سنگِ بنیاد یہ ہے کہ افراد ایک دوسرے پر اعتماد کریں، اگر آپ ایسا معاشرہ فرض کرتے ہیں جس میں کسی آدم کو دوسرے پر اعتماد نہ ہو تو اس کو معاشرہ کہنا صحیح نہیں، اسی طرح اگر ایک گھر میں کسی کو کسی پر اعتماد نہیں، تو آپ سوچ سکتے ہیں کہ اس گھر کی کیفیت کیا ہوگی؟ اسی طرح معاشرے کو سمجھ لیجئے، تو تمام معاشروں کا سنگِ بنیاد ہے "اعتماد باہمی" ایک دوسرے پر اعتماد کرنا، اس کے بغیر معاشرت قائم ہی نہیں ہوسکتی

جھوٹ اعتماد باہمی کی بنیاد اکھاڑ دیتا ہے:

اور جھوٹ اس بنیاد کو اکھاڑنے والا ہے، جب لوگ عام جھوٹ بولنے لگیں تو سننے والے کے لئے یہ باور کرنا مشکل ہوجائے گا کہ یہ سچ بولتا ہے کہ جھوٹ؟

جھوٹ سب سے بڑی خیانت:

اعتماد کی بنیاد سچ پر ہے، اور بداعتمادی کی بنیاد جھوٹ پر، اسی بنا پر آنحضرت

صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

’’کَبُرَتْ خِیَانَةً اَنْ تُحَدِّثَ اَخَاکَ حَدِیْثًا هُوَ لَکَ بِهٖ مُصَدِّقٌ وَاَنْتَ بِهٖ کَاذِبٌ۔‘‘ (مشکوٰۃ ص:۴۱۳)

ترجمہ:......’’سب سے بڑی خیانت یہ ہے کہ تم اپنے بھائی سے بات کرو، وہ تمہیں سچا سمجھتا ہو اور تم جھوٹ بول رہے ہو۔‘‘

تو تم نے اس اعتماد کو جو ایک مسلمان کو دوسرے مسلمان پر کرنا چاہئے، اس میں خیانت کی ہے، اس لئے جھوٹ بولنا بری چیز ہے، آدمی کے منہ سے جھوٹی بات نہیں نکلنی چاہئے۔

جھوٹ کی نجاست وقباحت:

انسانی معاشرے کو بھی اس سے نفرت ہے، اور ملائکۃ اللہ کو بھی اس سے نفرت ہے۔ مشکوٰۃ شریف میں حدیث ہے کہ:

’’اِذَا کَذَبَ الْعَبْدُ تَبَاعَدَ عَنْهُ الْمَلَکُ مِیْلًا مِنْ نَتَنٍ مَّا جَاءَ بِهٖ۔‘‘ (مشکوٰۃ ص:۴۱۳)

ترجمہ:......’’جب بندہ جھوٹ بولتا ہے اور جھوٹی بات کہتا ہے تو اس کے منہ سے ایسی بدبو نکلتی ہے کہ فرشتہ ایک میل دور چلا جاتا ہے۔‘‘

ایک میل دور تک اس جھوٹ کی بدبو پھیل جاتی ہے جو بے ضرر نہ ہو، بلکہ ضرر پر مبنی ہو، یعنی کسی کے خلاف جھوٹی گواہی دینا وغیرہ، جھوٹی گواہی کا معاملہ تو بہت ہی سنگین ہے، اس کے بارہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ یہ شرک باللہ اور بت پرستی کے برابر ہے، اس لئے کہ اس نے جھوٹ کی نجاست کے ساتھ ساتھ

دوسرے مسلمان کی ایذا رسانی اس کا مال ہتھیانے اور جہنم کا ٹکڑا حاصل کرنے کو بھی شامل کرلیا، چنانچہ ایک حدیث شریف میں ہے:

”عَنْ اُمِّ سَلِمَۃَ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْھَا عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فِیْ رَجُلَیْنِ اِخْتَصَمَا اِلَیْہِ فِیْ مَوَارِیْثٍ لَّمْ تَکُنْ لَّھُمَا بَیِّنَۃٌ اِلَّا دَعْوَاھُمَا فَقَالَ مَنْ قَضَیْتُ لَہٗ بِشَیْءٍ مِّنْ حَقِّ اَخِیْہِ فَاِنَّمَا اَقْطَعُ لَہٗ قِطْعَۃً مِّنَ النَّارِ فَقَالَ الرَّجُلَانِ کُلُّ وَاحِدٍ مِّنْھُمَا یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ! حَقِّیْ ھٰذَا لِصَاحِبِیْ فَقَالَ لَا! وَلٰکِنْ اِذْھَبَا فَاقْتَسِمَا وَتَوَخَّیَا الْحَقَّ ثُمَّ اِسْتَھِمَا لِیَحْلُلْ کُلَّ وَاحِدٍ مِّنْکُمَا صَاحِبَہٗ۔“ (مشکوٰۃ ص:۳۲۷)

ترجمہ:......”دو آدمی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے، (ایک کندی تھا دوسرا حضرمی، حضرموت کا۔ ناقل) ایک نے دعویٰ کیا دوسرے پر کہ اس نے میری زمین غصب کر رکھی ہے، اور دوسرے کا کہنا یہ تھا کہ میرے باپ دادا کی زمین ہے، (باپ دادا کے وقت سے میرے ہاں چلی آرہی ہے۔ ناقل) گواہ ان میں سے کسی کے پاس بھی نہیں تھا، (اور قسم کھانے کے لئے دونوں تیار تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ ناقل) آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جس کے لئے میں فیصلہ کردوں اس کے بھائی کے حق سے، تو میں اسے دوزخ کا ٹکڑا کاٹ کر دے رہا ہوں۔ (جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بات ارشاد فرمائی۔ ناقل) تو دونوں صاحب مکر گئے ایک کہنے لگا کہ اس کی ہے، دوسرا کہنے لگا کہ اس کی ہے، (مدعی کہتا

ہے کہ مدعیٰ علیہ کی ہے، مدعیٰ علیہ کہتا ہے کہ مدعی کی ہے، اس پر۔ ناقل) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جب تم کسی نتیجہ پر متفق نہیں ہوتے ہو تو پھر ایسا کرو، اس زمین کو تقسیم کرلو، اور ایک دوسرے سے معافی مانگ لو، معاف کروالو، اگر کسی کا حق کسی کے ذمے ہے تو معاف کراؤ۔“

تو خیر میں عرض یہ کر رہا تھا کہ جھوٹی شہادت کے ذریعہ یا جھوٹ بول کر کسی مسلمان کا حق اڑالینا یہ جھوٹ بھی ہے اور اس کے ساتھ ساتھ اس مسلمان کی حق تلفی بھی ہے اور یہ گناہ بڑا سنگین ہے۔

بعض معاملات میں وحی نہ آنے کی حکمت:

حالانکہ وحیٔ الٰہی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی راہ نمائی کرسکتی تھی، لیکن وحی اگر ایسے معاملات میں راہ نمائی کرتی تو پھر سنت کیسے جاری ہوتی؟ اب ہر ایک آدمی کے پاس تو جبرائیل علیہ السلام یہ بتانے کے لئے نہیں آئیں گے کہ یہ حق پر ہے، اور یہ باطل پر ہے۔ اسی بنا پر صحیح بخاری میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا قول نقل کیا گیا ہے کہ:

”یَقُوْلُ ..... اِنَّ الْوَحیَ قَدِ انْقَطَعَ وَاِنَّمَا نَأْخُذُکُمُ الْاٰنَ بِمَا ظَھَرَ لَنَا مِنْ اَعْمَالِکُمْ فَمَنْ اَظْھَرَ لَنَا خَیْرًا اٰمِنَّاہُ وَقَرَّبْنَاہُ وَلَیْسَ اِلَیْنَا مِنْ سَرِیْرَتِہٖ شَیْءٌ اَللّٰہُ یُحَاسِبُہٗ فِیْ سَرِیْرَتِہٖ وَمَنْ اَظْھَرَ لَنَا سُوْءًا لَمْ نَأْمَنْہُ وَلَمْ نُصَدِّقْہُ وَاِنْ قَالَ اِنَّ سَرِیْرَتَہٗ حَسَنَۃٌ۔“ (بخاری ج:۱ ص:۳۶۰)

ترجمہ:......”وحی بند ہوچکی ہے، ہم تو لوگوں کو ظاہر پر پکڑیں گے، ہم تو لوگوں کے ساتھ معاملہ کریں گے ظاہر کے

مطابق، جس شخص کا ظاہر اچھا دیکھیں گے اس کو اچھا سمجھیں گے، اور جس شخص کا ظاہر غلط ہوگا ہم اس کو غلط سمجھیں گے، (باقی اللہ جانیں، ہمارے پاس وحی نہیں آتی اس لئے قاضی کو حکم ہے کہ وہ ظاہر پر فیصلہ کرے۔ ناقل)۔"

قاضی اپنی معلومات پر، یا شہادت پر فیصلہ کرے؟

اس مسئلہ میں گفتگو ہوئی ہے کہ اگر قاضی کے علم میں خود ذاتی طور پر کوئی اس کو معلومات ہوں، لیکن شہادتوں میں وہ بات سامنے نہ آئے، تو کیا قاضی، جج اپنے علم پر فیصلہ کرسکتا ہے؟ اس مسئلہ میں علماء نے گفتگو کی ہے، بعض نے کہا ہے کہ کرسکتا ہے، اس کو حقیقتِ حال کا علم ہو تو اس کے مطابق فیصلہ کرے، اور بعض علماء فرماتے ہیں کہ نہیں وہ اپنے علم پر عمل کرنے کا پابند نہیں، بلکہ جو کچھ شہادت میں آیا ہے، یا یوں کہو کہ جو کچھ مِسل اور فائل پر موجود ہے، اس کے مطابق فیصلہ کرنے کا پابند ہے، اس لئے کہ اگر وہ اپنے علم پر فیصلہ کرے گا تو لوگ اس پر تہمت لگائیں گے کہ اس نے غلط فیصلہ کیا ہے، جو چیز کہ شہادت میں آئی تھی اور جو چیز ریکارڈ پر موجود تھی، اس نے اس کے خلاف فیصلہ کیا، لوگ تہمت دھریں گے اور قاضی کو تہمت سے بھی بچنا چاہئے، یہ بات بھی معقول ہے۔

قضاء کا اصول:

تو میں عرض کر رہا ہوں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر تو وحی نازل ہوتی تھی، جبرائیل علیہ السلام آکر بتاسکتے تھے کہ یہ سچا ہے کہ جھوٹا ہے؟ مگر چونکہ اللہ تعالیٰ کو سنت جاری کروانی تھی، جب دونوں نے دعویٰ کیا اور دونوں کے پاس گواہی نہیں تھی، تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک قاعدہ بیان فرمایا ہے جو کہ قضاء کا نہایت اہم ترین اصول ہے، وہ یہ کہ گواہوں کے ذریعہ اپنے دعوے کو ثابت کرنا مدعی کے ذمہ ہے۔

مشکوٰۃ شریف میں حدیث ہے کہ:

”قَالَ لَوْ یُعْطَی النَّاسُ بِدَعْوَاهُمْ لَادَّعٰی نَاسٌ دِمَاءَ رِجَالٍ وَاَمْوَالِهِمْ وَلٰكِنَّ الْبَيِّنَةُ عَلَی الْمُدَّعِیْ وَالْيَمِيْنَ عَلٰی مَنْ اَنْكَرَ۔“ (مشکوٰۃ ص:۳۲۶)

ترجمہ:......”اگر لوگوں کو محض ان کے دعووں پر ان کے حق میں فیصلے کردیئے جائیں تو لوگ ایک دوسرے کے دماء (خون) اور مال پر دعویٰ کرنے لگ جائیں گے، لیکن گواہ یعنی ثبوت پیش کرنا مدعی کا کام ہے۔ اور قسم مدعا علیہ کے ذمہ ہے۔ (مدعی گواہ پیش کرے اور اگر مدعی کہے کہ میرے پاس کوئی ثبوت نہیں کہ یہ چیز میری ہے، تو پھر مدعا علیہ کے ذمہ حلف ہوتا ہے، یعنی مدعی اس سے حلف لے سکتا ہے کہ یہ چیز اس کی نہیں ہے، میری ہے وہ قسم کھا کر کہے۔ ناقل)۔“

حضرت علیؓ قاضی شریح کی عدالت میں:

قاضی شریح کا مشہور واقعہ ہے ناں! کہ ایک یہودی اور امیرالمؤمنین حضرت علی رضی اللہ عنہ کے درمیان ایک زرہ پر جھگڑا ہوگیا، قاضی شریح حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے سے قاضی اور جج چلے آرہے تھے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ تین خلفاءؓ کے زمانے میں وہ جج رہے، بڑے ذہین آدمی تھے، ان کے فیصلوں کے عجیب وغریب واقعات کتابوں میں نقل کئے گئے ہیں، قاضی صاحب نے نوٹس جاری کیا اور امیرالمؤمنین کو طلب کیا، امیرالمؤمنینؓ حاضرِ عدالت ہوئے تو قاضی صاحب نے ان کو جگہ دینا چاہی، امیرالمؤمنین فرماتے ہیں کہ غلط: عدالت کے کٹہرے میں امیرالمؤمنین اور یہودی برابر ہے، آپ کسی ایک

کے ساتھ ترجیحی سلوک نہیں کرسکتے، یہودی کے اوپر حضرت علیؓ کا دعویٰ ہے، قاضی صاحب نے کہا کہ آپ اس میں گواہ پیش کریں کہ یہ زرہ آپ کی ہے، انہوں نے کہا کہ حضرت امام حسنؓ سبط رسول صلی اللہ علیہ وسلم و ریحانۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم ایک تو میرے یہ گواہ ہیں اور ایک حضرتؓ کے خادم تھے قنبرؒ یہ گواہ ہیں۔ قاضی صاحب نے کہا کہ یہ گواہی تو قابل قبول نہیں ہے کیونکہ بیٹے کی شہادت باپ کے حق میں اور غلام کی شہادت آقا کے حق میں قابل قبول نہیں، کوئی اور گواہ لے کر آئیں۔ حضرت علیؓ نے کہا کہ اور تو میرے پاس کوئی گواہ نہیں، گویا امیر المؤمنینؓ اپنا دعویٰ ثابت کرنے میں ناکام رہے، اب یہودی سے حلف لیا جاسکتا تھا، لیکن یہودی کو حلف اٹھانے میں کیا عار تھی؟ جس طرح غلام احمد قادیانی نبوت کا جھوٹا دعویٰ کرسکتا ہے اور اس سے جتنے چاہو جھوٹ بلوالو، تو ایک یہودی قسم اٹھانے میں کیوں ہچکچائے گا، یہودی کو حلف دلایا گیا اس نے قسم کھائی، قاضی صاحب نے فیصلہ امیر المؤمنینؓ کے خلاف اور یہودی کے حق میں کردیا۔ جب فیصلہ ہوگیا تو یہودی کہنے لگا کہ زرہ امیر المؤمنینؓ کی ہے اور میرا دعویٰ جھوٹا ہے، میری قسم جھوٹی تھی، اور اس نے کلمہ پڑھا اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ اس عدل پر آسمان و زمین قائم ہیں کہ امیر المؤمنینؓ، قاضی کی عدالت میں بنفسِ نفیس آتے ہیں، اور عدالت میں ایک معمولی چیز زرہ پر بھی اپنی ملکیت ثابت نہیں کرسکتے، اور قاضی جو کرسی عدالت پر بیٹھا ہے، وہ امیر المؤمنینؓ کے خلاف ایک یہودی کے حق میں فیصلہ کردیتا ہے، یہ ہے وہ عدل و انصاف جس پر آسمان و زمین قائم ہیں، پھر جب اس یہودی نے مسلمان ہوکر وہ زرہ واپس دینا چاہی تو امیر المؤمنین نے اس کے لینے سے انکار کردیا۔

جھوٹ سے حاصل کردہ مال کا حکم:

پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

”اِنَّکُمْ لَتَخْتَصِمُوْنَ اِلَیَّ وَلَعَلَّ بَعْضَکُمْ اَنْ یَّکُوْنَ اَلْحَنَ بِحُجَّتِہٖ مِنْ بَعْضٍ فَاَقْضِیْ لَہٗ عَلٰی نَحْوِ مَا اَسْمَعُ مِنْہُ، فَمَنْ قُضِیَتْ لَہٗ بِشَیْءٍ مِنْ حَقِّ اَخِیْہِ فَلَا یَأْخُذَنَّہٗ فَاِنَّمَا اَقْطَعُ لَہٗ قِطْعَۃٌ مِّنَ النَّارِ۔“ (مشکوٰۃ ص:۳۲۷)

ترجمہ:……”تم لوگ میرے پاس اپنے مقدمے لاتے ہو اور بہت ممکن ہے کہ ایک آدمی دوسرے آدمی کی بہ نسبت زیادہ منہ زور ہو (اور وہ اپنی بات کھل کر بیان کرسکتا ہے، یا عدالت کو متأثر کرسکتا ہے، اور دوسرا بیچارہ نہیں کرسکتا باوجود حق پر ہونے کے وہ عدالت کو متأثر نہیں کرسکتا، ہوسکتا ہے کہ تم میں سے بعض زیادہ منہ زور ہوں دوسرے کی نسبت۔ ناقل) اور میں جیسی چیز میرے سامنے آئی اس کے مطابق فیصلہ کردوں، تمہیں یہ بات معلوم ہونی چاہئے کہ اگر میں تمہارے بیانات سے متأثر ہوکر ایک کا حق دوسرے کو دلا دیتا ہوں اور فیصلہ کردیتا ہوں تو میں ایک کا حق دوسرے کو نہیں دلا رہا ہوں، بلکہ اس کو جہنم کا ٹکڑا کاٹ کر دے رہا ہوں، (اب اس کا جی چاہے تو لے لے اور جی چاہے تو چھوڑ کر چلا جائے۔ ناقل)۔“

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فیصلہ کرکے دیتے ہیں کہ یہ زمین فلاں کی ہے، لیکن خود ہی ارشاد فرماتے ہیں کہ اگر یہ فیصلہ واقعہ کے خلاف ہوا، ہم نے اپنے اجتہاد سے فیصلہ کیا، لیکن واقعہ اس کے خلاف تھا تو اس کو یاد رکھنا چاہئے کہ میں اسے دوزخ کا ٹکڑا کاٹ کر دے رہا ہوں، اس کے نام دوزخ الاٹ کر رہا ہوں۔

بھائی! اور سب ٹھیک ہے، لیکن جھوٹ بول کر کسی مسلمان کا حق اڑالینا، حق مارلینا اس کا خمیازہ بڑا سخت ہے، اللہ تعالیٰ معاف فرمائے اور جیسے میں نے عرض کیا

کہ اس قسم کی مار ایسی پڑتی ہے کہ ساری عمر پچھتاتا ہے۔

بدترین سود:

دوسرا خطبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سود کے بارے میں دیا، سود کا تذکرہ فرمایا ہے، اور ارشاد فرمایا ہے کہ سود بڑی سخت چیز ہے، کتنی سخت ہے؟ اس کو صرف ایک مثال سے سمجھایا کہ سود کا ایک درہم، چھتیس زنا سے بدتر ہے، یعنی چھتیس مرتبہ زنا کرنے سے بدتر ہے، گویا چھتیس مرتبہ منہ کالا کرنے سے آدمی کا ایمان اتنا سیاہ نہیں ہوتا، جتنا سود کا ایک درہم کھانے سے ہوجاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ بچائے، جبکہ لوگوں کا حال یہ ہے کہ لوگ اس کو شیر مادر سمجھتے ہیں، یوں سمجھتے ہیں کہ اپنے پیسے کا منافع ہے۔ اور پھر ایک تیسری بات ارشاد فرمائی کہ سب سے بڑا سود کسی مسلمان کی عزت اور آبرو میں زبان کھولنا ہے، یعنی کسی مسلمان کی بے عزتی کرنا، ہتکِ عزت کرنا۔ ایک اور حدیث میں ہے کہ سود کے ستر درجے ہیں، چنانچہ مشکوٰۃ شریف میں ہے:

”اَلرِّبَا سَبْعُوْنَ جُزْأً اَیْسَرُھَا اَنْ یُّنْکِحَ الرَّجُلُ اُمَّہٗ۔“ (مشکوٰۃ ص:۲۴۶)

ترجمہ:......”سود کے ستر درجے ہیں، سب سے ادنیٰ درجے کا سود اتنا برا ہے گویا اپنی ماں کے ساتھ بدکاری کرنا، اور منہ کالا کرنا ہے۔“

اور سب سے بڑا سود ہے کسی مسلمان بھائی کی بے عزتی کرنا، چنانچہ فرمایا:
”اَ لْاِسْتِطَالَۃُ فِیْ عِرْضِ الْمُسْلِمِ۔“ یعنی کسی مسلمان کے خلاف زبان درازی کرنا۔

اللہ کے ہاں کسی مسلمان کی حرمت؟

یہاں سے یہ بات بھی معلوم ہوجائے گی کہ کسی مسلمان کی حرمت اللہ تعالیٰ کے نزدیک کتنی زیادہ ہے؟ ہمیں اور حرمتیں تو یاد ہیں، عہدہ کی حرمت، منصب کی

حرمت، قرابت داری کی حرمت، عزیز داری کی حرمت، لیکن ایمان کی حرمت ہمیں یاد نہیں، بہت کم لوگ ایسے ہوں گے جن کے دل میں کسی مسلمان کی حرمت اس کے ایمان کی وجہ سے ہو، الّا ما شآءاللہ! اور اللہ تعالیٰ کی نظر میں جتنی ایمان کی حرمت ہے، اتنی کسی چیز کی بھی نہیں، قرآن کریم میں ہے:

”....وَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُوْلِهٖ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ وَلٰكِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ۔“ (المنافقون:۸)

ترجمہ:......”اور اللہ کے لئے ہے عزت اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے اور اہل ایمان کے لئے لیکن منافق لوگ جانتے نہیں ہیں۔“

عزت صرف تین کے لئے ہے، اللہ کے لئے واقعی عزت ہے، تمام عزتوں کا مالک ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے عزت ہے، اس لئے کہ وہ اللہ کے رسول ہیں، بھلا ان سے زیادہ معزز کون ہوگا؟ اور اہل ایمان کے لئے، ان تین کے علاوہ کسی کے لئے عزت نہیں ہے۔ تو گویا اللہ تعالیٰ یہ ارشاد فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی نظر میں عزت صرف ایمان کی ہے، اور کسی چیز کی نہیں۔ اور ہمارے یہاں اس کے الٹ ہوگیا کہ ہمارے دل میں الّا ماشآءاللہ! بس ایمان کی عزت نہیں ہے، باقی ہر چیز کی عزت ہے۔

شرک سے بچو:

تیسرا خطبہ تھا ریاکاری کے بارے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دن خطبہ دیا، اس میں ارشاد فرمایا: لوگو! شرک سے بچو! اس لئے کہ وہ چیونٹی کی چال سے بھی زیادہ خفی ہے۔ ایک شخص نے عرض کیا کہ: یا رسول اللہ! جب چیونٹی کی چال سے خفی ہے تو اس سے بچیں کیسے؟ آپ نے ارشاد فرمایا کہ: یہ دعا کیا کرو کہ یا اللہ!

میں آپ کی پناہ چاہتا ہوں اس بات سے کہ جان بوجھ کر آپ کے ساتھ شریک کروں، اور آپ کی پناہ چاہتا ہوں، آپ سے معافی مانگتا ہوں اس چیز کے لئے کہ اس کو میں جانتا نہیں، یعنی اگر انجانے میں ہوجائے تو اس کی بخشش چاہتا ہوں۔

شرک کا مفہوم:

یہاں تین مسئلے ذکر کرنے کے قابل ہیں، ایک یہ کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرانا یہ سب گناہوں سے بڑا گناہ ہے، یہ تو سب مسلمانوں کو معلوم ہے، اب شریک ٹھہرانے کا کیا مطلب؟ اس کی زیادہ تفصیل نہیں کروں گا، مختصر یہ کہ اللہ تعالیٰ کی ذات میں یا صفات میں، صفاتِ خاصہ جو اللہ تعالیٰ کی خاص صفات ہیں، جو اللہ تعالیٰ کی ذاتِ عالی کے ساتھ مخصوص ہیں، ان میں کسی اور کو بھی شریک سمجھنا یہ شرک فی الذات کہلاتا ہے۔ یہ شرک تو کبھی کسی نے کیا نہیں، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کے برابر کسی کو کوئی نہیں سمجھتا، کبھی کسی بد سے بدتر قوم کا بھی یہ عقیدہ نہیں ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی ذاتِ عالی جیسا یکتا کوئی اور بھی ہے، اللہ تعالیٰ کے برابر کوئی اور بھی ہے، ایسا کبھی کسی نے کوئی لفظ نہیں سنا، شرک فی الذات کبھی کسی نے نہیں کیا۔

توحید فی الذات:

مشرکین نے کہا تھا کہ ہمارے سامنے اپنے رب کا وصف بیان کریں، اس پر سورۂ اخلاص نازل ہوئی، اخلاص کا معنی ردِ شرک کے ہیں، یہ سورۃ التوحید ہے، ''قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ'' کہہ دیجئے کہ وہ اللہ یکتا ہے۔ علماءٔ فرماتے ہیں کہ ایک ہوتا ہے واحد، بمعنیٰ ایک، اس کو عربی زبان میں کہتے ہیں واحد، اللہ تعالیٰ واحد بھی ہے، لیکن یہاں فرمایا: ''احد'' احد کے معنی ''یکتا'' کہ اس جیسا نہ کوئی ہے اور نہ ہوسکتا ہے، اپنی ذات میں، اپنے کمالات میں، اپنی صفات میں، اپنے افعال میں، وہ یکتا ہے، یہ تو توحید فی الذات ہوئی۔

توحید فی الصفات:

اور آگے توحید فی الصفات ہے، چنانچہ فرمایا: ''اَللّٰهُ الصَّمَدُ'' اللہ ہی بے نیاز ہے۔

سید عطاءُ اللہ شاہ بخاری قدس سرہٗ منبر پر تقریر میں بڑے مزے لے کر سنایا کرتے تھے کہ شاہ عبدالقادر محدث دہلوی قدس سرہٗ نے اللہ الصمد کا ترجمہ کیا کہ ''اللہ نرادھار'' ہے، یہ کوئی ہندی کا لفظ تھا، شاہ جیؒ فرماتے تھے کہ ایک دفعہ جیل میں ایک بہت بڑا فاضل ہندو ملا، جس کو جیل میں پڑے ہوئے سال ہوگیا، وہ مجھ سے قرآن کریم پڑھا کرتا تھا، شاہ جیؒ فرماتے ہیں کہ میں نے ایک دن پوچھا کہ نرادھار کیا ہوتا ہے؟ کہنے لگا کہ نرادھار اس کو کہتے ہیں کہ سارے اس کے محتاج ہوں وہ کسی کا محتاج نہ ہو، شاہ جیؒ فرماتے ہیں کہ میں یہ ترجمہ سن کر پھڑک گیا، واقعتاً صمد کے یہی معنی ہیں کہ بے نیاز ہے، اللہ بے نیاز ہے، ہمیں اعتراف ہے کہ ہماری زبان میں اس مفہوم کو ادا کرنے کے لئے کوئی مفرد لفظ نہیں ہے، بے نیاز ادھورا ترجمہ ہے، یعنی کسی کا محتاج نہیں، لیکن صمد کے یہ معنی نہیں کہ وہ کسی کا محتاج نہیں، بلکہ یہ معنی ہے کہ وہ کسی کا محتاج نہیں اور باقی سارے اس کے محتاج ہیں، یہ توحید فی الصفات اور توحید فی الافعال ہوئی کہ وہ اپنی صفات میں بھی یکتا ہے اور اپنے افعال میں بھی یکتا ہے۔ ''لَا رَادَّ لِمَا قَضَاهُ'' کوئی رد کرنے والا نہیں ہے اس کو جو وہ فیصلہ کردے، ''وَلَا مُعْطِيَ لِمَا مَنَعَهُ'' اس کو کوئی دینے والا نہیں جس کو وہ روک لے، ''وَلَا مَانِعَ لِمَا اَعْطَاهُ'' جو دینا چاہے اس کو کوئی روکنے والا نہیں۔

عقیدۂ ولدیت کا بطلان:

اور بہت سی قومیں عقیدہ ولدیت کی وجہ سے گمراہ ہوئیں، کسی نے کہا کہ فرشتے اللہ کی بیٹیاں ہیں، کسی نے کہا کہ حضرت عزیر علیہ السلام اللہ کا بیٹا ہے، کسی نے

کہا کہ حضرت مسیح علیہ السلام اللہ کا بیٹا ہے، اللہ نے فرمایا کہ وہ کسی سے نہیں پیدا ہوا، اور نہ اس کی اولاد ہے، کوئی اس کی اولاد نہیں، عقیدہ ولدیت خدائی کے منافی ہے، اگر خدا پیدا ہو وہ خدا نہ رہا، اور خدا کے جمتے تو خدا پھر بھی خدا نہ رہا۔

پادری سے دیہاتی کا مناظرہ:

حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی قدس سرہٗ فرماتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بیٹا ہونے پر عیسائیوں اور مسلمانوں کا مناظرہ ہو رہا تھا، ایک پرانا بوڑھا دیہاتی ہاتھ میں لاٹھی لئے ادھر آنکلا، جو مولوی صاحب مناظرہ کر رہے تھے، ان سے کہنے لگا مجھے پادری صاحب سے ایک بات پوچھ لینے دیں، مولوی صاحب نے کہا کہ ٹھیک ہے پوچھ لو، تو مناظر کی حیثیت سے وہ دیہاتی کھڑا ہوگیا جس بیچارے کو صحیح سے بولنا بھی نہیں آتا تھا، کہنے لگا: پادری صاحب! آپ کا دعویٰ کیا ہے؟ پادری کہنے لگا کہ یسوع مسیح اللہ کا بیٹا ہے۔ دیہاتی کہنے لگا کہ: ایک ہی بیٹا ہے کہ اور بھی بیٹے ہیں؟ پادری صاحب کہنے لگے کہ: اکلوتا بیٹا ہے! کہا کہ: تمہارے خدا سے تو میں اچھا رہا کہ میرے گیارہ بیٹے ہیں! بس اسی پر مناظرہ ختم ہوگیا۔

حضرت مولانا قاسم نانوتوی قدس سرہٗ ارشاد فرماتے ہیں کہ: دیہاتی نے دیہاتی زبان میں بات کہی، لیکن کہی بڑی عالمانہ، وہ یہ کہ اگر اولاد ہونا اللہ تعالیٰ کی صفت ہوتی تو اللہ تعالیٰ کی صفات غیر محدود ہیں، پھر بیٹے بھی غیر محدود ہوتے، اللہ کی صفات کی کوئی حد نہیں ہے، اگر اولاد ہونا بھی اللہ تعالیٰ کی صفت ہوتی کہ اس کے اولاد ہو تو پھر اکلوتا بیٹا کیوں ہوتا؟ ایک دیہاتی کے گیارہ ہیں، تو اللہ تعالیٰ کے لامحدود بیٹے ہونے چاہئے تھے، معلوم ہوا کہ بیٹا ہونا اللہ کی صفت نہیں، اللہ تعالیٰ مالک ہے اور اللہ کے سوا باقی ساری کائنات اس کی ملکیت ہے۔

اللہ تعالیٰ مالک اور مخلوق مملوک ہے:

اللہ تعالیٰ کے درمیان اور مخلوق کے درمیان: خالق اور مخلوق کا، مالک اور مملوک کا رشتہ ہے، اور قاعدہ یہ ہے کہ باپ، بیٹا ایک دوسرے کے مالک نہیں ہوسکتے، اگر کسی کا باپ غلام ہو اور بیٹا اس غلام باپ کو خرید لے تو خریدتے ہی باپ آزاد ہوجائے گا، اور اگر کسی کا بیٹا غلام ہو اور باپ اس کو خرید لے تو خریدتے ہی بیٹا آزاد، اگر کسی کی بیوی باندی تھی، اس نے اپنی بیوی کو خرید لیا، خریدتے ہی نکاح ختم، ولدیت اور زوجیت، یہ دونوں ملکیت اور مملوکیت کے خلاف ہیں، جمع نہیں ہوسکتے، جب تم کہو گے کہ خدا کا بیٹا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ خدا مالک نہیں ہے، یا وہ مملوک نہیں ہے، تو خدا خدا نہ رہا، اگر خدا مالک نہیں ہے تو وہ خدا نہ رہا، تو چونکہ بہت ساری قومیں اس عقیدہ ولدیت کی وجہ سے گمراہ ہوئیں اور شرک میں مبتلا ہوئیں، اس لئے فرمایا: ”لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُوْلَدْ“ اس نے نہ کوئی بچہ جنا، اور نہ اس کے کوئی بچہ پیدا ہوا، اور نہ وہ خود کسی کے ہاں پیدا ہوا، وہ خدا ہے یعنی اس کا وجود خانہ زاد نہیں ہے۔

”وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ“ اور نہیں ہے اس کے جوڑ کا کوئی۔ جتنے بڑے سے بڑے عظیم انسان ہیں یا بڑی سے بڑی عظیم مخلوق ہے، ان کی بڑائی اپنی جگہ، لیکن نسبت خدا کے ساتھ کرو گے تو اس کا کوئی مقابلہ نہیں، خدا کے مقابلے کا کوئی نہیں، اس کے جوڑ کا کوئی نہیں، اور اس میں اس طرف بھی اشارہ فرمادیا ہے کہ بیٹا ہوتا ہے تو رشتے ہوتے ہیں، اور رشتہ جوڑ میں کیا جاتا ہے، کبھی انسانوں کا اور بندروں کا یہاں رشتہ کرتے ہوئے دیکھا؟ کبھی حیوانوں میں رشتہ کرتے ہوئے کسی انسان کو دیکھا؟ انسانوں کا اور حیوانوں کا کیا جوڑ؟ انسان کا جوڑ انسان ہوسکتا ہے، اور پھر اس میں بھی تم لوگ اونچ نیچ کیا کرتے ہو کہ فلاں برادری ہمارا جوڑ ہے، فلاں برادری ہمارا جوڑ نہیں ہے، تو کیا غضب ہے کہ خدا کے لئے رشتہ تجویز کرتے ہو مخلوق کا، حالانکہ وہ ان

سب کا خالق و مالک ہے، "لَمْ يَكُنْ لَّهُ كُفُوًا اَحَدٌ" اس کا کوئی جوڑ نہیں۔ یہ تو بھائی! شرک ہے، یعنی خدا کی ذات میں، خدا کی صفات میں، خدا کے افعال میں کسی کو شریک بنالینا اور یہ عقیدہ ولدیت بھی شرک ہے کہ نعوذ باللہ حضرت مسیح علیہ السلام خدا کے بیٹے ہیں۔ خدا کے ہاں بیٹا کیسے ہوسکتا ہے؟ خدا کے ہاں تو بیوی بھی نہیں ہے، نعوذ باللہ! اگر عیسیٰ علیہ السلام کو خدا کا بیٹا کہو گے تو حضرت مریم کو خدا کی بیوی کہنا پڑے گا، لاحول ولاقوۃ الا باللہ!

ریا کاری شرکِ خفی:

اور ایک ہے پوشیدہ شرک۔ وہ ہے ریا کاری، کل شام کو اسی کا بیان تھا۔

ریا کاری کے بھی بڑے درجات ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ ریا کاری شرک ہے، کیونکہ چیونٹی کی چال سے بھی زیادہ خفیف ہوتی ہے، اس لئے اس کا سمجھنا ہر ایک آدمی کا کام نہیں، بہرحال بچنے کا اہتمام لازم ہے۔

جو اللہ اور اس کے رسول کا عقیدہ میرا بھی وہی:

اور تیسرا مسئلہ یہ کہ جن گناہوں کا علم ہے، ان سے اللہ کی پناہ مانگو اور جو بے پتے، بغیر علم کے انجانے میں ہوجائیں، ان کے لئے اللہ تعالیٰ سے استغفار کرتے رہو۔

شرح فقہ اکبر میں حضرت امام ابوحنیفہؒ ایک جگہ لکھتے ہیں کہ:

"وَاِذَا اَشْكَلَ اى التبس عَلَى الْاِنْسَانِ اى من اهل الايمان شَىْءٌ مِنْ دَقَائِقِ عِلْمِ التَّوْحِيْدِ اى وَلَمْ يتحقق عنده حقائق مقام التفريد ومرام التمجيد فَيَنْبَغِىْ لَهٗ اى يحب عليه اَنْ يَّعْتَقِدَ فِى الْحَالِ مَا هُوَ الصَّوَابُ عِنْدَ اللّٰهِ تَعَالٰى اى بطريق الاجمال......" (شرح فقہ اکبر ص: ۱۳۴)

ترجمہ:......''توحید کے مسائل میں اگر کسی اہل ایمان کو واضح طور پر کوئی بات معلوم نہ ہوسکے (کہ مجھے کیا موقف اختیار کرنا چاہئے، تو پھر یوں کہہ دیا کرے) کہ جو عقیدہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک درست ہے میں اسی کا قائل ہوں، بس سیدھی بات ہے۔''

مطلب یہ کہ جو عقیدہ اللہ تعالیٰ نے نازل فرمایا اور جو اللہ تعالیٰ کا پسندیدہ عقیدہ ہے اور جو عقیدہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ہے، جو عقیدہ صحابہ کرام کا تھا، اولیائ اللہ کا تھا، میں اسی عقیدے کا قائل ہوں، باقی تمام عقائد سے بیزاری کا اعلان کرتا ہوں، اسی طرح گناہوں کے بارے میں یوں کہے کہ جو گناہ مجھے معلوم ہیں، یا اللہ! میں تیری پناہ چاہتا ہوں کہ میں ان میں مبتلا ہوں اور خدانخواستہ لاعلمی کی وجہ سے بے پتے کے مبتلا ہوجاؤں تو میں اس کے لئے استغفار کرتا ہوں۔

وآخر دعوانا ان الحمد للّٰہ رب العالمین

مسلمان کی
عزت وحرمت

مسلمانوں کی تائید اللہ تعالیٰ نے اخلاص اور توحید کے ساتھ فرمائی۔اخلاص کے معنی ہیں ہر کام اللہ کی رضا کے لئے کرنا، جس کو ہم ''خلوصِ نیت'' کہتے ہیں، ہماری زبان میں محض رضائے الٰہی کے لئے کسی کام کو کرنا یہ اخلاص کہلاتا ہے اور اسی سے عمل میں جان آتی ہے۔اعمال تمام کے تمام بے روح اور دھڑ ہیں، جب تک کہ ان میں اخلاص کی روح نہ ہو، اور آپ جانتے ہیں کہ بغیر روح کے جسم اور دھڑ کوئی قیمت نہیں رکھتا، بلکہ دفن کردیئے جانے کے لائق ہوتا ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم
الحمدللہ وسلام علی عبادہ الذین اصطفی!

”.....وَشَدَّ بِالْاِخْلَاصِ وَالتَّوْحِيدِ المسلمين، وَالْمُسْلِمُ مَنْ سَلِمَ النَّاسُ مِنْ لِّسَانِهٖ وَيَدِهٖ اِلَّا بِالْحَقِّ، لَا يَحِلُّ اَذَى الْمُسْلِمِ اِلَّا بِمَا يَجِبُ، بَادِرُوْا اَمْرَ الْعَامَّةِ وَخَاصَّةِ اَحَدِكُمُ الْمَوْتَ، فَاِنَّ النَّاسَ اَمَامَكُمْ، وَاِنَّ مَا مِنْ خَلْفِكُمُ السَّاعَةُ تَحْدُوْكُمْ تُخَفِّفُوْا تَلْحَقُوْا فَاِنَّمَا يَنْتَظِرُ النَّاسُ اُخْرَاهُمْ، اِتَّقُوا اللّٰهَ عِبَادَهٗ فِیْ عِبَادِهٖ وَبِلَادِهٖ وَاِنَّكُمْ مَسْئُوْلُوْنَ حَتّٰى عَنِ الْبِقَاعِ وَالْبَهَائِمِ اَطِيْعُوا اللّٰهَ عَزَّ وَجَلَّ وَلَا تَعْصُوْهُ وَاِذَا رَأَيْتُمُ الْخَيْرَ فَخُذُوْا بِهٖ، وَاِذَا رَأَيْتُمُ الشَّرَّ فَدَعُوْهُ، وَاذْكُرُوْا اِذْ اَنْتُمْ قَلِيْلٌ مُّسْتَضْعَفُوْنَ فِی الْاَرْضِ۔“

(حیاۃ الصحابہ ج:۳ ص:۴۶۴)

ترجمہ:......”اور (اللہ تعالیٰ نے) مسلمانوں کی مدد فرمائی ہے، اخلاص اور توحید کے ساتھ، مسلمان وہ ہے کہ مسلمان اس کی زبان اور اس کے ہاتھوں سے محفوظ رہیں مگر حق کے

ساتھ، کسی مسلمان کو ایذا دینا جائز نہیں، مگر اسی چیز کے ساتھ جو کہ واجب ہے، تمام کاموں سے اور خاص طور پر اپنے خصوصی کاموں سے پہلے موت کی فکر کرو، اس لئے کہ لوگ تم سے پہلے جا چکے ہیں اور جو تم سے پیچھے ہیں اس وقت وہ تمہارے پیچھے پیچھے آئیں گے، اپنا بوجھ ہلکا رکھو تاکہ تم پہلوں سے جا ملو، اس لئے کہ لوگ اپنے آخری انجام کا انتظار کیا کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ سے ڈرو اس کے بندوں کے معاملے میں اور اس کے شہروں کے معاملہ میں، کیونکہ تم سے سوال کیا جائے گا زمین کے ٹکڑوں اور بہائم کے بارے میں بھی، اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرو، اس کی نافرمانی نہ کرو، خیر کو دیکھو تو اس کو پکڑ لو، شر کو دیکھو تو اس کو چھوڑ دو، اور یاد رکھو کہ تم اس وقت کو جبکہ تم کمزور تھے اور تعداد میں کم تھے۔"

اخلاص کے معنی:

مسلمانوں کی تائید اللہ تعالیٰ نے اخلاص اور توحید کے ساتھ فرمائی۔

اخلاص کے معنی ہیں ہر کام اللہ کی رضا کے لئے کرنا، جس کو ہم "خلوصِ نیت" کہتے ہیں، ہماری زبان میں محض رضائے الٰہی کے لئے کسی کام کو کرنا یہ اخلاص کہلاتا ہے اور اسی سے عمل میں جان آتی ہے۔

اعمال تمام کے تمام بے روح اور دھڑ ہیں، جب تک کہ ان میں اخلاص کی روح نہ ہو، اور آپ جانتے ہیں کہ بغیر روح کے جسم اور دھڑ کوئی قیمت نہیں رکھتا، بلکہ دفن کردیئے جانے کے لائق ہوتا ہے۔

توحید کا معنی:

دوسرے توحید، توحید کے معنی اللہ کو ایک ماننا اور مسلمانوں کے ساتھ کلمہ میں متحد ہونا، ان کے درمیان میں تفرق اور اختلاف نہ ہونا۔

کامل مسلمان کی تعریف:

اس کے بعد فرمایا کہ: ''مسلمان وہ ہے کہ اس کی زبان اور اس کے ہاتھ سے مسلمان محفوظ رہیں۔'' تمہارے ہاتھ سے اور تمہاری زبان سے کسی مسلمان کو ایذا نہ پہنچے۔

علمائ فرماتے ہیں کہ مقصود اس سے یہ ہے کہ تمہارے وجود سے کسی کو نقصان نہ پہنچے، تمہارا وجود لوگوں کے لئے سراپا امن اور سلامتی کا وجود ہو اور تمہاری ذات سے کسی کو خطرہ محسوس نہ ہو، نہ تمہاری زبان سے، نہ تمہارے ہاتھ سے، نہ تمہارے کسی اور عضو سے۔

زبان اور ہاتھ سے تکلیف نہ پہنچنے کا مطلب؟

زبان اور ہاتھ دو چیزوں کو اس لئے ذکر فرمایا ہے کہ زیادہ تر ایذا رسانی، کسی کو تکلیف پہنچانا انہی دو اعضا سے ہوتا ہے، زبان کے ساتھ یا ہاتھ کے ساتھ اور اسی بنا پر یہ فرمایا گیا ہے کہ جس شخص کے یہ دو عضو مسلمانوں کو تکلیف اور نقصان نہ پہنچانے کے پابند ہوں، اس کا پورا وجود سلامتی بن جائے گا، بطورِ خاص زبان اس لئے کہ ان سے ایذا زیادہ پہنچتی ہے۔

زبان کی ایذا کا دائرہ:

امام غزالی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ایک تو زبان کا زخم تلوار کے زخم سے زیادہ گہرا ہوتا ہے، چنانچہ عربی کا مشہور شعر ہے:

جَرَاحَةُ السِّنَانِ لَهَا الْتِیَامُ
وَلَا یَلْتَامُ مَا جَرَحَ اللِّسَانُ

ترجمہ:......''نیزوں کے زخم بھر جاتے ہیں، لیکن زبان کا زخم، زبان کا گھاؤ نہیں بھرتا۔''

دوسرے یہ کہ ہاتھ کے چلانے کے لئے تو قوت درکار ہوتی ہے، کمزور آدمی کا ہاتھ نہیں چلتا، طاقتور کے سامنے طاقتور کا ہاتھ چلتا ہے، لیکن زبان تو کمزور کی بھی چلتی ہے۔

تیسری بات یہ کہ آپ کا ہاتھ صرف اس شخص پر چل سکتا ہے جو آپ کے ہاتھ کی زد میں ہو، سامنے ہو، ہماری زبان میں کہا کرتے ہیں ''دسترس'' یہ چیز اس شخص کی دسترس میں ہے، ''دسترس'' کے معنی ہوتے ہیں ہاتھ کی پہنچ یعنی اس کا ہاتھ وہاں تک پہنچ سکتا ہے، یہ چیز میری دسترس سے باہر ہے یعنی میرے ہاتھ کی پہنچ وہاں تک نہیں جاتی، تو ہاتھ تو اسی پر چلے گا جو تمہاری دسترس میں ہو کہ وہاں تک تمہارا ہاتھ پہنچ سکے، لیکن زبان کے لئے آدمی کا سامنے ہونا شرط نہیں ہے، بلکہ جو لوگ فوت ہو چکے ہیں زبان ان کے خلاف بھی چلا سکتے ہیں، جو لوگ غائب ہیں، موجود نہیں ہیں، تمہارے سامنے نہیں ہیں زبان ان پر بھی چلا سکتے ہو اور پھر یہ بھی کہ ہاتھ ایک پر چلے گا دو پر چلے گا، ایک وقت میں کتنے آدمیوں پر ہاتھ چلالو گے، کلاشنکوف ہاتھ میں ہو تو کئی آدمیوں کو نشانہ بنالو گے، لیکن غیر محدود انسانوں کو تم اس کا نشانہ نہیں بنا سکتے، جبکہ زبان جماعتوں کی جماعتوں اور لاتعداد انسانوں کو اپنی زد میں لے سکتی ہے اور ان کو زخمی کر سکتی ہے، اس لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے زبان کو پہلے ذکر فرمایا:

''اَلْمُسْلِمُ مَنْ سَلِمَ الْمُسْلِمُوْنَ مِنْ لِّسَانِهٖ وَیَدِهٖ۔'' (مشکوٰۃ ص:۱۲)

ترجمہ:...... ’’مسلمان وہ ہے کہ مسلمان اس کی زبان سے اور اس کے ہاتھوں سے محفوظ رہیں۔‘‘

شر و فساد مسلمان کی شان نہیں:

’’مسلمان وہ ہے‘‘ کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ جس کی زبان سے یا جس کے ہاتھ سے مسلمان محفوظ نہیں وہ مسلمان نہیں ہے؟ جی ہاں! وہ مسلمان نہیں ہے، یا کم سے کم کامل مسلمان نہیں ہے، مسلمان کو جیسا ہونا چاہئے تھا ویسے نہیں ہے، اگرچہ ہم ان کے خلاف کفر کا فتویٰ نہیں دیں گے، لیکن ان کو کامل مسلمان بھی نہیں کہیں گے، اس لئے ’’المسلم‘‘ جس کو ہم مسلمان کہتے ہیں وہ لیا گیا ’’اسلام‘‘ سے اور ’’اسلام‘‘ کا لفظ ہے ’’سلامتی‘‘ سے، اسلام تو سلامتی کا مذہب ہے، سلامتی والا دین ہے کہ اس کے ذریعہ سے سلامتی کی خوشبو پھیلے اور سلامتی کا پیغام عام ہو، مسلمان وہ ہے جو سلامتی کا علمبردار ہو، شر و فساد مسلمان کی شان نہیں ہے۔

کامل مسلمان کسی کافر کو بھی ایذا نہیں دے گا:

پھر یہ جو فرمایا ہے کہ مسلمان وہ ہے کہ دوسرے مسلمان اس کی زبان اور ہاتھ سے محفوظ رہیں، اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ دوسرے ایذا میں مبتلا ہوں، مسلمان تو اس کی ایذا سے محفوظ رہیں، لیکن غیر مسلم اس کے ظلم وستم کا نشانہ ہوں، یہ مطلب نہیں، اس لئے کہ بتانا یہ ہے کہ اگر اس کے اندر صحیح اسلام موجود ہوتا تو سب سے پہلے مسلمان اس کی ایذا سے محفوظ ہوتے اور جب مسلمان محفوظ ہوتے تو پھر دوسروں کو بھی ایذا نہ پہنچاتا، پہلے اسلام کی مشق مسلمانوں پر ہوگی، اس کے بعد پھر دوسروں پر بھی ہوگی اور جس شخص کی زبان سے یا ہاتھ سے مسلمان بھی محفوظ نہ ہوں، اس کے بارے میں کیا توقع رکھی جاسکتی ہے کہ اللہ کی باقی مخلوق اس کے ہاتھ سے محفوظ رہے گی، یہ ترغیب دینا مقصود ہے۔

ہمارا دین ظلم وایذا رسانی کا مخالف ہے:

اور یہ بات خوب یاد رکھنی چاہیئے کہ ظلم کرنا کسی پر بھی جائز نہیں ہے، خواہ مسلمان ہو یا غیرمسلم، ہمارا دین ظلم وستم اور ایذا رسانی کا مخالف ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشادگرامی ہے:

''اِنَّ اللّٰہَ کَتَبَ الْاِحْسَانَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ، فَاِذَا قَتَلْتُمْ فَاَحْسِنُوا الْقِتْلَ، وَاِذَا ذَبَحْتُمْ فَاَحْسِنُوا الذِّبْحَ۔''

(صحیح مسلم ج:۲ ص:۱۵۲)

ترجمہ:......''اللہ تعالیٰ نے احسان کرنا ہر چیز پر واجب فرمادیا ہے، اگر تمہیں کسی کو قتل کرنا ہو (جیسے قصاص میں مجرم کو قتل کیا جاتا ہے یا کافر کو جہاد میں قتل کیا جاتا ہے تو فرمایا) کہ اس میں بھی حسن سلوک کا معاملہ کرو (قتل میں بھی اس کی رعایت رکھو کہ بری طرح قتل نہ کرو، بلکہ اچھی طرح قتل کرو، اچھے انداز سے قتل کرو، برے انداز سے نہیں، جوڑ بند کاٹ کاٹ کر کسی کو قتل کرنا یہ ایذا رسانی ہے) اور جب کسی جانور کو ذبح کرو تو اس کو بھی اچھے طریقہ سے ذبح کرو کہ اس کو کم سے کم ایذا پہنچے، اس لئے فرمایا کہ چھری کو تیز کرلو (کند چھری سے ذبح نہ کرو، کیونکہ جانور کی رگیں نہیں کٹیں گی اور وہ بلاوجہ تڑپے گا)۔''

قتل حق کی صورتیں:

بہرکیف! اسلام سلامتی کا مذہب ہے اور مسلمان وہ ہے کہ مسلمان اس کے ہاتھ سے اور اس کی زبان سے محفوظ رہیں، ''اِلَّا بِحَقٍّ'' ہاں! مگرحق کے ساتھ، کسی مسلمان کو قتل کرنا پڑے تو الگ بات ہے، اس کی تشریح امیرالمؤمنین حضرت عثمان رضی

اللہ عنہ نے فرمائی تھی، اور یہ حدیث متعدد صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین سے مروی ہے، میں نے اپنے رسالہ ”الشھاب المبین لرجم الشیاطین“ میں ان تمام احادیث کو جمع کردیا ہے کہ کسی مسلمان کا خون حلال نہیں ”اِلَّا بِاِحْدَی ثَلَاثٍ“ مگر تین میں سے ایک بات کے ساتھ، مسلمان میں مسلمان ہونے کے بعد تین چیزوں میں سے ایک پائی جائے تو اس کا خون حلال ہوجاتا ہے، اور وہ کیا ہے؟

۱:......حد رجم:

ان میں سے ایک ہے: ”زِنًا بَعْدَ الْاِحْصَانِ“ کوئی شخص شادی شدہ ہونے کے باوجود بدکاری کرتا ہے، زنا کرتا ہے اور اس پر صحیح شہادت یا اقرار کے ذریعہ سے جرم ثابت ہوجاتا ہے تو اس کا حکم ہے ”رجم“ کہ اس کو سنگسار کیا جائے، یہ شریعت کا حکم ہے، اس زمانے میں بہت سے لوگ اس پر بھی اظہارِ خیال کرتے ہیں، حالانکہ یہ رجم کا حکم پہلی کتابوں میں بھی ہے، حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شریعت میں موجود ہے، توریت میں آج بھی موجود ہے، یہ جو بائبل لئے پھرتے ہیں، اس میں موجود ہے، ہماری شریعت میں بھی حکم ہے، خیر اس مسئلے پر مجھے گفتگو نہیں کرنی، اس کا حکم یہ ہے کہ اس کو پتھر مار مار کر سنگسار کردیا جائے۔

یہاں اتنی بات یاد رکھنی چاہئے کہ یہ ایسا گھناؤنا اور ایسا گندہ متعفن جرم ہے کہ شریعت نے اس کے ثبوت کے لئے چار گواہوں کی شرط رکھی ہے، کسی جرم کے ثبوت کے لئے دو گواہوں سے زیادہ کی ضرورت نہیں، دو گواہ کافی ہیں، عادل، ثقہ، قابل اعتماد، لائق اعتماد دو آدمی گواہی دے دیں کہ فلاں نے فلاں کو ہمارے سامنے قتل کیا ہے اور ان کی شہادت واقعتاً قابل اعتماد ہو اور ان پر جرح نہ کی جاسکے، ان کی دیانت وامانت پر جرح نہ کی جاسکے تو جرم ثابت ہوجائے گا، اور اس شخص کو قصاصاً قتل کردیا جائے گا، اگر مقتول کے وارث اس کو معاف نہ کریں، میں ابھی اس مسئلے کو بیان

کرتا ہوں، چوری میں ہاتھ کاٹ دیا جاتا ہے، اس کے لئے بھی دو شہادتیں کافی ہیں، شراب میں اسّی کوڑے لگائے جاتے ہیں، شراب نوشی کے جرم پر اس کے لئے بھی دو شہادتیں کافی ہیں، کسی پر ناحق بدکاری کی تہمت لگائے تو اس کی سزا قرآن کریم میں اسّی کوڑے ذکر کی گئی ہے: ’’فَاجْلِدُوْهُمْ ثَمَانِيْنَ جَلْدَةً۔‘‘ (نور:۴) تمام جرائم میں زنا ایک ایسا جرم ہے جس کے لئے چار گواہوں کی شرط ہے اور گواہ بھی سنی سنائی بات نہ کریں، ورنہ ان کی پٹائی ہوجائے گی، اسّی کوڑے لگیں گے، بلکہ اپنی عینی شہادت پیش کریں کہ ہم نے ان دونوں کو بدکاری کرتے دیکھا ہے، اپنی آنکھوں سے دیکھیں، آنکھوں دیکھی شہادت پیش کریں، اتنا سنگین جرم کہ اللہ تعالیٰ نے اس کے لئے چار گواہوں کی شرط رکھی ہے، اور پھر اتنا سخت جرم کہ اگر مرد اور عورت دونوں شادی شدہ ہوں تو دونوں کو سنگسار کیا جائے، اگر ان میں سے ایک شادی شدہ ہے اور ایک کنوارہ ہو تو جو شادی شدہ تھا اس کو سنگسار کیا جائے اور جو غیر محصن ہے، شادی شدہ نہیں ہے، اس کو سو کوڑے لگائے جائیں۔

۲:......حد ارتداد:

دوسرا جرم ہے: ’’وَكُفْرٌ بَعْدَ اِسْلَامٍ۔‘‘ اسلام لانے کے بعد کوئی شخص مرتد ہوجائے، کافر ہوجائے تو وہ واجب القتل ہے، البتہ اتنی رعایت اس کے ساتھ کی جائے گی کہ اس کو اسلام کی تلقین کی جائے گی۔

حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ ایک علاقے کے گورنر تھے، وہاں سے ایک صاحب تشریف لائے، امیرالمؤمنین حضرت عمر رضی اللہ عنہ وہاں کے حالات پوچھنے لگے کہ کیا حال ہے لوگوں کا؟ خوش ہیں؟ لوگوں کو کوئی شکایت تو نہیں ہے؟ انہوں نے حالات بیان کئے، پھر فرمایا کہ کوئی عجیب وغریب واقعہ وہاں پیش آیا ہو؟ کہنے لگے: امیرالمؤمنین! ایک واقعہ عجیب وغریب پیش آیا ہے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ

نے فرمایا: وہ کیا ہے؟ اس آدمی نے کہا کہ ایک آدمی مسلمان ہوگیا تھا، بعد میں اپنے کفر کی طرف لوٹ گیا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ سنجیدہ ہوکر بیٹھ گئے اور فرمایا کہ: پھر تم نے کیا کیا؟ کہا کہ: اس کو قتل کردیا، اور یہی سزا ہے شریعت میں۔

صحیح بخاری میں ہے کہ حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے ملنے کے لئے گئے، یہ دونوں یمن کے ایک ایک علاقے کے گورنر تھے اور حاکم تھے، یہ سواری پر سوار تھے، دیکھا کہ ایک آدمی کے دونوں ہاتھ گردن پر بندھے ہوئے ہیں، پوچھا کہ اس کو کیوں کھڑا کر رکھا ہے؟ حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ جو ان کے میزبان تھے، جن سے ملنے کے لئے یہ آئے تھے، کہا کہ: آپ تشریف رکھئے، آپ کو بتاتے ہیں، فرمایا کہ: تشریف نہیں رکھتا، سواری سے بھی نہیں اتروں گا، پہلے بتاؤ کیا معاملہ ہے؟ کیا بات ہے؟ کہنے لگے: یہ خبیث یہودی تھا، مسلمان ہوگیا، پھر یہودی بن گیا۔ حضرت معاذؓ فرمانے لگے: "..... قَالَ لَا اَجْلِسُ حَتّٰی یُقْتَلَ ....." (بخاری ج:۲ ص:۱۰۲۳) "سواری سے نہیں اتروں گا جب تک کہ اس کو قتل نہیں کردیا جاتا" اس کی سزا یہ تھوڑی ہے کہ دھوپ میں کھڑا کرو، چنانچہ اس کو قتل کیا گیا تو یہ سواری سے اترے۔

یہ بھی بخاری شریف میں ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے زمانے میں کچھ زنادقہ تھے، یہ عبداللہ بن سبا اور اس کے ساتھی تھے، حضرت امیرالمؤمنین کو اس کی شکایت کی گئی کہ یہ لوگ الٹی باتیں کرتے ہیں، نعوذ باللہ! ثم نعوذ باللہ! کہتے تھے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ مظہر خدا ہیں، حضرت امیرالمؤمنین نے ان کو بلوایا اور پوچھا: تم ایسی باتیں کرتے ہو؟ انہوں نے اقرار کیا، فرمایا: ایک گڑھا کھودو، ایندھن جلاؤ اور اس میں ان کو جھونک دو، چنانچہ جلادیا گیا۔ حدیث کے الفاظ یہ ہے کہ:

"قَالَ اُتِیَ عَلِیٌّ بِزَنَادِقَةٍ فَاَحْرَقَھُمْ، فَبَلَغَ ذَالِکَ
اِبْنَ عَبَّاسٍ فَقَالَ: لَوْ کُنْتُ اَنَا لَمْ اُحَرِّقْھُمْ، لِنَھْیِ رَسُوْلِ

اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ: لَا تُعَذِّبُوْا بِعَذَابِ اللّٰہِ، وَلَقَتَلْتُھُمْ لِقَوْلِ رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ: مَنْ بَدَّلَ دِیْنَہٗ فَاقْتُلُوْہُ۔“ (صحیح بخاری ج:۲ ص:۱۰۲۳)

ترجمہ:......”حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پاس ان زندیقوں کو لایا گیا، آپ نے ان کو جلانے کا حکم دیا، یہ بات جب حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کو پہنچی تو فرمانے لگے: اگر میں ہوتا تو جلاتا نہیں، میں ان کو قتل کرتا، کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: جو اپنا دین تبدیل کردے اس کو قتل کردو۔“

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بڑا عالم کون تھا؟ وہ اپنے زمانے میں سب سے بڑے عالم تھے، یہ بات ان کو پہنچی کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ یوں کہتے ہیں، فرمایا: ”ویہ ابن عباس!“ افسوس ہے ابن عباس پر! وہ مجھے پہلے بتاتے، مطلب یہ کہ حضرت نے ان کو قتل کرنے کی شکل یہ تجویز کی اور یہ سمجھا کہ ان کا جرم عام مرتد سے زیادہ سنگین ہے، اس لئے ان کو جلانا چاہیئے۔ غرضیکہ کوئی مسلمان نعوذ باللہ! العیاذ باللہ! اسلام کو چھوڑ دے، مرتد ہوجائے، تو اس کی سزا قتل ہے۔

۳:......حد قصاص:

تیسری چیز جو قرآن کریم میں ذکر کی گئی ہے وہ ہے: ”النفس بالنفس“ یعنی خون کا بدلہ خون، جیسا کہ ارشاد الٰہی ہے:

”یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کُتِبَ عَلَیْکُمُ الْقِصَاصُ فِی الْقَتْلٰی ......“ (البقرہ:۱۷۸)

ترجمہ:......”اے ایمان والو! تم پر فرض کردیا گیا ہے بدلہ مقتولوں کے بارے میں۔“

جان کے بدلے میں جان، لیکن ساتھ ہی اللہ تعالیٰ نے عجیب حکیمانہ بات فرمائی ہے: ”فَمَنۡ عُفِیَ لَہٗ مِنۡ اَخِیۡہِ۔“ اگر اس کو معافی مل گئی، اس کے بھائی کی جانب سے، یعنی ایک قاتل ہے اپنے بھائی کا، کسی مسلمان کا، لیکن اولیاءِ مقتول راضی ہوگئے کہ ہم اس سے خون کا بدلہ خون (قصاص) نہیں لیتے، اس پر راضی ہوگئے تو خون بہا ادا کرنا چاہیۓ: ”فَاتِّبَاعٌۢ بِالۡمَعۡرُوۡفِ وَاَدَآءٌ اِلَیۡہِ بِاِحۡسَانٍ۔“ تو اس صورت میں چاہیۓ کہ وہ لوگ تو اس معاوضے کے وصول کرنے میں ذرا احسان سے کام لیں، معروف طریقے سے وصول کریں اور یہ حسن طریق سے ادا کرے، قاتل عمد یعنی جان بوجھ کر کسی کو قتل کرنا اس کی سزا قصاص ہے کہ قاتل کو اس مقتول کے بدلے میں قتل کیا جائے، لیکن اگر اولیاءِ مقتول میں سے کوئی ایک بھی قصاص معاف کردے تو اس صورت میں خون بہا ادا کرنا پڑے گا، یعنی خون کی قیمت۔ جانتے ہو خون کی قیمت کتنا ہے؟ سو اونٹ ہیں، ایک آدمی کی قیمت سو اونٹ ہیں، اگر کوئی بکریوں سے دینا چاہے تو ایک ہزار بکری، روپیہ، پیسہ اور نقدی سے دینا چاہے تو دس ہزار درہم اس کی قیمت ادا کرے، سونے سے دینا چاہے تو ایک سو دینار، اس کی قیمت کم و بیش ہوجاتی ہے، غرضیکہ اولیاءِ مقتول میں سے اگر ایک آدمی معاف کردے تو قصاص نہیں لیا جاسکتا۔

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا مرتد کے بارہ میں حکیمانہ مشورہ:

وہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا واقعہ درمیان میں رہ گیا، میں دوسری طرف چلا گیا۔

پوچھنے لگے کہ کوئی نیا واقعہ پیش آیا؟ کہنے لگے کہ: ایک شخص مسلمان ہوا تھا، مرتد ہوگیا۔ کہنے لگے: تم نے کیا کیا؟ کہا کہ: قتل کردیا۔ اس پر تو (قانون کے نفاذ پر تو) اعتراض نہیں کیا، لیکن فرمایا کہ: اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے!

اگر تم اس کو مہلت دیتے اور اس کو ایک کمرے میں بند کردیتے اور چوبیس گھنٹے میں ایک روٹی اس کو کھانے کے لئے دیتے، اور تین دن تک تم اس کو دعوت دیتے کہ وہ واپس آجائے تو یہ تمہارے لئے بہتر ہوتا۔

تو اگر کوئی مرتد ہوجائے اس کو اسلام میں دوبارہ آنے کی دعوت دی جائے گی، اگر وہ اس کو قبول کرلے، دوبارہ مسلمان ہوجائے تو سزا معاف ہوجائے گی، لیکن یہ دعوت دینا ضروری ہے؟ لازم ہے؟ یا بہتر ہے؟ عامۂ علمأ کے مختلف اقوال ہیں۔

حنفیہ کا قول ہے کہ اس کو واپس آنے کی دعوت دینا ضروری نہیں ہے، امام چاہے تو ویسے بھی بغیر دعوت کے قتل کرسکتا ہے، حاکم قتل کرسکتا ہے، لیکن دعوت دینا بہرحال مستحب اور بہتر ہے، ہوسکتا ہے کہ اس کے دل میں بات آجائے، اس کے شبہات دور کئے جائیں، معلوم نہیں کہ اس کو کیا شبہ پیش آگیا تھا؟ تین دن تک اس کو دعوت دی جائے، شبہات دور کرنے کی کوشش کی جائے، اگر تین دن کے اندر وہ کہتا ہے کہ میرے شبہات دور نہیں ہوئے اور یہ چاہتا ہے کہ اس کو مزید وقت دیا جائے تو مزید وقت بھی دیں گے، اس کی بھی اجازت ہے، لیکن اس کے باوجود بھی اس کے شبہات دور نہ ہوں تو ہم ذمہ دار نہیں ہیں، یہ نہیں کہ ہم اس کو مطمئن کریں، یہ ہماری ڈیوٹی نہیں ہے۔

میں بات کررہا تھا کہ تیسری صورت ہے قتل یعنی جان کے بدلے میں جان، یہ تین چیزیں ہیں جن کی وجہ سے کسی مسلمان کی جان لینا جائز ہے:

۱:......محصن ہونے کے باوجود زنا کرے

۲:......اسلام سے پھر کر مرتد ہوجائے

۳:......اور کسی مسلمان کو بے گناہ جان بوجھ کر قتل کردے۔

قتل کی پانچ قسمیں:

میں نے کہا ہے کہ علمأ نے قتل کی پانچ قسمیں بیان کی ہیں:

قتل عمد:

۱:......ایک ان میں سے قتل عمد ہے، قتل عمد میں قصاص ہوتا ہے یعنی خون کا بدلہ خون ہے، شرط یہ ہے کہ تمام کے تمام اولیا متفق ہوکر اس کا مطالبہ کریں، اگر ایک وارث نے کہہ دیا کہ میں معاف کرتا ہوں، اب دوسرے وارث قصاص نہیں لے سکتے، دیت لے سکتے ہیں۔

قتل شبہ عمد:

۲:......اور ایک قتل شبہ عمد کہلاتا ہے، یعنی مارا تو جان بوجھ کر، کسی غلط فہمی کی بنا پرنہیں مارا، لیکن کسی ہتھیار کے ساتھ یا دھار والے آلے کے ساتھ نہیں مارا، ویسے ہی کوئی ڈنڈا وغیرہ مار دیا تو وہ مرگیا۔

ہمارے عزیزوں کے گاؤں میں ایک واقعہ ہوا، شام کے وقت ایک آدمی اپنے مکان کے سامنے گلی میں بیٹھا ہوا حقے میں پانی ڈال رہا تھا، ایک دوسرا آدمی آیا اس کے ہاتھ میں ایک چھڑی تھی، اس نے وہ چھڑی اس کو ماری اور اس کو وہیں ڈھیر کردیا، اس کا بوڑھا باپ زندہ تھا، اس نے تھانے میں کہا کہ: جی یہ اپنی تقدیر سے مرا ہے، میرا بیٹا اپنی تقدیر سے مرا ہے، اتنی سی چھڑی سے کوئی آدمی مرجایا کرتا ہے؟ مارنے والے نے ایک معمولی سی چھڑی ماری، پتلی سی چھڑی تھی، خدا جانے اس کے کہاں لگی؟ مرگیا، کہنے لگے کہ بس اس کا وقت آگیا تھا، ورنہ اتنی سی چھڑی سے کیا آدمی مرجاتا ہے؟ یہ اپنی تقدیر سے مرا ہے، لیکن شریعت اس صورت میں بھی سزا کا حکم کرے گی، قصاص کا نہیں، کیونکہ یہ اتنی معمولی سی چھڑی آلہ قتل نہیں ہے، البتہ یہ قتل شبہ عمد کہلاتا ہے، اور اس صورت میں دیت مغلظہ ہوگی، ایک سو اونٹ، جن میں سے پچیس ایک سال والے، پچیس دو سال والے، پچیس تین سال والے، پچیس چار سال والے، عربی میں ان کے نام بھی ہیں۔

قتل خطأ:

۳:......ایک قتل خطأ کہلاتا ہے، قتل خطأ میں بھی دیت ہے، لیکن دیت مخففہ ہے، ہلکی دیت۔ اس میں بھی ہوتے یہی سو اونٹ ہیں، مگر اس میں پانچ قسمیں کردی جاتی ہیں، خیر یہ مسائل تو بعد کی چیز ہے۔

پھر خطأ کی دو صورتیں ہوتی ہیں، خطأ کی ایک صورت یہ ہے کہ کسی شکار کو نشانہ بنایا تھا، لیکن اتفاق سے گولی کسی انسان کو لگ گئی، یعنی کوئی آدمی ایسے ہی سامنے آگیا، اس کا مقصد اس کو مارنا نہیں تھا، جیسے عام طور پر پڑھتے رہتے ہیں کہ اتفاقاً گولی چل گئی ایک آدمی اپنی بندوق صاف کر رہا تھا، یا اپنا پستول صاف کر رہا تھا، اتفاقاً گولی چل گئی، یہ قتل خطأ کہلاتا ہے، اسی طرح ڈرائیوروں کے ہاتھ سے جو لوگ مرجاتے ہیں، یہ بھی قتل خطأ ہے، وہ بے چارے جان کے (دانستہ) نہیں مارتے، لیکن بے احتیاطی کرتے ہیں، ان کی بے احتیاطی سے آدمی مرگیا۔

اور قتل خطأ کی دوسری صورت یہ ہے کہ قصداً نشانہ تو اسی کو بنایا تھا، لیکن یہ سمجھا تھا کہ وہ کافر ہے، حالانکہ تھا وہ مسلمان! یعنی جہاد میں نشانہ بنایا تھا کسی کافر کو، مگر پہچان نہیں سکا، نکلا وہ مسلمان۔ حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ کے والد ماجد حضرت یمان رضی اللہ عنہ بھی ایک مسلمان کے ہاتھ سے شہید ہوگئے تھے، مارنے والے کو غلطی لگ گئی یا پھر نشانہ تو بنایا تھا کسی شکار کو، لیکن پتہ نہیں چلا کہ وہ انسان ہے، نشانہ تو اسی کو بنایا لیکن پہچان نہیں سکا، یہ بھی خطأ کی شکل ہے۔

اور قرآن کریم میں قتل خطا کی تین سزائیں بیان فرمائی ہیں، عام طور پر لوگ اس معاملہ میں احتیاط نہیں کرتے، قرآن کریم کی سورۂ نسأ اور پانچویں پارے میں اس کے حکم میں پورا رکوع ہے:

”وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ اَنْ يَّقْتُلَ مُؤْمِنًا اِلَّا خَطَاً وَّمَنْ قَتَلَ مُؤْمِنًا خَطَاً فَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ وَّدِيَةٌ مُّسَلَّمَةٌ اِلٰى اَهْلِهٖ ...... فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ شَهْرَيْنِ مُتَتَابِعَيْنِ تَوْبَةً مِّنَ اللّٰهِ۔“ (النسآئ:۹۲)

یعنی کسی مؤمن سے ہو ہی نہیں سکتا کہ کسی مؤمن کو قتل کردے، ہاں! غلطی ہوجانا دوسری بات ہے، اس کے بعد فرمایا کہ جو کسی مسلمان کو خطاءً قتل کردے، اس کی ایک سزا تو یہ ہے کہ دیت ادا کرے سو اونٹ...... اور دوسری سزا یہ کہ غلام آزاد کرے (پہلے زمانہ میں غلام ہوتے تھے، غلام بھی عام نہیں) مؤمن غلام کو آزاد کرے، جس کے پاس غلام نہ ہو تو دو مہینے لگاتار (پے در پے) روزے رکھے (بیچ میں ناغہ نہ کرے، نہ اختیاری ناغہ، نہ جبری ناغہ، مثلاً: روزے رکھ رہا تھا کہ درمیان میں کسی مجبوری سے ناغہ ہوگیا، یا بخار ہوگیا، تو نئے سرے سے شروع کرے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے: ”شَهْرَيْنِ مُتَتَابِعَيْنِ“ (دو مہینے لگاتار) فرمایا ہے۔ ہاں! عورتوں کے خاص ایام مستثنیٰ ہیں، وہ جبری ہیں، من جانب اللہ ہیں۔ اور تیسرے ”تَوْبَةً مِّنَ اللّٰهِ“ اللہ سے توبہ بھی کرے۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب خطأ ہے تو توبہ کیوں؟ اس لئے کہ خطأ میں اتنی خطأ تو ہوئی کہ اس نے احتیاط سے کام نہیں لیا، اور معاملہ انسانی جان کا ہے، تو اس کو فرمایا کہ کسی مسلمان کا خون حلال نہیں، مگر حق کے ساتھ اور یہ حق کی تشریح ہے کہ تین قسم کے خون حلال ہیں۔

سبحانک اللّٰھم وبحمدک اشھد ان لا الٰہ الا انت استغفرک واتوب الیک

ظلم وستم اور حرص کے نقصانات

''ظلم'' کے بہت سارے معنی آتے ہیں، اور اس کا بہت زیادہ وسیع مفہوم ہے، لیکن یہاں ''ظلم'' سے مراد یہ ہے کہ کسی کی حق تلفی کرنا، کسی کا حق ادا نہ کرنا اور دوسروں کے حقوق کو اپنے ذمہ لے لینا، دنیا کا ظالم آخرت کا مفلس ہوگا۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمدللہ وسلام علی عبادہ الذین اصطفی!

”عَنْ عَبدِاللّٰہِ بْنِ عُمَرَ رَضِیَ اللّٰہُ عَنہُمَا قَالَ: خَطَبنَا رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیہِ وَسَلَّمَ فَقَالَ: ”اِیَّاکُم وَالظُّلْمَ! فَاِنَّ الظُّلْمَ ظُلُماتٌ یَّوْمَ الْقِیامَۃِ، وَاِیَّاکُمُ وَالْفُحشَ وَالتَّفَحُّشَ! وَاِیَّاکُم وَالشُّحَّ! فَاِنَّما ھَلَکَ مَنْ کَانَ قَبْلَکُمْ بِالشُّحِّ، اَمَرھُمْ بِالْقَطِیعَۃِ فَقَطَعُوا، وَاَمَرھُمْ بِالْبُخلِ فَبَخِلُوا، وَاَمَرھُمْ بِالْفُجُوْرِ فَفَجَرُوا۔“ فَقَامَ رَجُلٌ، فَقَالَ: یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ! اَیُّ الْاِسْلَامِ اَفْضَلُ؟ قَالَ: ”اَنْ یَّسْلَمَ الْمُسْلِمُوْنَ مِنْ لِّسَانِکَ وَیَدِکَ!“

فَقَالَ ذَالِکَ الرَّجُلُ اَوْ غَیرُہٗ: یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ! اَیُّ الْھِجرَۃِ اَفْضَلُ؟ قَالَ: ”اَنْ تَھْجُرَ مَا کَرِہَ رَبُّکَ! وَالْھِجرَۃُ ھِجْرَتَانِ: ھِجرَۃُ الْحَاضِرِ وَھِجرَۃُ الْبَادِیْ، فَھِجرَۃُ الْبَادِیْ اَنْ یُّجِیبَ اِذَا دُعِیَ وَیُطِیعَ اِذَا اُمِرَ، وَھِجرَۃُ الْحَاضِرِ

اَعْظَمُهَا بَلِيَّةً وَاَفْضَلُهَا اَجْرًا۔"

(الترغیب والترہیب ج:۳ ص:۳۷۹)

ترجمہ:......"حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں خطبہ دیا، اس میں ارشاد فرمایا کہ: "ظلم سے بچو! کیونکہ ظلم تاریکیاں ہوں گی قیامت کے دن، اور بدگوئی اور فحش کلامی سے بچو! اور حرص سے بچو! اس لئے کہ تم سے پہلے جو لوگ ہلاک ہوئے وہ حرص کی وجہ سے ہلاک ہوئے۔ اس نے ان کو حکم کیا قطع رحمی کا، انہوں نے قطع رحمی کی۔ اس نے ان کو حکم کیا بخل کا، انہوں نے بخل کیا۔ اس نے ان کو حکم کیا بدکاری کا، انہوں نے بدکاری کی۔"

ایک شخص کھڑا ہوا اور کہنے لگا: یا رسول اللہ! کون سا اسلام افضل ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ: "جو مسلمان تیری زبان اور ہاتھ سے محفوظ رہیں۔" کسی اور آدمی نے کہا کہ: یا رسول اللہ! ہجرت کون سی افضل ہے؟ فرمایا کہ: "تو چھوڑ دے اس چیز کو جس کو تیرا رب ناپسند کرتا ہے، اور ہجرت دو قسم کی ہوتی ہے: ایک شہری کی ہجرت اور دوسری بادیہ نشین کی ہجرت۔ بادیہ نشین کی ہجرت تو یہ ہے کہ جب اس کو بلایا جائے تو لبیک کہے، اور جب اس کو حکم دیا جائے تو وہ حکم مان لے۔ لیکن شہری کی ہجرت سب سے زیادہ آزمائش والی ہے اور فضیلت کے اعتبار سے بڑھی ہوئی ہے۔"

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے برے اخلاق سے آگاہ کرنے کے لئے یہ خطبہ ارشاد فرمایا۔

ظلم کا معنی ومفہوم:

’’ظلم‘‘ کے بہت سارے معنی آتے ہیں، اور اس کا بہت زیادہ وسیع مفہوم ہے، لیکن یہاں ’’ظلم‘‘ سے مراد یہ ہے کہ کسی کی حق تلفی کرنا، کسی کا حق ادا نہ کرنا اور دوسروں کے حقوق کو اپنے ذمہ لے لینا، دنیا کا ظالم آخرت کا مفلس ہوگا، چنانچہ حدیث شریف میں فرمایا گیا ہے:

’’اَتَدْرُوْنَ مَا الْمُفْلِسُ؟ قَالُوْا: اَلْمُفْلِسُ فِيْنَا مَنْ لَّا دِرْهَمَ لَهٗ وَلَا مَتَاعَ۔ فَقَالَ: اِنَّ الْمُفْلِسَ مِنْ اُمَّتِيْ مَنْ يَّأْتِيْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ بِصَلٰوةٍ وَصِيَامٍ وَزَكٰوةٍ وَيَأْتِيْ قَدْ شَتَمَ هٰذَا وَقَذَفَ هٰذَا، وَاَكَلَ مَالَ هٰذَا، وَسَفَكَ دَمَ هٰذَا، وَضَرَبَ هٰذَا، فَيُعْطٰى هٰذَا مِنْ حَسَنَاتِهٖ وَهٰذَا مِنْ حَسَنَاتِهٖ، فَاِنْ فَنِيَتْ حَسَنَاتُهٗ قَبْلَ اَنْ يُّقْضٰى مَا عَلَيْهِ اُخِذَ مِنْ خَطَايَاهُمْ فَطُرِحَتْ عَلَيْهِ ثُمَّ طُرِحَ فِي النَّارِ۔‘‘ (مشکوٰۃ ص:۴۳۵)

ترجمہ:......تم مفلس کس کو سمجھتے ہو؟ لوگوں نے کہا کہ: ہم تو مفلس اس کو کہتے ہیں جس کے پاس روپیہ پیسہ اور سامان نہ ہو۔ فرمایا: ’’میری امت کا مفلس وہ ہے جو قیامت کے دن نماز، روزہ اور زکوٰۃ لے کر آئے، لیکن اس حالت میں آئے کہ کسی کو برا بھلا کہا تھا، کسی کی بدگوئی کی تھی، کسی کا مال کھایا تھا، کسی کی خون ریزی کی تھی، کسی کو مارا تھا، (تو وہاں روپیہ پیسہ تو ہوگا نہیں، نیکیاں ہوں گی، اس کی نماز کسی کو دے دی گئی، روزہ کسی اور کو دے دیا گیا، حج کوئی اور لے گیا، زکوٰۃ بھی کوئی اور لے گیا، غرضیکہ ناقل) اس کی نیکیوں کی قیمت لگا کر اس کے ذمہ

جو حقوق تھے وہ اور اس کے مظالم کا بدلہ ادا کیا جائے گا۔ اس کے باوجود بھی اگر حقوق پورے نہیں ہوں گے، اربابِ حقوق کے گناہ لے کر اس کے ذمہ ڈال دیئے جائیں گے، پھر اس کو جہنم میں پھینک دیا جائے گا۔ (آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: وہ شخص میری امت کا مفلس ہے)۔''

ظلم وزیادتی سے آخرت کی تاریکی:

شاید ہم لوگ، لوگوں کی حق تلفی کرنے، ان پر ظلم اور زیادتی کرنے کو، عقلمندی یا ہوشیاری سمجھتے ہوں، لیکن یہ قیامت کے دن تاریکی ہوگی، راستہ پھر نظر نہیں آئے گا۔

ظلم کی تاریکی کا عجیب قصہ:

مجھے پہلے زمانے کا ایک واقعہ یاد آیا، ایک درویش تھے، تھیلی میں ان کے پاس پیسے ہوتے تھے، وہ کسی دکاندار سے کوئی چیز لیتے تو اس کے سامنے تھیلی ڈھیر کردیتے، کہتے: بھائی! اس میں سے جتنے پیسے تمہارے بنتے ہیں لے لو، باقی اس میں واپس ڈال دو! دکاندار ایسا کرلیتے۔ ایک دن چیزیں لے کر واپس آرہے تھے، تھیلی ہاتھ میں تھی، جب وہ گھر میں داخل ہونے لگے تو ایک آدمی ان کے تعاقب میں ہوگیا، گھر میں داخل ہونے سے پہلے تھیلی ان سے چھین لی، بزرگ تو گھر میں چلے گئے، اب یہ تھیلی لے کر واپس آنے لگا، تو آگے راستہ بند ہوگیا، اس کو نظر نہیں آرہا تھا کہ کس طرف جانا ہے؟ واپس آتا ہے تو راستہ نظر آتا ہے، اس طرح اس نے بہت سارے چکر لگائے، آخرکار جب اس نے دیکھا کہ یہ تھیلی میں لے کر نہیں جاسکتا تو دروازہ کھٹکھٹانے لگا، اور اس بزرگ سے کہنے لگا: باباجی! اپنی تھیلی واپس لے لو، وہ بزرگ آئے اور تھیلی لے لی، یہ واپس جانے لگا تو راستہ کھل گیا۔

ہر ایک آدمی کے ساتھ ایسا نہیں ہوتا، کبھی کبھی خرقِ عادت کے طور پر ہوجاتا ہے۔

شہریوں کی جان و مال کی حفاظت حکومت کا فرض:

اب کسی کا مال لینا، کسی کے گھر ڈاکہ ڈالنا، کسی کی چوری کر لینا بہت عام بات ہوگئی ہے، یا شاید موجودہ ''کلچر'' میں داخل ہوگیا ہے، معلوم نہیں کلچر کے کیا معنی ہوتے ہوں گے؟ درمیان میں بات عرض کردوں کہ شہریوں کے مال کی، ان کی جان کی، ان کی عزت اور آبرو کی حفاظت کرنا حکومت کا فرض ہے، اور جو حکومت شہریوں کی جان و مال کی حفاظت نہیں کرسکتی اس کو اخلاقی طور پر اور شرعی طور پر حکومت کرنے کا کوئی حق حاصل نہیں۔

جان و مال کا تحفظ نہ دینے کی صورت میں ٹیکس لینا:

صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے زمانے میں ہمارے ذمی شہریوں یعنی وہ علاقے جو ہم نے فتح کر لئے تھے، وہ تمام کے تمام علاقے مسلمانوں کے زیر حفاظت تھے، اگر وہاں کوئی اس قسم کا واقعہ پیش آجاتا، کوئی لوٹ مار کر کے چلا جاتا، تو قانون یہ تھا کہ ہم مسلمان ان شہریوں سے جزیہ اور ٹیکس نہیں لے سکتے تھے، اس لئے کہ ہم جان و مال کی حفاظت نہیں کرسکے، ہماری کوتاہی ہے۔ اور غیر مسلم شہری جبکہ وہ ہمارے ماتحت ہوگئے تھے، ان کی جان و مال کی حفاظت ہمارے ذمہ تھی، اور اگر کوتاہی یا غفلت کی وجہ سے یا کمزوری کی وجہ سے ہم ان کی جان و مال کی حفاظت نہیں کرسکتے تو ہمیں ان سے جزیہ یا کوئی ٹیکس لینے کا کوئی حق نہیں۔

حقوق ادا کرو ورنہ:

تو خیر میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ دوسروں کے حقوق غصب کرنا اور ان کی حق تلفی کرنا ہم اس کو ''ہوشیاری'' اور ''دانائی'' کہتے ہوں گے، لیکن جیسے میں نے اس بزرگ کا واقعہ ذکر کیا ہے، اسی طرح قیامت کے دن سارے راستے بند ہوجائیں گے،

قیامت کے دن ''یوم الدین'' بدلے کا دن، وہاں ہر ایک کو دوسرے کے حقوق دلائے جائیں گے۔ اس لئے کسی شخص کا حق اگر تمہارے ذمہ ہو تو اس کے ادا کرنے کی فکر کرو اور تمہارا حق اگر کسی کے ذمہ رہ جائے تو فکر مت کرو، وہ محفوظ ہے، وہ تم کو ہر حال میں ملے گا۔

اسلام حقوق مانگنے کی نہیں ادا کرنے کی تلقین کرتا ہے:

ہمارا دین حق ادا کرنے کی تلقین کرتا ہے، جو ہمارے ذمہ حقوق ہیں ان کو ادا کرنے کی تلقین کرتا ہے۔ لوگوں کے حقوق ادا کریں اور جو حقوق لوگوں کے ذمہ ہیں ان کو یہ نہیں کہتا کہ: جاؤ جاکر حق مانگو! اس لئے کہ ان کا حق تو محفوظ ہے، دنیا میں نہیں دے گا تو آخرت میں تو دینا پڑے گا۔

اس پل پر حساب دینا چاہتے ہو یا پل صراط پر؟

اس پر ایک واقعہ یاد آیا کہ ایک بادشاہ نے محل بنانا چاہا تھا، ایک بڑھیا کا چھوٹا سا گھروندا اس میں تھا اور بڑھیا سے کہا گیا: تم پیسے لے لو اور تم کو دوسری جگہ گھر لے کر دیتے ہیں، کہنے لگی کہ: میں نہیں دیتی، میں تو اس جگہ پر رہوں گی۔ بادشاہ کے حکام یا عمال نے زبردستی بڑھیا کا گھر گرادیا، بادشاہ کا محل جو بنانا تھا۔ بادشاہ کی سواری گزر رہی تھی، پل پر سے گزری تو بڑھیا وہاں کھڑی ہوگئی، اور سواری گزرنے لگی تو بڑھیا نے اس کی لگام پکڑلی، بادشاہ نے کہا کہ: اماں! کیا بات ہے؟ کیا چاہتی ہو؟ کہنے لگی کہ: چاہتی تو میں کچھ نہیں ہوں، تمہارا محل بنانے کے لئے ایک غریب بڑھیا کا گھروندا تمہارے حاکموں نے گرادیا ہے، میں صرف اتنا پوچھنا چاہتی ہوں کہ اس کا حساب اِس پُل پر دینا ہے یا اُس پُل پر؟ میں صرف اتنا پوچھنا چاہتی ہوں تم سے، کوئی بات نہیں منواتی، انصاف نہیں طلب کرتی، مجھے اس کی ضرورت نہیں ہے، صرف یہ دیکھنا چاہتی ہوں اس کا بدلہ یا اس کا حساب اِس پُل پر دینا ہے یا اُس پُل پر دینا ہے؟

اس لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:

"اَلظُّلْمُ ظُلُمَاتٌ یَّوْمَ الْقِیَامَةِ۔" (مشکوٰۃ ص:۴۳۴)

ترجمہ:...... "ظلم ظلمتیں ہوں گی قیامت کے دن۔"

ظلمت کے معنی ہیں اندھیرا، تاریکی، کوئی چیز نظر نہیں آئے گی، کسی کی حق تلفی نہ کرو اور اپنے نامہ عمل کو اس سے محفوظ رکھو۔

اپنا بوجھ ہلکا کرلو:

شیخ عطار رحمہ اللہ نے خوب کہا ہے، فرماتے ہیں کہ: تمہاری سواری نازک سی لگ رہی ہے، بہت نازک سواری ہے، ذرا اپنا بوجھ ہلکا کرلو، ورنہ اس بوجھ کو اٹھا کر چلنا بہت مشکل ہوجائے گا، بڑی مشکل پیش آئے گی۔ بہت ہی مبارک ہیں وہ بندے جو مرنے سے پہلے لوگوں کے حقوق ادا کردیں، معاف کروالیں، اور بہت ہی بدقسمت ہیں وہ بندے جو لوگوں کے حقوق کا پشتارا اپنی کمر پر لاد کر مریں اور وہاں ان کو حساب دینا پڑے۔

بدگوئی اور دشنام تراشی خبث باطن کی علامت:

دوسری بات یہ ارشاد فرمائی کہ بدگوئی اور دشنام طرازی، گالیاں بکنا اور دوسری بکواس کرنا، فرمایا اس سے بچا کرو۔ اس کی کوئی وجہ نہیں ذکر فرمائی، اس لئے عرب کا مشہور محاورہ ہے کہ ہر برتن سے وہی چھلکا کرتا ہے جو اس میں ہو، اگر برتن میں دودھ بھرا ہوا ہوگا تو دودھ چھلکے گا، شراب بھری ہوگی تو وہ چھلکے گی، زمزم بھرا ہو وہ چھلکے گا۔ نعوذ باللہ! گندگی بھری ہوئی ہو تو وہ چھلکے گی، تمہاری یہ زبان تمہارے دل کے برتن کو چھلکاتی ہے، اور اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ تمہارے دل میں کیا بھرا ہوا ہے، اس کو کہنے کی ضرورت نہیں، اگر گندگی نکلتی ہے، گالیاں بکتے ہو، اس کے معنی یہ ہیں کہ اندر گندگی بھری ہوئی ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تنبیہ فرماتے ہیں کہ ذرا اپنے

برتن کو ٹھیک کرو، کیونکہ جب آدمی افسردہ ہوتا ہے تو اس سے غمگین باتیں نکلتی ہیں، اور آدمی خوشی سے لبریز ہوتا ہے تو اس سے خوشی کی باتیں نکلتی ہیں۔ بھائی! تمہارے دل میں خیر ہوگی تو تمہارے منہ سے بھی کلمہ خیر نکلے گا، اور نعوذ باللہ! ثم نعوذ باللہ! گندگی بھری ہوئی ہوگی تو پھر گالیاں ہی منہ سے نکلیں گی، اور کیا منہ سے نکلے گا؟

زبان کی حفاظت کی ضرورت:

اپنی زبان کا جائزہ لو اور دیکھو کہ ہماری زبان کس طرح استعمال ہوتی ہے؟

حدیث شریف میں آتا ہے کہ:

"اِذَا اَصْبَحَ ابْنُ اٰدَمَ فَاِنَّ الْاَعْضَاءَ کُلَّھَا تُکَفِّرُ اللِّسَانَ، فَتَقُوْلُ: اِتَّقِ اللّٰہَ فِیْنَا! فَاِنَّا نَحْنُ بِکَ، فَاِنِ اسْتَقَمْتَ اِسْتَقَمْنَا، وَاِنْ اَعْوَجَجْتَ اَعْوَجَجْنَا۔"

(مشکوٰۃ ص:۴۱۳)

ترجمہ:......"آدم کا بیٹا جب صبح کرتا ہے تو تمام اعضأ زبان کے سامنے ہاتھ جوڑتے ہیں اور اس کو کہتے ہیں کہ ہم تیرے تابع ہیں خدا کے لئے تو سیدھی چلی تو ہم بھی سیدھے چلیں گے، اور اگر تو ٹیڑھی چلی تو ہم بھی ٹیڑھے ہوجائیں گے۔"

زبان تو ایک کلمہ منہ سے بول کر چھپ جاتی ہے، اس کو کوئی کچھ نہیں کہتا، مگر جوتے سر پر پڑتے ہیں، بھاگنا پاؤں کو پڑتا ہے، لڑائی ہاتھوں کو کرنا پڑتی ہے، معلوم ہوا کہ زبان کی ذمہ داری بھی اعضأ پر آجاتی ہے، اس لئے تو ہاتھ جوڑ کر کہتے ہیں کہ خدا کے لئے سیدھے رہنا، یہ دن عافیت سے گزار لینا، تمام اعضأ ہر صبح کو منت سماجت کرتے ہیں، اور اس کے سامنے ہاتھ جوڑتے ہیں۔

صدیق اکبرؓ کا اپنی زبان کو کھینچنا:

ایک حدیث میں ہے کہ:

”اِنَّ عُمَرَ دَخَلَ یَوْمًا عَلٰی اَبِیْ بَکْرِ الصِّدِّیْقِ وَھُوَ یَجْبِذُ لِسَانَہٗ، فَقَالَ عُمَرُ: مَہٗ؟ غَفَرَ اللّٰہُ لَکَ! فَقَالَ لَہٗ اَبُوْبَکْرٍ: اِنَّ ھٰذَا اَوْرَدَنِی الْمَوَارِدَ۔“ (مشکوٰۃ:۴۱۵)

ترجمہ:...... ”حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ایک دن بیٹھے زبان کھینچ رہے تھے، حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ آئے، کہنے لگے: کیا بات ہوگئی ہے؟ فرمایا: اس نے مجھے بہت سارے گھاٹوں پر اُتارا ہے۔“

حضرت ابن عمرؓ کا زبان کی حفاظت کا انداز:

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ زبان کے نیچے کنکر رکھتے تھے تاکہ جب وہ حرکت کرے تو معلوم ہوجائے کہ یہ زبان چلنے لگی ہے۔

ہمیں اس چیز کا احساس ہی نہیں ہوتا کہ ہم کیا کر رہے ہیں؟ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس کو مکمل طور پر ہمارے قبضہ میں دے دیا ہے، ایسا نہیں ہوتا کہ ہم کوئی بات کہنا چاہیں تو زبان بند ہوجائے، احساس ہی نہیں ہوتا، تو بھائی! اپنی زبان کی حفاظت کرنی چاہئے۔

بدزبانی اور فحش کلامی سے بچنے کی تلقین:

بدزبانی اور فحش کلامی سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بچنے کی تلقین فرماتے ہیں۔ ایک حدیث شریف میں فرمایا کہ:

”مَا کَانَ الْفُحْشُ فِیْ شَیْءٍ اِلَّا شَانَہٗ وَمَا کَانَ الْحَیَاءُ فِیْ شَیْءٍ اِلَّا زَانَہٗ۔“ (مشکوٰۃ ص:۴۱۴)

ترجمہ:...... ”سختی جس چیز میں بھی پیدا ہوجاتی ہے، اس کو عیب دار کردیتی ہے، اور نرمی اور خوش اخلاقی جس چیز میں بھی پیدا ہوجاتی ہے اس کو زینت دے دیتی ہے۔“

زبان میں ہڈی نہ ہونے کی حکمت:

قدرت کو سخت زبانی ناپسند ہے، ہڈی کے بغیر اللہ تعالیٰ نے زبان کو بنایا ہے، کیونکہ اس میں سختی اللہ تعالیٰ کو پسند نہیں ہے، نرم گفتاری اور شیریں کلامی کی عادت ڈالو، سخت کلامی کرنا اور بدگوئی کرنا عیب ہے، اور ایک مؤمن کو سبق حاصل کرنا چاہئے۔

خیانت سے بچو:

تیسری بات فرمائی کہ خیانت سے بچو!

''خیانت'' امانت کی ضد ہے، آدمی کے دل میں امانت کا ہونا یہ اس کی صفت ہے، جس کو ہم امانت داری کہتے ہیں، اور پھر یہ اس کے مظاہر ہیں جو سامنے آتے ہیں، امانت داری کی شکلیں سامنے آتی ہیں، یہ اس کے مظاہر ہوتے ہیں، وہ امانت داری نہیں بلکہ وہ امانت داری کے نتائج ہیں، امانت داری آدمی کے دل کی ایک صفت ہے اور خیانت اس کی ضد ہے۔

امانت کے معنیٰ:

علمائ فرماتے ہیں کہ ''امانت'' کے معنیٰ ہیں آدمی پر اس بات کا احساس غالب ہونا کہ میں جو کچھ کر رہا ہوں، قیامت کے دن مجھ کو اس چیز کا جواب دینا ہوگا، اس کی جواب دہی کرنی ہوگی۔ انسان کے اعضاءٔ جو اللہ تعالیٰ نے اس کو دیئے ہیں یہ بھی امانت ہیں، ان کا ٹھیک استعمال ہوا تو یہ امانت داری ہوئی، اور ان اعضاءٔ کا استعمال ٹھیک نہیں ہوا تو یہ خیانت ہے۔ کسی نے آپ کے پاس کوئی چیز امانت کے طور پر رکھوائی، وہ بھی امانت ہے، اس میں تصرف کرنے کا آپ کو حق حاصل نہیں ہے۔

کسی کی بات دوسرے کو بتلانا بھی امانت کے منافی ہے:

کسی کی راز کی بات سن کر دوسرے کو بتلانا یہ بھی امانت میں خیانت ہے، چنانچہ حدیث شریف میں ہے:

''اِذَا حَدَّثَ الرَّجُلُ بِالْحَدِيْثِ ثُمَّ الْتَفَتَ فَهِيَ اَمَانَةٌ۔'' (ابوداؤد ج:۲ ص:۳۱۲)

ترجمہ:...... ''جب کسی نے چپکے سے کوئی بات کہی (اور بات کرنے کے بعد پھر اِدھر اُدھر دیکھنے لگا کہ کوئی اور تو میری بات نہیں سن رہا) فرمایا اس کی یہ بات بھی تمہارے پاس امانت ہے۔''

جب وہ دائیں بائیں دیکھتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ کسی اور کا سننا پسند نہیں کرتا، اور کسی کو سنانا نہیں چاہتا، اس نے یہ بات صرف تم کو سنائی ہے، تو یہ اس کا راز، اس کی امانت ہے۔ اگر اس کے راز کو افشا کروگے تو خیانت کے مرتکب ہوجاؤگے۔ ایک اور حدیث شریف میں ہے کہ:

''اَلْمَجَالِسُ بِالْاَمَانَةِ، اِلَّا ثَلَاثَةَ مَجَالِسَ، سَفْکُ دَمٍ حَرَامٍ اَوْ فَرْجٌ حَرَامٌ اَوِ اقْتِطَاعُ مَالٍ بِغَيْرِ حَقٍّ۔'' (مشکوٰۃ ص:۴۳۰)

یعنی مجلس کے اندر جو بات کہی جائے وہ امانت ہوتی ہے، مگر تین چیزیں امانت نہیں ہیں۔ کوئی شخص گناہ کی بات کرتا ہے، کوئی بھی گناہ کا منصوبہ بناتا ہے تو تم اس کو چھپا کر نہ رکھو، اس کو ظاہر کردو۔ یا کوئی شخص ناجائز خون کرنا چاہتا ہے، کسی کو قتل کرنے کا ارادہ اور منصوبہ بنا رہا ہے، اور آپ کو معلوم ہوگیا تو یہاں خاموشی گناہ ہوگی،

یا کوئی بدکاری کا منصوبہ بناتا ہے اور آپ کو معلوم ہے تو اس کو چھپانا گناہ ہے، کوئی کسی کے مال لوٹنے کا منصوبہ بناتا ہے اور تمہارے سامنے اس کا اظہار کرتا ہے یہ بھی گناہِ کبیرہ ہے، اور اس گناہِ کبیرہ پر تم اگر اس راز کو چھپاؤ گے تو تم بھی اس کبیرہ گناہ کے مرتکب ہوجاؤ گے۔ غرضیکہ کسی کا راز بھی امانت ہے، اور یہاں پر ایک چھوٹی سی بات اور بھی عرض کردیتا ہوں۔

بلا اجازت کسی کا خط پڑھنا بھی خیانت ہے:

کسی کا خط اس کی اجازت کے بغیر پڑھنا بھی خیانت ہے، حتیٰ کہ باپ کا خط بیٹے کو اور بیٹے کا خط باپ کو پڑھنا بھی جائز نہیں ہے۔ الّا یہ کہ باپ اس خیال سے پڑھے کہ بیٹا کسی غلط کام میں مبتلا نہ ہو، تو وہ دوسری بات ہے، کیونکہ یہ چیز اصلاح کی مد میں آگئی، ورنہ باپ کا خط بیٹے کو اور بیٹے کا خط باپ کو پڑھنا جائز نہیں، یہ بھی امانت ہے۔

نااہل کو منصب دینا یہ بھی خیانت ہے:

یہ سرکاری مناصب، عہدے جو ہمارے ہاں ریوڑیوں کے بھاؤ بکتے ہیں، یہ بھی امانت ہیں۔ حدیث شریف میں ہے:

”جَاءَ اَعْرَابِیٌّ فَقَالَ: مَتَی السَّاعَۃُ؟ قَالَ: اِذَا ضُیِّعَتِ الْاَمَانَۃُ فَانْتَظِرِ السَّاعَۃَ! قَالَ: کَیْفَ اِضَاعَتُھَا؟ قَالَ: اِذَا وُسِّدَ الْاَمْرُ اِلٰی غَیْرِ اَھْلِہٖ فَانْتَظِرِ السَّاعَۃَ!“

(مشکوٰۃ ص:۴۶۹)

ترجمہ:......”ایک آدمی حاضر ہوا، عرض کیا: یا رسول اللہ! قیامت کب آئے گی؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جب امانت ضائع کردی جائے گی تو قیامت کا انتظار کرو!

اس کی سمجھ میں بات نہیں آئی، پھر اس نے سوال کیا کہ: یا رسول اللہ! امانت کے ضائع ہونے کا کیا مطلب ہے؟ فرمایا: جب معاملات نااہل کے سپرد کردیئے جائیں تو قیامت کا انتظار کرو!''

جو شخص کسی منصب کا اہل نہیں ہے، مگر تم وہ منصب اس کے سپرد کردیتے ہو یہ بھی خیانت ہے۔

ووٹ بھی امانت ہے:

آج کل ارکانِ اسمبلی پر بڑی تنقید ہو رہی ہے کہ ارکانِ اسمبلی مجرم ہیں سوال یہ ہے کہ جنھوں نے ان کو ووٹ دیا ہے کیا وہ مجرم نہیں؟ کہ آخر تم نے غلط آدمیوں کو کیوں ووٹ دیا تھا؟ تمہاری آنکھیں پھوٹی ہوئی تھیں؟ تم کو معلوم نہیں تھا کہ یہ بدمعاشوں کا ٹولہ ہے، یہ ملک و ملت کے دشمن ہیں، تم ان کے بیانات نہیں پڑھتے تھے؟ ان کا کردار تمہارے سامنے نہیں تھا؟ تم ایک پارٹی کو یا ایک فرد کو ووٹ دیتے ہو، تم سمجھتے ہو یہ بھی دنیاوی معاملہ ہے، اس کی کوئی مسئولیت نہیں ہوگی؟ نہیں! یہ بھی امانت ہے، اور یہ قیامت کے آثار میں سے ہے کہ تم اپنی اس امانت کو ضائع کرتے ہو۔

مسلمانوں کے اقتدار کے زوال کے اسباب:

یہ لطیفہ شاید میں نے آپ کو سنایا تھا کہ حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ، دلّی کی جامع مسجد میں وعظ فرما رہے تھے، اس وقت انگریز کی نئی نئی عملداری آئی تھی، ایک انگریز بھی آگیا، حضرت کا وعظ ختم ہوا تو کہنے لگا کہ: بھائی! تم اپنی نماز بعد میں پڑھ لینا، میرے ایک سوال کا جواب دو! مسجد میں کھڑے ہوکر مسلمانوں سے کہا: میرا سوال یہ ہے کہ تم ہندوستان کے آٹھ سو سال سے حکمران چلے آرہے تھے، تمہاری حکومت ختم کیوں ہوئی؟ اور ہم اتنی دور سے آکر تم پر حاکم کیوں بن گئے؟

نفری ہمارے پاس نہیں، طاقت ہمارے پاس نہیں، ہمارے اور تمہارے ملک کے درمیان ہزاروں میل کا فاصلہ ہے، ہم وہاں سے چل کر آئے اور تم پر حاکم بن گئے، اور تمہاری آٹھ سو سالہ حکومت ہم نے ختم کی، اس کی وجہ کیا تھی؟ لوگ بیچارے کیا جواب دیتے، وہ انگریز کہنے لگا: اس سوال کا جواب میرے پاس ہے۔ حضرت شاہ صاحب کی طرف اشارہ کرکے کہنے لگا کہ ایسے لوگ جو حکومت چلانے کے اہل تھے وہ حجروں میں بیٹھ گئے، اور جو حکومت چلانے کے اہل نہیں تھے وہ حکومت کے ادارے میں آگئے، اس لئے یہی نتیجہ نکلنا چاہئے تھا۔

نظام جمہوریت کے ذریعہ اپنے سروں پر جوتے لگوانے کا انتظام:

میں نے پہلے بھی ایک دفعہ کہا تھا کہ تمہارے سر پر تمہارے ہاتھ سے جوتے لگوانے کے لئے اللہ نے یہ انتظام کردیا ہے، جمہوریت میں یہ ووٹنگ کا جو نظام ہے ناں! میں تو اس کا ویسے ہی قائل نہیں ہوں، اقبال کے بقول:

گریز از طرزِ جمہوری، غلامِ پختہ کارے شو
کہ از مغزِ دو صد خر فکرِ انسانے نمی آید

اقبال کہتا ہے اس جمہوریت پر لعنت بھیجو! اور ذرا عقل مندی سے کام لو کہ دوصد خر، دو سو گدھے جمع ہوجائیں تو وہ ایک آدمی کا کام کرلیں گے، تمہارے ملک کا نظام چلانے کے لئے ایک آدمی کافی ہے، لیکن دو سو گدھے جمع کرتے ہو، ان سے نہیں چلتا، دیانت اور امانت بھی تو آخر کوئی چیز ہے۔

ہر عہدے کے لئے ڈگری شرط ہے، مگر امانت و دیانت نہیں:

میں نے ایک موقع پر ان صاحبوں کو لکھا تھا کہ تمہارے یہاں ہر عہدے کے لئے ایک خاص تعلیم شرط ہے، اتنا تعلیم یافتہ ہو، ایسی اس کے پاس ڈگری ہو تو اس کو اس عہدے پر لیا جائے گا۔ لیکن دو باتیں تم بھول گئے ہو، ایک یہ کہ تعلیم کو دیکھتے

ہو، دیانت و امانت کو تم نے کبھی نہیں دیکھا، کافر ہے؟ مسلمان ہے؟ نیک ہے بد ہے؟ اچھا ہے یا برا ہے؟ مؤمن ہے یا ملحد ہے؟ تم کو اس سے کوئی غرض نہیں۔ ڈگری اس کے پاس ہونی چاہیئے، اور ستم بالائے ستم یہ کہ تعلیم کے اداروں میں بھی جو دراصل بچوں کا ذہن بنانے والا ادارہ کہلاتا ہے وہاں بھی تم نے صرف ڈگری کو ہی دیکھا، یہ کبھی نہیں دیکھا کہ ایک اسلامی مملکت کے نونہالوں کا ذہن بنانے والے تعلیمی ادارہ میں کیسا آدمی ہونا چاہیئے؟

سوائے حاکم کے ہر چیز کے لئے معیار ہے:

دوسری بات جس کو تم بھول گئے ہو، وہ یہ ہے کہ اور تمام چیزوں کے لئے کوئی معیار نہیں، جو بھی کھڑا ہوجائے اور تمہارے ووٹ خرید لے، دھونس اور فراڈ سے یا طمع سے، جس ذریعہ سے بھی ووٹ خرید لے وہ تمہارا حاکم بن سکتا ہے، آخر کیا اندھیر ہے؟ یہ دنیا میں جو آپ تماشا دیکھ رہے ہیں یہ میرے آقا کے ارشاد کی تفسیر ہے۔ یہ چیز نااہلوں کے سپرد ہوگئی ہے، یہ شاہی باز، بڑھیا کے ہاتھ میں آگیا ہے، یہ بیچارے اس کی چونچ بھی کاٹیں گے، اس کے پنجے بھی کاٹیں گے۔

حرص اور لالچ کا فساد اور تباہ کاریاں:

چوتھی بات ارشاد فرمائی: حرص اور لالچ سے بچو!

علماً فرماتے ہیں کہ "شُحّ" قرآن مجید میں بھی استعمال ہوا ہے، طبیعت کے بخل کو اور اس کی حرص کو "شُحّ" کے لفظ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ یہ ایک بیماری ہے، اس سے بچو! اس کی وجہ یہ ہے کہ پہلی قومیں اسی وجہ سے ہلاک ہوئی ہیں۔ کیسے ہلاک ہوئیں؟ اسی حرص اور بخل نے ان کو کہا کہ قطع رحمی کرو، انہوں نے قطع رحمی کرلی، بھائی بھائی کی لڑائی ہے، کیوں؟ حرص بنیاد ہے اور کچھ بھی نہیں۔ باپ بیٹے سے جدا ہے، بیٹا نافرمان بن رہا ہے، باپ اس کو عاق کر رہا ہے، کیوں؟ یہ ساری حرص کی کارفرمائی ہے، قطع رحمی کا حکم دیا اس نے تو انہوں نے قطع

رحمی کرلی، اور بخل کا حکم دیا، بخل کرلیا، اور بدکاری، گناہ گاری کا حکم دیا اس میں لگ گئے تو حرص اور لالچ اگر یہ بے قید اور بے لگام ہوجائیں تو پھر اس سے فساد پھیلتا ہے۔

قرآن کریم میں ارشاد فرمایا:

”وَمَنْ یُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَاُولٰٓئِکَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ۔“ (الحشر:۹)

ترجمہ:......”جس کو اس کے نفس کی حرص اور طمع سے بچادیا گیا وہ کامیاب ہوگیا۔“

اسلام کا سب سے افضل عمل؟

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم یہ خطبہ ارشاد فرما رہے تھے تو ایک آدمی کھڑا ہوگیا کہنے لگا: یا رسول اللہ! اسلام کا کون سا عمل سب سے افضل ہے؟ فرمایا: اسلام کا سب سے اونچا عمل یہ ہے کہ اہل ایمان کو تیری زبان سے اور تیرے ہاتھ سے حفاظت ہو، جس شخص کی زبان سے اور ہاتھوں سے کسی مؤمن کو امان نہ ہو، وہ کیا مسلمان ہے؟

بہترین ہجرت:

ایک اور صاحب کھڑے ہوئے، کہنے لگے: ہجرت سب سے اچھی کون سی ہے؟ ”ہجرت“ کے معنی چھوڑ دینے کے ہیں، عام طور سے ”ہجرت“ کا لفظ بولا جاتا ہے وطن چھوڑ دینے کو، فرمایا کہ: سب سے اچھی ہجرت یہ ہے کہ جن چیزوں کو تیرا رب ناپسند کرتا ہے، تم ان کو چھوڑ دو۔ اور پھر فرمایا کہ: ہجرت دو طرح کی ہوتی ہے، ایک شہری لوگ ہیں اور بعض دیہات میں رہتے ہیں، دیہاتیوں کی ہجرت تو یہی ہے کہ ان کو جو حکم دیا جائے اس کی اطاعت کریں، ان کو کسی کام سے بلایا جائے تو وہ لبیک کہیں، لیکن شہریوں کی ہجرت ذرا مشکل ہے، پھر فرمایا کہ مشکل بھی ہے اور ساتھ کے ساتھ اجر میں بھی بڑھی ہوئی ہے۔

وآخر دعوانا ان الحمدللہ رب العالمین

کمزور اور مظلوم کی مدد کرنا

کوئی نیکی کرنا چاہتا ہے، کوئی تقویٰ اختیار کرنا چاہتا ہے، تو اس کا ہاتھ بٹاؤ، اس کی حوصلہ افزائی کرو، جتنی اعانت تم اس کی کرسکتے ہو، کرو، تاکہ معاشرے میں نیکی اور تقویٰ کی فضا قائم ہوسکے۔ اگر خدانخواستہ گناہ کا کام کرنا چاہتا ہے، یا ظلم و زیادتی کا کام کرنا چاہتا ہے، اس کی مدد نہ کرو، بلکہ جہاں تک ہوسکے اس کا ہاتھ پکڑ کر روکنے کی کوشش کرو، تاکہ معاشرے میں برائی، گناہ اور ظلم و زیادتی کی فضا قائم نہ ہو۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم
الحمد للہ وسلام علی عبادہ الذین اصطفیٰ!

”وَاَعِیْنُوا الضَّعِیْفَ وَالْمَظْلُوْمَ وَالْغَارِمِیْنَ وَفِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَابْنِ السَّبِیْلِ وَالسَّائِلِیْنَ وَفِی الرِّقَابِ، وَارْحَمُوا الْاَرْمِلَةَ وَالْیَتِیْمَ، وَاَفْشُو السَّلَامَ، وَرُدُّوْا التَّحِیَّةَ عَلٰی اَهْلِهَا بِمِثْلِهَا اَوْ بِاَحْسَنَ مِنْهَا، وَتَعَاوَنُوْا عَلَی الْبِرِّ وَالتَّقْوٰی، وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَی الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ، وَاتَّقُوا اللّٰهَ اِنَّ اللّٰهَ شَدِیْدُ الْعِقَابِ، وَاَکْرِمُوا الضَّیْفَ، وَاَحْسِنُوْا اِلَی الْجَارِ، وَعُوْدُوا الْمَرْضٰی، وَشَیِّعُوا الْجَنَائِزَ، وَکُوْنُوْا عِبَادَ اللّٰهِ اِخْوَانًا ..... الخ۔“ (البدایہ والنہایہ ج:۷ ص:۳۰۸)

ترجمہ:......”مدد کرو کمزور کی، مظلوم کی اور ان لوگوں کی جو تاوان میں آئے ہوئے ہوں اور اللہ کے راستے میں اور مسافر کی اور مانگنے والوں کی اور گردنوں کے چھڑانے والوں کی اور رحم کرو بیوہ اور یتیم بچوں پر اور سلام کو پھیلاؤ، سلام کا جواب

دیا کرو سلام کہنے والے کو اس کی مثل یا اس سے بہتر اور ایک دوسرے کی مدد کرو نیکی اور تقویٰ کے کام پر اور ایک دوسرے کی مدد نہ کرو گناہ اور زیادتی کے کام پر اور اللہ سے ڈرتے رہو، بے شک اللہ تعالیٰ سخت سزا دینے والے ہیں اور عزت کرو مہمان کی اور حسن سلوک کرو پڑوسی کے ساتھ اور عیادت کرو بیماروں کی اور رخصت کرو جنازوں کو اور اللہ کے بندو! بھائی بھائی بن کر رہو۔“

کمزور کی مدد کرنا:

یہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے خطبہ کے چند فقرے ہیں۔ فرمایا کہ: کمزور کی اور مظلوم کی مدد کرو، طاقت ور آدمی کی مدد کے لئے تو ہر آدمی تیار ہوتا ہے اس کی طاقت کی وجہ سے، لیکن کمزور آدمی کی مدد کرنا اس کے ذمے ہے، جس کے دل میں اللہ کا خوف ہو۔ فرمایا: محض انسانی ہمدردی کی بنا پر کمزور کی مدد کی جاتی ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دعا میں فرمایا کرتے تھے کہ: ”اے کمزوروں کے رب!“ اللہ تعالیٰ صرف طاقتوروں کا رب نہیں، بلکہ کمزوروں کا رب ہے، کمزوروں کی مدد کرو۔

مظلوم کی مدد کرو:

اسی طرح مظلوم کی مدد کرو، جس پر ظلم ہوا ہو، ظالم کا ساتھ نہ دو، بلکہ مظلوم کا ساتھ دو، خود بھی مظلوم پر ظلم کرنے سے بچو، کسی پر ظلم کرنے سے بچو اور اگر کسی کو کسی پر ظلم کرتے ہوئے دیکھو تو اپنے امکان کی حد تک اس کی مدد کرو۔

ایک حدیث شریف میں فرمایا:

”اِیَّاکَ وَدَعْوَۃَ الْمَظْلُوْمِ! فَاِنَّمَا یَسْأَلُ اللہَ تَعَالٰی حَقَّہٗ وَاِنَّ اللہَ لَا یَمْنَعُ ذَا حَقٍّ حَقَّہٗ۔“ (مشکوٰۃ ص:۴۳۶)

ترجمہ:...... ”مظلوم کی بددعا سے بچو! اس لئے کہ

مظلوم اپنا حق مانگتا ہے اور اللہ کسی حق والے کا حق نہیں روکتے۔''

مظلوم کی دعا سیدھی عرش پر جاتی ہے اور جب مظلوم بددعا کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ میں تیری ضرور مدد کروں گا، چاہے کچھ عرصہ کے بعد ہو۔ یہ اس کی حکمت ہے، بہرحال مظلوم کی بددعا رائیگاں نہیں جاتی، خاص طور پر مظلوم آدمی جو اپنا انتقام خود نہ لے سکتا ہو، اور ظالم طاقتور ہو، کمزور بیچارہ نہ عدالت کا دروازہ کھٹکھٹا سکتا ہے اور نہ لوگوں کو اپنی مدد کے لئے پکار سکتا ہے، نہ اس کی برادری ہے اور نہ اس کا قبیلہ ہے، ایسے بے کس اور بے بس مظلوم کی مدد کرو۔

ظلم کے سد باب کا طریقہ:

اگر لوگ ایک نکتہ کو سمجھ جائیں تو ظلم وستم کا دروازہ بند ہوجائے، وہ نکتہ یہ ہے کہ اگر میں اس مظلوم کی جگہ ہوتا اور وہ میری جگہ ہوتا تو میں اپنے لئے کیا معاملہ پسند کرتا؟ صرف اتنی سی بات سوچ لی جائے کہ ہم مظلوم پر ظلم کرتے ہیں، کمزور آدمی پر ظلم کرتے ہیں؟ یہ سوچو کہ اگر اس کے پاس طاقت ہوتی اور تم بے طاقت ہوتے اور یہ تم پر ظلم کرنا چاہتا تو تمہارا ردعمل کیا ہوتا؟ تمہارے دل کی کیفیت کیا ہوتی؟ ایک حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے:

''اَلْمُسْلِمُ اَخُو الْمُسْلِمِ، لَا یَظْلِمُهٗ وَلَا یُسْلِمُهٗ۔''

(مشکوٰۃ ص:۴۲۲)

ترجمہ:......''ایک مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے کہ ایک مسلمان اپنے بھائی پر ظلم نہیں کرتا اور جہاں اس کو مدد کی ضرورت ہوتی ہے وہاں اس کو بے مدد نہیں چھوڑتا۔''

اگر ہمارے سامنے کسی آدمی پر ظلم ہوتا ہے اور ہم اس کی مدد نہیں کرتے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ہمارا اسلام کا رشتہ کمزور ہے۔

زیر بار لوگوں کی مدد کرو:

جو لوگ تاوان کے نیچے آئے ہوئے ہیں، ان کی اعانت کرو، کسی آدمی پر کوئی ناگہانی تاوان پڑ گیا ہو، اس کی وجہ سے وہ بے چارہ پریشان ہے تو اس کی مدد کرو۔

میرے سامنے ایسے بہت سارے معاملات آئے، ایک آدمی بڑا کھاتا پیتا تھا، لوگوں کو آگے بڑھنے کا شوق ہے، آگے بڑھا، مگر تجارت میں خسارہ ہوگیا اور لاکھوں کا زیر بار ہوگیا، اب یہ اپنے قرض خواہوں سے منہ چھپائے پھرتا ہے، ایسے آدمی کی مدد کرو، جو کسی ناگہانی آفت کی وجہ سے زیر بار آگیا ہو، یا اس نے کسی کا تاوان اپنے ذمے لے لیا ہو، اس کی مدد کرو۔

فی سبیل اللہ کا مفہوم:

اللہ تعالیٰ کے راستے میں مدد کرو، ''فی سبیل اللہ'' قرآن کریم کا لفظ ہے، اور اس کی تفسیر میں علمائ کے متعدد اقوال ہیں۔

بعض نے کہا کہ جو لوگ جہاد کے لئے جارہے ہوں اور ان کے پاس سامان جہاد کا نہ ہو، ان کی مدد کرنا یہ فی سبیل اللہ ہے۔

بعض نے کہا کہ حاجی حج کے لئے گیا تھا، کسی وجہ سے اس کا توشہ ختم ہوگیا، اس کی مدد کرنا فی سبیل اللہ ہے۔ اسی طرح دینی مدارس کے طالب علم ان کی اعانت کرنا بھی فی سبیل اللہ ہے۔

اور بعض حضرات نے اس میں تعمیم کردی ہے کہ ہر وہ کارِ خیر جو محض اللہ تعالیٰ کی خاطر کیا جاتا ہے، اس میں اعانت کرنا فی سبیل اللہ ہے، جیسے مدارس کی تعمیر، مساجد کی تعمیر۔

زکوٰۃ کا مصرف؟

لیکن یہ بات یاد رہنی چاہئے کہ زکوٰۃ صرف فقیر کو دی جاسکتی ہے، پلوں کی

تعمیر میں یا ایدھی سینٹر میں زکوٰۃ نہیں لگے گی، بعض لوگ زکوٰۃ کے پیسے سے ہسپتال بنادیتے ہیں اور اس کو کارِخیر سمجھتے ہیں، تعمیر میں زکوٰۃ نہیں لگے گی، البتہ اگر زکوٰۃ کے پیسے کی دوائیں خرید کر رکھ دی جائیں اور یہ ہدایت کردی جائے کہ صرف مستحق اور ایسے لوگ جو زکوٰۃ کے مستحق ہیں، نادار ہیں، غریب ہیں، ان کو دی جائے، تو زکوٰۃ ادا ہوجائے گی، لیکن اس کا اطمینان ہونا چاہئے کہ وہ دوائی کسی دوسری جگہ استعمال نہیں ہوگی۔ ہمارے ہاں اس معاملے میں بے احتیاطی کی جاتی ہے، زکوٰۃ کا پیسہ کہاں خرچ کیا جائے؟ اس کے بارے میں احتیاط نہیں کرتے۔

حکومت کی زکوٰۃ کے مصارف میں بے احتیاطی:

میرے پاس بہت سارے خطوط آتے ہیں، تو ان میں لکھا ہوتا ہے کہ حکومت زکوٰۃ وصول کرتی ہے، تو ایک حصہ طالب علموں پر خرچ کیا جاتا ہے، طالب علموں سے مراد کالج، یونیورسٹی والے طالب علم، اور ایک حصہ باہر بھجوانے کے لئے، اس میں امیر و غریب کی تو پتہ نہیں رعایت رکھتے ہوں گے یا نہیں رکھتے ہوں گے؟ لیکن یہ شکایت ملی ہے کہ بعض مرزائی طالب علموں کو بھی اس مد سے دیا جاتا ہے۔ ہماری حکومت کے ہاں تو کوئی احتیاط ہی نہیں، اور یہ عجیب بات ہے کہ ایک فرقے کے لوگ زکوٰۃ سے مستثنیٰ کئے گئے ہیں، جو مسلمان کہلاتے ہیں، لیکن اہل سنت کی جو زکوٰۃ جمع کی جاتی ہے وہ بغیر احتیاط کے ہندو، مسلم سب پر خرچ کی جاتی ہے، مرزائی پر خرچ کی جاتی ہے۔ یہ تو جو خرچ کی جاتی ہوگی اس کا حال ہے ورنہ تو اخبارات میں یہ بھی آتا ہے کہ انتخابی اخراجات پر خرچ کی جاتی ہے، استغفر اللہ! بہرحال میں نے عرض کیا کہ ''فی سبیل اللہ'' کا لفظ تو عام ہے، ہر کارِخیر کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ لیکن یہ یاد رہنا چاہئے کہ زکوٰۃ کی رقم کسی غریب کو دینا ضروری ہے، اور اس کو اس کا مالک بنانا ضروری ہے، ورنہ زکوٰۃ ادا نہیں ہوگی۔

زکوٰۃ سے مکان بنا کر دینا:

میمن برادری میں یہ رواج ہے کہ اپنی اپنی زکوٰۃ ایک جگہ اکٹھی کرتے ہیں، اور پھر اپنی برادری کے لوگوں پر وہ تقسیم کرتے ہیں۔ اس کی ایک صورت یہ ہے کہ مکان بنا کر ان کو دیتے ہیں، بہت اچھی تجویز ہے، یہ حضرات مجھ سے مسئلہ پوچھنے کے لئے آئے، انہوں نے بتایا کہ ہم مکان کی چابی اس کو دیتے ہیں، مگر مکان کے کاغذات اس کو نہیں دیتے، اس کو بیچنے کی اجازت نہیں ہوتی، وہ مکان بیچ کر دوسری جگہ نہیں لے سکتا، گویا مالکانہ اختیارات نہیں ہوتے، میں نے کہا کہ بھائی! اگر اس کو مالکانہ حقوق نہیں دیتے، تو زکوٰۃ تو ادا نہیں ہوتی۔ کہنے لگے کہ وہ بیچ کھا کر پھر ویسے ہی ہو جائیں گے۔ میں نے کہا کہ پھر اس کا کوئی اور طریقہ اختیار کرو۔ زکوٰۃ کے پیسے کے بارے میں لوگ یوں سمجھتے ہیں کہ پیسہ ہے، بس خرچ کر دیا اچھے کام پر، بس زکوٰۃ ادا ہوگئی۔ نہیں بھائی! یہ بات نہیں، فقر شرط ہے، جس کو زکوٰۃ دی جائے اس کا فقیر ہونا شرط ہے، اگر وہ آدمی فقیر نہ ہو، محتاج نہ ہو، تو زکوٰۃ ادا نہیں ہوتی۔

ٹی وی والے کو زکوٰۃ دینا:

ایک کے گھر میں ٹی وی ہے اور محتاج بھی ہے، حالانکہ ٹی وی ضروریات زندگی میں شامل نہیں اور اس ٹی وی کی قیمت اتنی ہے کہ وہ صاحب نصاب ہوسکتا ہے، تو اس پر زکوٰۃ نہیں لگے گی، اور اس کو زکوٰۃ دینا ٹھیک نہیں ہے۔

مسافروں کی اعانت کرو:

اور مسافروں کی بھی اعانت کرو، ایک شخص سفر کی حالت میں ہے، کسی وجہ سے اس کے پاس توشہ ختم ہوگیا، یا کسی نے اس کی جیب کاٹ لی یا پیسے اس کے گر گئے یا اور کوئی ایسی شکل ہوگئی تو ہر چند کہ وہ اپنے گھر میں غنی ہے، مال دار ہے، اس کو زکوٰۃ اس حالت میں دینا جائز ہے۔ ابن سبیل کی اعانت بھی ضروری ہے۔

شیخ سعدیؒ فرماتے ہیں کہ مسافر کی خدمت اور رعایت وہ شخص کرتا ہے جو خود کبھی سفر پر گیا ہو، اس کو کبھی ایسا حادثہ پیش آیا ہو، دوسرے لوگوں کو احساس نہیں ہوتا۔

پیشہ ور بھکاری کو زکوٰۃ دینا؟

اور مانگنے والوں کو بھی دو، لیکن مانگنے والے دو قسم کے ہوتے ہیں: ایک حاجت مند اور ایک پیشہ ور، پیشہ وروں کو نہ دی جائے، زکوٰۃ بھی نہ دی جائے اور دوسری اعانت بھی نہ کی جائے، اور بعض اکابرؒ نے یہاں تک فرمایا ہے کہ ان کو دینا حرام ہے، کیونکہ یہ اعانت للمعصیت ہے۔

اب کیسے معلوم ہو کہ یہ شخص ضرورت مند ہے یا نہیں؟ اور ضرورت کی بنا پر سوال کر رہا ہے یا بے ضرورت؟ تو بھائی! اس کا معیار تو کوئی بتایا نہیں جاسکتا، یہ تمہارے اندر کا قاضی فتویٰ دے گا، تمہارا دل کہتا ہے کہ یہ شخص ضرورت مند ہے، تو اس کو دے دو، انشاءاللہ قبول ہوجائے گی، اور اگر تمہارا دل یہ شہادت دیتا ہے کہ نہیں! یہ پیشہ ور آدمی ہے تو اس کو مت دو۔

غنی کو فقیر سمجھ کر زکوٰۃ دی تو زکوٰۃ ادا ہوگئی:

فقہ میں مسئلہ لکھا ہے کہ ایک آدمی کو فقیر سمجھتے ہوئے زکوٰۃ دے دی، بعد میں معلوم ہوا کہ یہ غنی تھا، تو زکوٰۃ ادا ہوگئی۔

حدیث شریف میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک واقعہ ذکر فرمایا ہے:

”قَالَ رَجُلٌ: لَاَتَصَدَّقَنَّ بِصَدَقَةٍ، فَخرَجَ بِصَدَقَتِهٖ فَوَضَعَهَا فِيْ يَدِ سَارِقٍ، فَاَصْبَحُوْا يَتَحَدَّثُوْنَ: تُصُدِّقَ اللَّيْلَةَ عَلٰى سَارِقٍ. فَقَالَ: اَللّٰهُمَّ لَكَ الْحَمْدُ عَلٰى سَارِقٍ، لَاَتَصَدَّقَنَّ بِصَدَقَةٍ، فَخَرَجَ بِصَدَقَتِهٖ فَوَضَعَهَا فِيْ

يَدِ زَانِيَةٍ۔ فَاَصبحُوا يَتحدَّثُونَ: تُصُدِّقَ اللَّيلَةَ علٰى زَانِيَةٍ۔ فَقَالَ: اَللّٰهُمَّ لَکَ الْحَمْدُ عَلٰى زَانِيَةٍ، لَاَتَصدَّقَنَّ بِصَدَقَةٍ، فَخَرَجَ بِصَدَقَتِهٖ فَوَضَعَهَا فِیْ يَدِ غَنِيٍّ۔ فَاَصبحُوا يَتَحَدَّثُوْنَ: تُصُدِّقَ اللَّيلَةَ عَلٰى غَنِيٍّ۔ فَقَالَ: اَللّٰهُمَّ لَکَ الْحَمْدُ عَلٰى سَارِقٍ وَزَانِيَةٍ وَغَنِيٍّ۔ فَاُتِیَ فَقِيلَ لَهٗ: اَمَّا صَدَقَتُکَ عَلٰى سَارِقٍ فَلَعَلَّهٗ اَنْ يَّسْتَعِفَّ عَنْ سَرِقَتِهٖ، وَاَمَّا الزَّانِيَةُ فَلَعَلَّهَا اَنْ تَسْتَعِفَّ عَنْ زِنَاهَا، وَاَمَّا الْغَنِیُّ فَلَعَلَّهٗ يَعْتَبِرُ فَيُنْفِقُ مِمَّا اَعْطَاهُ اللّٰهُ۔" (مشکوٰۃ ص:۱۶۵)

یعنی ایک شخص نے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں عرض کیا کہ: یا اللہ! میں تیری رضا کے لئے صدقہ دینا چاہتا ہوں، اس نے رات کے اندھیرے میں، تاکہ کوئی نہ دیکھے، ایک شخص کو صدقے کے پیسے دے دیئے۔ اگلے دن محلّہ میں شہرت ہوگئی کہ آج کسی غنی کو صدقہ دے دیا گیا۔ اس شخص نے کہا: یا اللہ! میں نے تو آپ کی رضا کے لئے صدقہ دیا تھا، لیکن میرا صدقہ بے محل خرچ ہوگیا ہے، اچھا! آج میں نئے سرے سے صدقہ دوں گا۔ رات کو پھر صدقہ کیا، صبح کو پھر شہرت ہوگئی کہ رات کسی نے چور کو صدقہ دے دیا، یہ اور زیادہ پریشان ہوگیا کہ میرا مال ہی ایسا ہے، بے محل خرچ ہوتا ہے۔ تیسرے دن اس نے پھر صدقہ کیا، ایک خاتون کو دیا یہ سمجھ کر کہ یہ بیچاری غریب خاتون ہے۔ اگلے دن شہرت ہوگئی ہے کہ ایک فاحشہ عورت کو صدقہ دے دیا۔ یہ بہت پریشان ہوا، اس کو ہاتف کے ذریعہ سے یا خواب میں کہا گیا کہ اللہ تعالیٰ نے تیرے تینوں صدقے قبول کرلئے، تو نے تو اپنی جانب سے، اپنی دانست میں مستحق کو دیا تھا، ہوسکتا ہے کہ غنی کو اس سے عبرت ہو کہ دوسرے لوگ اس طرح چھپ کر صدقہ دیتے ہیں، مجھے بھی شرم کرنی چاہئے، وہ بھی صدقہ دینے لگے، اور ہوسکتا ہے کہ چور کو شرم آجائے کہ لوگ تو اپنا مال گھر سے لاکر رات کے اندھیرے میں دے کر جاتے ہیں اور

میں رات کی تاریکی میں لوگوں کا مال لوٹ کر لاتا ہوں، کتنی بری بات ہے! کیسی شرم کی بات ہے! تو وہ عبرت حاصل کرے اور آئندہ چوری سے باز آجائے یا تائب ہوجائے۔ اور فاحشہ عورت جو بدن فروشی کا کام کرتی ہے، اس کو عبرت ہوجائے کہ اللہ تعالیٰ حلال ذریعہ سے بھی دے سکتا ہے، حرام ذریعہ سے کیوں کماؤں؟ تو اللہ تعالیٰ نے اس کی حسن نیت کی بنا پر تینوں صدقے قبول کرلئے۔

تو میں نے عرض کیا کہ یہ تو آپ کے دل کا مفتی ہی فتویٰ دے سکتا ہے کہ یہ آدمی مستحق ہے یا نہیں؟ آپ اس کے مکمل حالات سے واقف نہیں، بہرحال اگر دل گواہی نہ دے کہ یہ مستحق ہے اور بیچارہ ضرورت کی بنا پر سوال کرتا ہے تو دو، ضرور دو، اگر دل گواہی دیتا ہے کہ نہیں یہ تو پیشہ ور ہے تو مت دو۔

گردن آزاد کرانے میں مدد کرو:

اور گردنوں کے آزاد کرانے میں بھی مدد کرو۔ معارف القرآن میں حضرت مفتی شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ ’’وَفِی الرِّقَابِ‘‘ کا لفظ کئی صورتوں کو شامل ہے۔

ایک صورت تو یہ ہے کہ پہلے زمانے میں غلام ہوتے تھے اور وہ اپنے آقاؤں سے معاہدہ کرلیتے تھے کہ تم کو اتنے پیسے دینے ہوں گے اور تم آزاد ہوجاؤ گے، ایسے شخص کو ’’مکاتب‘‘ کہا جاتا ہے، اگر کوئی ایسا غلام ہو اور اس کی مدد کی جائے تاکہ وہ جلد سے جلد آزاد ہو۔

اور اس کی ایک صورت یہ ہے کہ کسی غلام کو خرید کر آزاد کردیا جائے، مگر زکوٰۃ کے پیسے سے نہیں۔

اور اس کی ایک صورت یہ ہے کہ کوئی آدمی مقروض ہو، قرض کی وجہ سے اس کی گردن پھنسی ہوئی ہے، اس کا قرض ادا کرنے میں اس کی مدد کرو تاکہ وہ اس بار سے نکل جائے۔

شادی کے رسم و رواج اور جہیز کی لعنت:

یہاں ایک مسئلہ اور ذکر کرتا ہوں، وہ یہ ہے کہ بہت سی نادار بچیاں ہیں، جہیز کے بغیر ان کی شادی نہیں ہوتی، جہیز اور مہر کا اور نکاح کے دوسرے اخراجات کا مسئلہ ہمارے معاشرے میں بڑا پیچیدہ ہوگیا ہے، اور یہ کوتاہی ہماری ہے، ہم لوگ زمانے کی رَوِش اختیار کرنا چاہتے ہیں، لیکن اللہ کا بندہ کوئی نہیں اٹھتا جو اس زمانے کے رسوم و رواجات کی زنجیر کو توڑ کر سنت کے مطابق عقد کردے، مال کو دیکھتے ہیں اور بہت ساری چیزوں کو دیکھتے ہیں، اب تو لڑکے والے یہ دیکھتے ہیں کہ لڑکی جہیز کتنا لائے گی؟ جہیز وہ اپنے لئے لائے گی کہ تمہارے لئے لائے گی؟ جہیز تمہاری ملکیت نہیں ہے، اس بچی کی ملکیت ہے، اور اس لڑکی کی اجازت کے بغیر تمہارے لئے استعمال کرنا حرام ہے، کسی عالم سے اس کا مسئلہ تو پوچھو! والدین جو اپنی لڑکی کو جہیز دیتے ہیں، وہ اس لڑکی کی ملکیت ہے، تمہاری ملکیت نہیں، اس کو یہ حق حاصل ہے کہ اپنی کسی چیز کو ہاتھ نہ لگانے دے۔ مگر اب تو لوگ یہ بھی دیکھتے ہیں کہ لڑکی کسی ملازمت پر ہوتا کہ ہمیں کما کر کھلائے اور بعض برادریوں میں یہ رواج ہے کہ اپنے داماد کو گاڑی بھی دیں اور بنگلہ بھی دیں دوسری جو چیزیں دی جاتی ہیں وہ تو الگ ہیں۔

ایک نکاح کے موقع پر میرا بیان ہوا تھا، میمنوں کا نکاح تھا، میں نے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

”وَيَضَعُ عَنۡهُمۡ اِصۡرَهُمۡ وَالۡاَغۡلٰلَ الَّتِىۡ كَانَتۡ عَلَيۡهِمۡ ....“ (الاعراف:۱۵۷)

ترجمہ:.......”اور ان لوگوں پر جو بوجھ اور طوق تھے، ان کو دور کرتے ہیں۔“

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جاہلیت کی وجہ سے انسانوں کے گلے میں پڑے ہوئے رسم و رواج کے طوق اور بوجھ سب کے سب اتار دیئے اور انسانوں کو ہلکا پھلکا کردیا تھا، چنانچہ نہایت آسانی کے ساتھ صحابہ کرامؓ کے نکاح ہوتے تھے، کوئی رسم و رواج نہیں اور کوئی ایسی شرطیں نہیں، اور اللہ تعالیٰ کے فضل سے وہ نکاح کامیاب بھی ہوتے تھے، اللہ تعالیٰ کی برکت سے۔ ہمارے یہاں بڑی شرطوں کے ساتھ، بڑے ارمانوں کے ساتھ اور بڑی دھوم دھام کے ساتھ، بڑے اخراجات اور مصارف کے ساتھ نکاح کئے جاتے ہیں۔ اور ان بے جا اخراجات میں ہماری بہنیں پیش پیش ہیں:

دریا کو اپنی موج کی طغیانیوں سے کام
کشتی کسی کی پار ہو یا درمیاں رہے!

ان کو اس کی پرواہ نہیں ہے کہ مرد اتنے مصارف کہاں سے لائیں گے؟ حلال سے لائیں گے یا حرام سے لائیں گے؟

مگر اے کاش کہ جاہلیت کے وہی طوق جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے توڑے تھے، اور جن بوجھوں کے نیچے انسانیت سسک رہی تھی، چیخ رہی تھی، چلّا رہی تھی، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے آکر سارے بوجھ اتار دیئے تھے، ہم نے دوبارہ اپنے اوپر سب کے سب ڈال لئے، ہم اپنی بچیوں کے ہاتھ کیسے پیلے کریں؟ ان کا تو کوئی رشتہ ہی نہیں لیتا، اخلاق، شرافت، ایمان، یقین، دین داری، عفت، عصمت وغیرہ کی تو تمہارے بازار میں کوئی قدر نہیں ہے؟ کوئی قیمت نہیں ہے؟ تمہارے بازار میں کوٹھی، گاڑی، بنگلہ، مال و دولت، ان چیزوں کے سکے چلتے ہیں۔

صاحبِ نصاب دلہن کی زکوٰۃ سے مدد؟

تو خیر میں مسئلہ تو دوسرا بیان کرنے لگا تھا کہ بعض اوقات ایک بچی کا رشتہ تو طے ہوجاتا ہے، لیکن ماں باپ کے لئے جہیز کے بندوبست کرنے کی کوئی صورت نہیں

ہوتی، یا یہ کہ بچی یتیم ہے، لاوارث ہے، تو یہ بات سمجھ لینی چاہئے کہ جہاں تک کپڑے وغیرہ کا تعلق ہے یا اور چیزوں کا تعلق ہے وہ تو خیر مسئلہ ہے، لیکن زیور اور پیسہ اگر اتنا بچی کے پاس ہوجائے کہ اس کی مالیت ساڑھے باون تولے چاندی کے برابر ہوجائے تو پھر اس کو آگے زکوٰۃ دینا جائز نہیں، لہٰذا اگر اس کے پاس کسی کی اعانت کی وجہ سے تھوڑے بہت پیسے بھی ہوگئے اور کچھ تھوڑا بہت زیور بھی ہوگیا تو غنی ہوگئی، اب آپ زکوٰۃ کے پیسے سے اس کی مدد نہیں کرسکتے، لیکن چونکہ اتنے سے کام بھی نہیں چلتا، تو پھر کیا کیا جائے گا؟ اس کی تدبیر میں بتاتا ہوں:

وہ یہ کہ کوئی صاحب ان کو قرضہ دے دیں اور وہ قرضہ کرکے اپنے ضروری مصارف پورے کرلیں اور شادی کا مسئلہ حل ہوجائے، اب وہ مقروض ہوجائیں تو ان کا قرضہ ادا کرنے کے لئے زکوٰۃ دے دیں، یہ مسئلہ اگر کسی کی سمجھ میں نہ آیا ہو تو بعد میں مجھ سے پوچھ لے، کیونکہ عموماً یہ باتیں لوگوں کی سمجھ میں نہیں آتیں، اور کہتے ہیں کہ اس سے کیا فرق پڑا؟ بات تو وہیں کی وہیں رہی، نہیں بھائی! بہت کچھ فرق پڑ گیا ہے۔

حیلہ کا فائدہ:

کل ہی میں ایک دکان پر تھا، وہ کچھ مسائل پوچھ رہے تھے، وہ کہنے لگے کہ لوگ تو کہتے ہیں اس حیلہ سے کیا فرق پڑتا ہے؟ اس سے تو کوئی فرق نہیں پڑا، ایسا کرلیں یا ایسا کرلیں، بات تو ایک ہی ہے۔ میں نے کہا کہ فرق تو پڑتا ہے، لیکن لوگوں کی عقل میں نہیں آتا، میں ایک مثال سے یہ مسئلہ سمجھاتا ہوں کہ: خدانخواستہ ایک لڑکے اور لڑکی کا ناجائز تعلق تھا، تو لوگ میاں جی کے پاس آگئے کہ ان کا نکاح کردو، میاں جی نے لڑکے سے کہا: ”فلاں لڑکی کا اتنے مہر کے بدلے تیرے سے نکاح کیا، تم نے قبول کیا ہے؟“ لڑکے نے کہا کہ: ”میں نے قبول کیا“، اب یہ وہی لڑکا اور وہی

لڑکی ہے، کیا فرق پڑا؟ ہاں! اتنا فرق پڑا کہ پہلے یہ لڑکی اس لڑکے کے لئے حرام تھی، اب حلال ہوگئی، پہلے اجنبی تھی، اب بیوی بن گئی، پہلے شریعت کے خلاف تھی اور ان دونوں کا ناجائز تعلق اللہ تعالیٰ کے غضب کو دعوت دیتا تھا، اب یہ اللہ تعالیٰ کی رحمت کا ذریعہ بن گئے، میاں جی نے صرف اتنا ہی کہا، اس سے زیادہ تو کچھ نہیں کہا، یہ باتیں تمہاری عقل میں نہیں آتیں، کہتے ہیں کہ کیا فرق پڑا؟ بھائی! فرق پڑتا ہے، تأویلات کے ذریعہ سے بھی فرق پڑتا ہے۔ مثلاً: میاں بیوی بہت اچھے گھر میں رہتے تھے، بچے بھی تھے ان کے، میاں کو نہ جانے کیا جوش آیا ایک دم کہہ دیا کہ تجھ کو تین طلاق ہے۔ کیا فرق پڑ گیا؟ وہی عورت ہے، وہی مرد ہے، ان کے بچے ہیں، ان کا گھر ہے، مگر ان الفاظ سے اب وہ میاں بیوی نہیں رہے، فرق تو پڑتا ہے ناں؟ اس لئے مسائل کو اچھی طرح سمجھ لیا جائے، ان کی اونچ نیچ کو اچھی طرح سمجھ لیا جائے، اس کے مطابق اچھی طرح عمل کیا جائے۔

بیوہ اور یتیموں پر رحم کرو:

اس کے بعد فرمایا بیوہ عورتوں پر اور یتیموں پر رحم کیا کرو۔ وہ لائق رحم ہیں جس خاتون کا سہاگ لٹ گیا ہو، وہ لائق رحم ہے، اس پر رحم کرو، اس کو بے سہارا سمجھ کر کوئی زیادتی نہ کرو، اس کی طرف غلط نظر بھی نہ اٹھاؤ۔ اسی طرح جو بچہ بغیر باپ کے رہ گیا، باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا، وہ یتیم ہے، وہ اپنے باپ کی شفقت سے محروم ہوگیا، اب دوسروں کو چاہئے کہ باپ کی شفقت اس کو مہیا کریں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ: ”اَنَا وَ کَافِلُ الْیَتِیْمِ کَھَاتَیْنِ۔“ میں اور یتیم کی کفالت کرنے والا اس طرح جنت میں ہوں گے، دو انگلی کو ساتھ ملاکر اشارہ فرمایا، یعنی میں اور یتیم کی کفالت کرنے والا جنت میں ایسے اکٹھے ہوں گے جیسے یہ دونوں انگلیاں ملی ہوئی ہیں۔ یتیموں اور بیواؤں کی خدمت کرنا کسی نفسانی غرض سے نہیں، بلکہ ثواب سمجھ

کر کی جائے تو بہت اونچا عمل ہے۔ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کو بہت زیادہ محبوب ہے۔

سلام کو پھیلاؤ:

اور سلام کو پھیلایا کرو، یعنی جو بھی ملے، شرط یہ ہے کہ وہ مسلمان ہو، اس کو السلام علیکم کہو، چاہے تمہارا شناسا ہو یا تم سے ناآشنا ہو، حدیث میں آیا ہے:

”وَتُقْرِئُ السَّلَامَ عَلٰى مَنْ عَرَفْتَ وَمَنْ لَّمْ تَعْرِفْ۔“ (مشکوٰۃ ص:۳۹۷)

ترجمہ:...... ”سلام کہو اس کو بھی جس کو تم پہچانتے ہو، اور اس کو بھی جس کو تم نہیں پہچانتے۔“

نہ جاننے کا معنی یہ ہے کہ اس کے ساتھ کوئی جان پہچان نہیں ہے تب بھی سلام کرو۔

عبداللہ بن سلامؓ کا قصہ:

یاد ہوگا میں نے حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ کا قصہ بیان کیا تھا، یہ یہودی عالم تھے، فرمایا کرتے تھے کہ جس دن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ طیبہ تشریف لائے ہیں، میں اپنے باغ میں کھجوریں کاٹ رہا تھا۔ (آپ کو معلوم ہے کہ کھجوریں کاٹنے کا موسم کتنا سخت ہوتا ہے؟ اس سخت موسم میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجرت فرمائی ہے)۔ کسی نے مجھ سے آکر کہا کہ امیوں کا نبی (یہ اہل کتاب جو تھے وہ دوسروں کو امی کہتے تھے) آیا ہے۔ میں اسی شان سے جیسا کہ کسان اور زمیندار ہوتے ہیں، سر پر پگڑی باندھی ہوئی ہے، تیز دھوپ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کے لئے آپ ﷺ کی خدمت میں پہنچ گیا اور امتحان کے لئے میں کچھ کھجوروں کا تحفہ ساتھ لے گیا، حاضر خدمت ہوا، میں نے کہا کہ: یہ صدقے کی

کھجوریں لایا ہوں، اس کو قبول فرمالیں۔ ارشاد فرمایا کہ: ہم صدقے کی چیز نہیں کھایا کرتے، ساتھیوں سے کہا کہ تم کھجور اٹھاؤ۔

”قَالَ: فَكَانَ اَوَّلُ شَيْءٍ سَمِعْتُهٗ يَتَكَلَّمُ بِهٖ اَنْ قَالَ: يَا اَيُّهَا النَّاسُ! اَفْشُوا السَّلَامَ وَاَطْعِمُوا الطَّعَامَ وَصِلُوا الْاَرْحَامَ وَصَلُّوْا وَالنَّاسُ نِيَامٌ وَادْخُلُوا الْجَنَّةَ بِسَلَامٍ۔“ (طبقات ابن سعد ج:۱ ص:۲۳۵)

ترجمہ:......”فرماتے ہیں کہ: میں نے سب سے پہلی بات جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سنی وہ یہ تھی، آپ فرما رہے تھے: لوگوں کو کھانا کھلایا کرو اور سلام پھیلایا کرو، اور رات کو نماز پڑھا کرو جب لوگ سو رہے ہوتے ہیں، تو جنت میں سلامتی سے داخل ہوجاؤ گے۔ یہ پہلا ارشاد تھا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا اور جب میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا چہرۂ انور دیکھا تو میں نے پہچان لیا کہ یہ جھوٹے کا چہرہ نہیں ہے۔“

بہرحال سلام پھیلانا بہت اونچی چیز ہے اور سلام ”اسلام“ کی علامت ہے۔

سلام کا مطلب:

علمائ فرماتے ہیں کہ السلام علیکم کے معنی یہ ہیں کہ: میری طرف سے تم پر سلامتی ہو، یعنی میری شخصیت سے، میری ذات سے تمہیں جان کا، مال کا، عزت کا، آبرو کا کوئی خطرہ محسوس نہیں ہونا چاہئے، میں مسلمان ہوں اور مسلمان کی جانب سے کوئی خطرہ ہوتا بھی نہیں، منہ میں رام رام اور بغل میں چھری یہ تو ہندوؤں کا شیوہ ہے، مسلمان کا ظاہر و باطن یکساں ہوتا ہے، وہ زبان سے کہتا ہے: السلام علیکم! تو دل بھی

سلامتی والا ہوتا ہے، اس لئے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کہا تھا:

”یَوۡمَ لَا یَنۡفَعُ مَالٌ وَّلَا بَنُوۡنَ۔ اِلَّا مَنۡ اَتَی اللّٰہَ بِقَلۡبٍ سَلِیۡمٍ۔“ (الشعرآ:۸۸،۸۹)

ترجمہ:......”جس دن کہ نہیں دے گا کام مال اور بیٹے، مگر وہ جو لے کر آیا دل سلامتی والا۔“

یعنی جو قیامت کے دن سلامتی والا دل لے کر جائے، وہ اس کو کام دے گیا، ایسا دل کہ جس میں کھوٹ نہ ہو، اللہ تعالیٰ کے ساتھ بھی کھوٹ نہیں ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بھی دھوکا نہیں ہے، اور اللہ تعالیٰ کی مخلوق کے ساتھ بھی دھوکا نہیں، یہ قلب سلیم ہے، جو یہ لے کر جائے گا، وہ جنت میں داخل ہوجائے گا۔

سلام کا جواب:

کوئی تم کو سلام کہے تو تم اس کو جواب دو۔ یہ قرآن کریم کی آیت کا مضمون ہے، اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

”وَاِذَا حُیِّیۡتُمۡ بِتَحِیَّۃٍ فَحَیُّوۡا بِاَحۡسَنَ مِنۡهَاۤ اَوۡ رُدُّوۡهَا۔“ (النسآ:۸۶)

ترجمہ:......”جب تم کو سلام کہا جائے تو سلام کا اسی طرح جواب دے دو یا اس سے بہتر۔“

اس نے کہا: السلام علیکم! تم جواب میں کہو: وعلیکم السلام! اس نے کہا: السلام علیکم ورحمۃ اللہ! تم جواب میں کہو: وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ!

سلام اور جواب پر نیکیوں کی مقدار:

ایک حدیث میں ہے:

”اِنَّ رَجُلًا جَاءَ اِلَی النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیۡہِ وَسَلَّمَ

فَقالَ: اَلسَّـلامُ عَلَيْكُمْ! فَرَدَّ عَلَيْهِ ثُمَّ جَلَسَ، فَقالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: عَشْرٌ. ثُمَّ جاءَ اٰخَرُ فَقالَ: اَلسَّـلامُ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَةُ اللّٰهِ! فَرَدَّ عَلَيْهِ فَجَلَسَ، فَقالَ: عِشْرُوْنَ. ثُمَّ جاءَ اٰخَرُ فَقالَ: اَلسَّـلامُ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَةُ اللّٰهِ وَبَرَكَاتُهٗ! فَرَدَّ عَلَيْهِ فَجَلَسَ، فَقالَ: ثَلٰثُوْنَ۔" (مشکوٰۃ ص:۳۹۸)

ترجمہ:...... "ایک آدمی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آیا اس نے: السلام علیکم! کہا اور بیٹھ گیا، آپ نے اس کا جواب دیا اور فرمایا: دس نیکیاں۔ دوسرا آیا اس نے السلام علیکم ورحمۃ اللہ کہا اور بیٹھ گیا، آپ نے اس کا جواب دیا اور فرمایا: بیس نیکیاں۔ تیسرا آیا اس نے: السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ! کہا، آپ نے اس کا اسی طرح جواب دیا اور فرمایا: تیس نیکیاں۔"

گویا صرف السلام علیکم کہنے پر دس، السلام علیکم ورحمۃ اللہ کہنے پر بیس نیکیاں اور السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ پر تیس نیکیاں ملتی ہیں، اسی طرح حسب سلام اس کے جواب پر دس، بیس اور تیس نیکیاں ملتی ہیں۔

واجب سے بڑھ کر مستحب کا ثواب؟

ہماری فقہ میں ایک سوال پیش کیا جاتا ہے: بتاؤ وہ کون سا مستحب ہے، جس کا ثواب واجب سے بڑھا ہوا ہے؟ السلام علیکم کہنا مستحب اور اس کا جواب دینا واجب، لیکن جو شخص پہلے سلام کہے، اس کو بیس نیکیاں مل گئیں اور جو جواب دے اس کو دس نیکیاں مل گئیں۔

نیکی میں مدد کرو:

آگے قرآن کریم کی آیت نقل فرمائی:

”وَتَعَاوَنُوْا عَلَی الْبِرِّ وَالتَّقْوٰی وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَی الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ۔“ (المائدہ:۲)

ترجمہ:......”اور نیکی اور تقویٰ کے کام پر ایک دوسرے کی مدد کیا کرو، گناہ اور ظلم و زیادتی کے کام پر ایک دوسرے کی مدد نہ کیا کرو۔“

کوئی نیکی کرنا چاہتا ہے، کوئی تقویٰ کرنا چاہتا ہے، تو اس کا ہاتھ بٹاؤ، اس کی حوصلہ افزائی کرو، جتنی اعانت تم اس کی کر سکتے ہو، کرو، تاکہ معاشرے میں نیکی اور تقویٰ کی فضا قائم ہو سکے۔

گناہ میں کسی کی مدد نہ کرو:

اگر خدانخواستہ گناہ کا کام کرنا چاہتا ہے، یا ظلم و زیادتی کا کام کرنا چاہتا ہے، اس کی مدد نہ کرو، بلکہ جہاں تک ہو سکے اس کا ہاتھ پکڑ کر روکنے کی کوشش کرو، تاکہ معاشرے میں برائی، گناہ اور ظلم و زیادتی کی فضا قائم نہ ہو، چنانچہ ایک حدیث شریف میں ہے:

”عَنْ عَامِرٍ قَالَ سَمِعْتُ النُّعْمَانَ بْنَ بَشِيْرٍ وَهُوَ عَلَی الْمِنْبَرِ يَقُوْلُ اَعْطَانِیْ اَبِیْ عَطِيَّةً، فَقَالَتْ عَمْرَةُ بِنْتُ رَوَاحَةَ لَا اَرْضٰی حَتّٰی تُشْهِدَ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَاَتٰی رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ اِنِّیْ اَعْطَيْتُ ابْنِیْ مِنْ عَمْرَةَ بِنْتِ رَوَاحَةَ عَطِيَّةً فَاَمَرَتْنِیْ اَنْ اُشْهِدَكَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ! قَالَ اَعْطَيْتَ سَائِرَ وَلَدِكَ مِثْلَ

هٰذَا؟ قَالَ: لَا! قَالَ: فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعۡدِلُوۡا بَيۡنَ اَوۡلَادِكُمۡ! قَالَ فَرَجَعَ فَرَدَّ عَطِيَّتَهٗ۔“ (بخاری ج:۱ ص:۳۵۲)

ترجمہ:......”حضرت عامر شعبی رحمہ اللہ سے روایت ہے کہ میں نے حضرت نعمان بن بشیر سے سنا وہ منبر پر تھے، فرما رہے ہے کہ میرے باپ نے مجھے عطیہ کیا، میری ماں کہنے لگی: میں اس وقت راضی نہیں ہوں گی جب تک تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو گواہ نہ بنالے، ان کے والد حضرت نعمان بھی صحابی ہیں، وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کہنے لگے: میری بیوی ام بشیر، (بشیر کی والدہ) کہتی ہے کہ میں بشیر کے نام ایک باغ لگوادوں، میں نے کہا کہ: ٹھیک ہے! کہنے لگی کہ میں راضی نہیں ہوتی ہوں، جب تک اس کی رجسٹری نہیں کرواتے، یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شہادت اس پر نہ ہوجائے، تو یا رسول اللہ! میں آپ کی خدمت میں اس لئے آیا ہوں تا کہ آپ گواہ بن جائیں میں اپنے بیٹے بشیر کو یہ عطیہ دے رہا ہوں۔ فرمایا: آخر تیری اور اولاد بھی ہے؟ کہا: جی ہاں! اولاد تو اور بھی ہے، فرمایا: تو نے ساری اولادوں کو اتنا اتنا دیا ہے؟ کہا کہ: نہیں! فرمایا: (یہ ظلم ہے اور ظلم پر میں گواہی نہیں دوں گا) اللہ سے ڈرو اور اولاد میں برابری کرو، کہا کہ وہ لوٹ آئے اور عطیہ واپس کرلیا۔“

ایک دوسری روایت میں آتا ہے آپ ﷺ نے فرمایا: کسی اور سے گواہی دلوالو! میں گواہی نہیں دیتا۔ (حاشیہ بخاری ج:۱ ص:۳۵۲)

ایک حدیث میں آتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم چاہتے ہو کہ

تمہارے سارے بیٹے اور تمہاری ساری اولاد تمہارے ساتھ حسن سلوک میں برابر کے شریک ہوں؟ کہا کہ: جی ہاں! یہ ہی چاہتا ہوں۔ فرمایا: تو پھر تقسیم میں بھی برابری رکھو!

زندگی میں اولاد کو برابر دو:

یہاں ایک مسئلہ اور ذکر کردوں کہ اگر اپنی زندگی میں دینا ہو تو اولاد کو یعنی لڑکوں اور لڑکیوں کو برابر، برابر دیا جاتا ہے، اور اگر مرنے کے بعد وراثت تقسیم ہو تو لڑکے کا دوہرا، لڑکی کا ایک حصہ ہوتا ہے۔

مخصوص حالات میں کسی کو زیادہ دینا:

یہ مسئلہ بھی معلوم ہونا چاہئے کہ کسی خاص وجہ کی بنا پر اگر اولاد کو ترجیح دے تو اس کی اجازت ہے، مثلاً ایک بچی بیوہ ہے، باپ کے گھر بیٹھی ہے، اس کو کچھ زیادہ دے دیا تاکہ اس کا ذریعہ معاش رہے، یا کوئی بیچارہ معذور ہے یا بچہ دین کی خدمت میں لگا ہوا ہے، دوسرے اپنے کھانے کمانے میں لگے ہوئے ہیں، یہ بیچارہ دین کی خدمت میں لگا ہوا ہے، اس کو زیادہ دے دیا، یا ایک اپنے والدین کی خدمت میں لگا ہوا ہے، دوسرے الگ الگ رہتے ہیں اور یہ والدین کی خدمت میں شب و روز مصروف رہتا ہے، تو اس قسم کی صورت میں ایک کو اگر ترجیح دی جائے، یعنی زیادہ دے دیا جائے تو درست ہے، لیکن بغیر کسی وجہ کے اولاد میں تفریق کرنے کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جور (ظلم) فرمایا ہے، اور یہ مسئلہ خوب یاد رکھنا چاہئے، ائمہ فرماتے ہیں کہ اگر کسی باپ نے بلاوجہ ایسا کردیا تو اس نے ٹھیک ہی نہیں کیا، بلکہ اس بچے کی اس عطیہ پر ملکیت ہی ثابت نہیں ہوگی، لیکن ہمارے امام صاحبؒ کے نزدیک اس کی ملکیت تو ثابت ہوجائے گی، لیکن اس کا خمیازہ باپ کو قبر میں بھگتنا ہوگا، اور اگر یہ صاحبزادہ اپنے باپ کو چھڑانا چاہتا ہے، تو پھر خود انصاف کردے، باقی بہن بھائیوں کو بھی دے۔

یہ مسلمانوں کا طریقہ نہیں:

ہمارے یہاں تو یہ ہوتا ہے کہ مردے کا مال جس کے قبضے میں آجائے، اس کا ہے، نہیں بھائی! یہ طریقہ درست نہیں، یہ مسلمانوں کا طریقہ نہیں ہے، مسلمان کو تو یہ دیکھنا چاہئے کہ میرا حصہ اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے کتنا آتا ہے؟ جتنا آپ کے حصے میں آتا ہے، وہ آپ کے لئے حلال ہے، اور جو اس سے زیادہ ہے، وہ حرام ہے، اب حرام کھا کر حج کرنے جاؤ، اس سے کچھ نہیں بنے گا، حرام کھا کر صدقہ اور خیرات کرو، وہ بھی قبول نہیں ہوگا، حق حلال کا کھاؤ جو تمہارا بنتا ہے، ہاں! اگر دوسرے وارث خوشی سے تمہیں دے دیں، چھوڑ دیں، تو ٹھیک ہے، پھر کوئی حرج نہیں ہے۔ اللہ سے ڈرو! اللہ تعالیٰ سخت سزا دینے والا ہے، نیکی اور تقویٰ کے کام پر اعانت کرو، ایک دوسرے کے گناہ اور ظلم و زیادتی کے کام پر ایک دوسرے کی اعانت نہ کرو، بلکہ ہاتھ پکڑنے کی کوشش کرو، اللہ تعالیٰ سے ڈرو! اللہ تعالیٰ سخت سزا دینے والا ہے۔ نیکی کرو گے، تمہیں اس کا اجر دے گا، اور نیکی کی مدد کرو گے تو اس پر بھی اجر دے گا، گناہ یا عدوان میں مبتلا ہوگے تو سزا دے گا، اور اگر گناہ کے یا عدوان کے کام میں کسی کی اعانت کرو گے تو تم بھی پکڑے جاؤ گے، قیامت کا دن تو بہت دور ہے، یہیں پکڑے جاؤ گے، ذرا قبر کے منظر کو دیکھ لیا کرو، سوچ لیا کرو۔

مہمان کا اکرام کرو:

مہمان کا اکرام کیا کرو، عزت کا برتاؤ کیا کرو، شرفاً کہتے ہیں کہ اگر دشمن بھی اپنے گھر مہمان ہوجائے تو جب تک وہ تمہارے گھر میں ہے، اس کے ساتھ دشمنی کا مظاہرہ نہ کرو، تمہارے گھر سے چلا جائے پھر چاہو جو کچھ کرو۔

بعض لوگ اس قسم کے ہیں کہ ان کی تھوڑی سی چپقلش تھی، رنجش تھی، وہ گھر پر آجاتا ہے، تو دھکے دے کر نکال دیتے ہیں، یہ اہانت ہے، شرفاً کے ہاں یہ دستور نہیں

ہے، شرفائ کا دستور یہ ہے کہ کوئی جانی دشمن بھی تمہارے گھر پر آجائے تو اس کا اکرام کرو، مہمان تمہارے گھر آیا ہوا ہے، اس کو کوئی سخت لفظ اپنے گھر پر آنے کے بعد نہ کہو، اسی طرح پڑوسی کے ساتھ بھی حسن سلوک کرو۔

وآخر دعوانا ان الحمد للّٰہ رب العالمین

عذابِ الٰہی سے بچاؤ کی صورت

امیر المؤمنین حضرت علی کرم اللہ وجہہ فرماتے ہیں کہ میں نے جنت جیسی کوئی چیز نہیں دیکھی جس کے طلب کرنے والے سو رہے ہوں اور دوزخ جیسی کوئی چیز نہیں دیکھی، جس سے بھاگنے والے سو رہے ہوں۔ یہ الفاظ تو حدیث نبوی کے ہیں، حضرت امیر المؤمنین نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظ نقل کئے ہیں۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم
الحمدللہ وسلام علی عبادہ الذین اصطفیٰ!

”.....وَاِنِّیْ لَمْ اَرَ مِثْلَ الْجَنَّةِ نَامَ طَالِبُهَا، وَلَا كَالنَّارِ نَامَ هَارِبُهَا، وَلَا اَكْثَرَ مُكْتَسبًا مِّنْ شَیْءٍ كَسَبَهٗ لِيَوْمٍ تُدَّخَرُ فِيْهِ الذَّخَائِرُ، وَتُبْلٰى فِيْهِ السَّرَائِرُ، وَتُجْتَمَعُ فِيْهِ الْكَبَائِرُ، وَاِنَّهٗ مَنْ لَّا يَنْفَعُهُ الْحَقُّ يَضُرُّهُ الْبَاطِلُ، وَمَنْ لَّا يَسْتَقِيْمَ بِهِ الْهُدٰى يَجُرِ بِهِ الضَّلَالُ، وَمَنْ لَّا يَنْفَعُهُ الْيَقِيْنُ يَضُرُّهُ الشَّكُّ، وَمَنْ لَّا يَنْفَعُهٗ حَاضِرُهٗ فَعَازِبَهٗ عَنْهُ اَعْوَرُ، وَغَائِبُهٗ عَنْهُ اَعْجَزُ، وَاِنَّكُمْ قَدْ اُمِرْتُمْ بِالظَّعْنِ وَدُلِلْتُمْ عَلَى الزَّادِ۔ اَلَا! وَاِنَّ اَخْوَفَ مَا اَخَافُ عَلَيْكُمْ اِثْنَانِ: طُوْلُ الْاَمَلِ وَاِتِّبَاعُ الْهَوٰى......“ (البدایہ والنہایہ ج:۷ ص:۳۰۸)

ترجمہ:......”اور بے شک میں نے نہیں دیکھی جنت جیسی چیز جس کے طلب کرنے والے سو رہے ہوں، اور نہ دوزخ جیسی چیز کہ اس سے بھاگنے والے سو رہے ہوں، اور نہ اس سے

زیادہ کمائی جو آدمی نے کمایا ہو اس دن کے لئے جس میں ذخیرے جمع کئے جائیں گے، جس میں بھید ظاہر کردیئے جائیں گے، اور جس میں تمام بڑی چیزیں جمع کردی جائیں گی، جس کو حق نفع نہ دے باطل اس کو نقصان دیتا ہے اور جس شخص کو ہدایت سیدھا نہ کرسکے اس کو گمراہی کھینچ کر لے جاتی ہے، اور جس کو یقین نفع نہیں دیتا شک اس کو نقصان دیتا ہے، اور جس کو اس کا حاضر نفع نہیں دیتا تو جو چیز اس سے پوشیدہ ہے وہ اس سے زیادہ اندھا ہوگا اور جو چیز کہ اس سے غائب ہے اس کے معاملہ میں زیادہ عاجز ہوگا اور تمہیں کوچ کرنے کا حکم ہوچکا ہے اور توشہ پر تمہاری راہ نمائی کردی گئی ہے اور سب خوفناک چیزیں جن پر میں تمہارے بارے میں ڈرتا ہوں وہ دو ہیں ایک لمبی لمبی امیدیں اور دوسری خواہشات کی اتباع۔''

واقعہ کربلا کی روایات پر اعتماد:

آج میرے ساتھی کہہ رہے تھے کہ تم نے کبھی دس محرم کے بارے میں ذکر نہیں کیا، حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی شہادت کا تذکرہ نہیں کیا۔ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی شہادت یہ تو بہت بڑا سانحہ ہے، بہت بڑا المیہ ہے، لیکن اس کے بارے میں عام طور پر جو روایتیں ذکر کی جاتی ہیں، ان کو قابل اعتماد سمجھنا بڑا مشکل ہے، اس لئے کہ اس زمانے میں اخباری رپورٹر تو ہوتے نہیں تھے، اور یہ خبررساں ایجنسیاں نہیں ہوتی تھیں، بی بی سی کا نمائندہ نہیں ہوتا تھا، وائس آف امریکا اور وائس آف جرمنی کا نمائندہ نہیں ہوتا تھا۔

میدانِ کربلا کے عینی شاہد:

حضرت حسین رضی اللہ عنہ اپنے تمام رفقاء کے ساتھ شہید ہوگئے تھے، ایک حضرت زین العابدین رضی اللہ عنہ اور گھر کی مستورات بچی تھیں، اور حضرت زین العابدین رضی اللہ عنہ نے اس واقعہ کربلا کے بعد زبان بالکل بند کردی تھی، گوشہ نشین ہوگئے تھے۔ اس لئے ان کے حوالے سے کوئی روایت مشکل ہی سے ملے گی۔

واقعہ کربلا کے راویوں کا حال:

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ واقعہ کربلا کی اتنی بڑی جو داستان تصنیف کی گئی ہے، اس کا راوی کون ہے؟ وہ اخباری رپورٹر کون تھا؟ جو ان واقعات کو قلم بند کر رہا تھا۔ ان واقعات کے سننے سے ایسا لگتا ہے کہ جیسے کیمرہ ان کے ساتھ تھا اور فوٹو لے رہے تھے۔ جگہ جگہ یہی یزیدی فوج کے آدمی ہوں گے، جو حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے مقابلے میں آئے تھے، اور ان میں اکثریت اہل کوفہ کی تھی، اور انہی لوگوں نے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو بلایا تھا اور مقصود فتنہ برپا کرنا تھا، بعد میں یہ روایات تصنیف کی گئیں۔ میں پوچھتا ہوں: کیا قاتلینِ حسین کی روایات معتبر ہیں کہ یہ قصہ ہوا تھا؟ یہ لوگ من گھڑت واقعات ذکر کرتے ہیں، خود بھی روتے ہیں اور دوسروں کو بھی رلاتے ہیں، یہ ساری روایات کمرے میں بیٹھ کر تصنیف کی گئی ہیں۔

فتنہ کا معنیٰ:

ایک بات خاص طور سے کہتا ہوں، عربی زبان میں فتنہ کہتے ہیں اس حالت کو جس میں حق و باطل کی کیفیت مشتبہ ہوگئی ہو، پتہ نہ چلتا ہو حق کیا ہے؟ باطل کیا ہے؟ سچ کیا ہے؟ جھوٹ کیا ہے؟

سانحہ مشرقی پاکستان کا پس منظر؟

مشرقی پاکستان کے سانحہ کے جو حالات اخبارات میں چھپتے رہے ہیں،

اب تو روز کے روز اخبار آتا ہے، اور روز کے روز حالات چھپتے ہیں، لیکن وہاں کے واقعات کچھ اور تھے، اور یہاں کچھ اور ذکر کئے جاتے تھے۔ حکمرانوں نے عوام کو حالات سے صحیح طور پر مطلع نہیں ہونے دیا، ایک طرف شیخ مجیب الرحمٰن کو سامنے کھڑا کرلیا اور مشرقی پاکستان والے اس کے ساتھ تھے، دوسری طرف بھٹو صاحب اور ان کی کابینہ تھی، دونوں طرف اس قسم کی خبریں پھیلا کر اشتعال پیدا کیا گیا اور نتیجہ وہ ہوا جو سب کے سامنے آیا، اب بعد میں پتہ چلتا ہے کہ اصل واقعات کیا تھے؟

کراچی کے فسادات کا ذمہ دار کون؟

اسی طرح اب کراچی کے حالات آپ کے سامنے ہیں، یہاں کیا ہو رہا ہے؟ کون قوتیں لڑ رہی ہیں؟ کبھی الزام غریب مولویوں پر دھر دیا جاتا ہے، کبھی کسی پر، اور کبھی کسی پر۔ روزانہ کا اخبار آپ بھی پڑھتے ہیں، میں بھی پڑھتا ہوں، لیکن سچ کیا ہے؟ جھوٹ کیا ہے؟ ظالم کون ہے؟ مظلوم کون ہے؟ کچھ پتہ نہیں چلتا، غبار اتنا اڑادیا گیا ہے کہ کسی کا چہرہ پہچانا ہی نہیں جاتا، اور جب یہ غبار بیٹھے گا، تم دیکھو گے کہ کرنے والوں نے کیا کردیا ہے؟ نعوذ باللہ! ثم نعوذ باللہ! اللہ تعالیٰ وہ روزِ بد نہ لائے۔ تو یہ ایک مثال ہے اس بات کی کہ پروپیگنڈہ کے ذریعہ سے حق و باطل کو اس طرح گڈمڈ کردیا جاتا ہے کہ آدمی کے لئے فیصلہ کرنا مشکل ہوجاتا ہے۔ تو ان واقعات پر تبصرہ کرنے کا کیا نتیجہ ہے؟

اسلامی تاریخ کے بڑے بڑے واقعات اور دس محرم:

اور ایک بات یہ کہ آج دس محرم ہے، اور اتفاق سے آج جمعہ کا دن بھی ہے، جب سے محرم شروع ہوا تھا، اسی وقت سے ڈر رہا تھا کہ اللہ تعالیٰ خیر کرے، جمعہ دس محرم کو آرہا ہے، ہماری بدعملی کی وجہ سے بڑا خطرناک ہے، ہم لوگ تو دس محرم کو صرف حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے حوالے سے پہچانتے ہیں کہ دس محرم کو حضرت حسین رضی اللہ عنہ شہید ہوئے۔

حدیث شریف میں آتا ہے کہ اسلامی تاریخ میں انسانی تاریخ کے تمام بڑے بڑے واقعات اس دس محرم کو ہوئے ہیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے:

”.....قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ خَیْرُ یَوْمٍ طَلَعَتْ عَلَیْہِ الشَّمْسُ یَوْمُ الْجُمُعَۃِ فِیْہِ خُلِقَ اٰدَمُ وَفِیْہِ اُھْبِطَ وَفِیْہِ تِیْبَ عَلَیْہِ وَفِیْہِ مَاتَ وَفِیْہِ تَقُوْمُ السَّاعَۃُ وَمَا مِنْ دَابَّۃٍ اِلَّا وَھِیَ مُصِیْخَۃٌ یَوْمَ الْجُمُعَۃِ مِنْ حِیْنَ تُصْبِحُ حَتّٰی تَطْلُعَ الشَّمْسُ شَفَقًا مِّنَ السَّاعَۃِ اِلَّا الْجِنَّ وَالْاِنْسَ ..... الخ۔“ (مشکوٰۃ ص:۱۲۰)

ترجمہ:......”سب سے افضل دن جمعہ کا دن ہے، اسی میں حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق ہوئی، اور اس میں آسمان سے اتارے گئے اور اسی میں ان کی توبہ منظور ہوئی اور اس میں ان کی موت ہوئی، اور اسی میں قیامت قائم ہوگی، (قیامت کا صور جب پھونکا جائے گا، محرم کی دس تاریخ اور جمعہ کا دن ہوگا)۔ اور جب جمعہ کا دن ہوتا ہے (ان کو یہ تو معلوم نہیں کہ تاریخ کیا ہے) تو تمام چرند پرند نہایت پریشان ہوتے ہیں کہ کہیں آج قیامت تو نہیں آرہی؟“ جب سورج طلوع ہوجاتا ہے اور دن شروع ہوجاتا ہے تو ان کو سکون ہوجاتا ہے کہ آج کا دن خیریت کے ساتھ گزر گیا۔ صرف ایک انسان اور جن غافل ہیں، ان کے علاوہ ساری مخلوق کو پریشانی ہوتی ہے کہ قیامت تو نہیں آرہی؟“

شہادتِ حسینؓ دس محرم کی تاریخ کا پہلا واقعہ نہیں:

تو حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی اس دن شہادت یہ تاریخ کا پہلا واقعہ نہیں ہے، بلکہ کچھ اللہ تعالیٰ کی حکمت ہی ایسی ہے کہ تاریخ کے بڑے بڑے واقعات اسی دن ہوئے ہیں۔

انقلابات کے تین موسم:

میں نے تین چیزوں کو خاص طور پر نوٹ کیا ہے، جہاں تک اپنی عقل کام کرتی ہے:

۱:......ایک تو رمضان المبارک فیصلے لے کر آتا ہے، اب جو وقت گزرتا ہے، عجیب وغریب انقلاب لاتا ہے۔

۲:......ایک موسم حج بڑی عجیب وغریب کیفیات لے کر آتا ہے، جب گزرتا ہے تو عجیب وغریب انقلابات پیدا ہوتے ہیں، اوران کی عملی تکمیل ہوتی ہے۔

۳:......اور ایک دس محرم کہ اس دن سے عظیم واقعات و سانحات کی تاریخ وابستہ ہے اور آئندہ بھی ہولناک مناظر اس دن سے منسلک بتلائے گئے ہیں۔ اس لئے ہمارے لئے دیکھنے کی چیز یہ ہے کہ ہمارے لئے قضاؔ وقدر کے فیصلے کیا ہو رہے ہیں؟

مقصد کی بات:

حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی جانب جو واقعات منسوب کئے گئے ہیں، ان واقعات کو ذکر کر کے رونا اور رلانا اس کا کوئی نتیجہ نہیں ہے، تمہارے مقصد کی بات تو یہ ہے کہ اس دن، اس تاریخ کو تمہارے حق میں کیا فیصلے ہوتے ہیں؟ اور کیا فیصلے ہو رہے ہیں؟ اور انسانی تاریخ کے بارے میں کیا فیصلے کئے جا رہے ہیں؟ اور یہ میں عرض کئے دیتا ہوں کہ تمہارے اعمال جیسے اوپر جائیں گے، ویسے ہی فیصلے اوپر سے نیچے آئیں گے۔

جیسی رعایا ویسے حکمران:

ایک صاحب نے دو دن پہلے خط لکھا کہ کیا یہ صحیح ہے کہ جیسے عوام ہوتی ہے، رعایا ہوتی ہے، ویسے ان پر حکمران مسلط کئے جاتے ہیں؟ میں نے جواب میں لکھا تھا کہ صحیح ہے! قرآن وحدیث سے اس کا ثبوت موجود ہے، آٹھویں پارے میں ہے:

”وَكَذٰلِكَ نُوَلِّيْ بَعْضَ الظّٰلِمِيْنَ بَعْضًا بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ۔“ (الانعام:۱۲۹)

ترجمہ:......”اسی طرح مسلط کیا کرتے ہیں بعض ظالموں کو بعض پر بسبب ان بدعملیوں کے جو وہ کرتے تھے، اور بسبب اس کے جو وہ کماتے تھے۔“

ان کی کمائی کی بدولت جس قسم کے اعمال بندوں کے بگڑتے یا سنورتے ہیں، اس قسم کے حاکم، اللہ تعالیٰ ان پر مسلط کرتے ہیں، ان ظالموں کو ظلم کا مزہ چکھانے کے لئے۔ مشکوٰۃ شریف میں ایک حدیث قدسی ہے:

”اِنَّ اللهَ تَعَالٰى يَقُوْلُ: اَنَا اللهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اَنَا مَالِكُ الْمُلُوْكِ وَمَلِكُ الْمُلُوْكِ، قُلُوْبُ الْمُلُوْكِ فِيْ يَدِيْ، وَاِنَّ الْعِبَادَ اِذَا اَطَاعُوْنِيْ حَوَّلْتُ قُلُوْبَ مُلُوْكِهِمْ عَلَيْهِمْ بِالرَّحْمَةِ وَالرَّأْفَةِ، وَاِنَّ الْعِبَادَ اِذَا عَصَوْنِيْ حَوَّلْتُ قُلُوْبَهُمْ بِالسُّخْطَةِ وَالنِّقْمَةِ فَسَامُوْهُمْ سُوْءَ الْعَذَابِ فَلَا تَشْغَلُوْا اَنْفُسَكُمْ بِالدُّعَاءِ عَلَى الْمُلُوْكِ وَلٰكِنِ اشْغَلُوْا اَنْفُسَكُمْ بِالذِّكْرِ وَالتَّضَرُّعِ كَيْ اَكْفِيَكُمْ۔“ (مشکوٰۃ ص:۳۲۳)

ترجمہ:......میں اللہ ہوں! میرے سوا کوئی معبود نہیں، میں بادشاہوں کا بادشاہ ہوں، بادشاہوں کے قلوب میرے ہاتھ میں ہیں۔ لوگ جب میری اطاعت کرتے ہیں تو بادشاہوں کے

دلوں کو پھیر دیتا ہوں، وہ ان سے شفقت اور نرمی سے پیش آتے ہیں، اور جب بندے میری نافرمانی کرتے ہیں تو بادشاہوں کے دلوں کو سختی اور ظلم کی طرف پھیر دیتا ہوں، پھر لوگ حکمرانوں کو بددعائیں دیتے ہیں۔ اے میرے بندو! تم اپنے حاکموں کو گالیاں نہ دو، تمہارے حاکم اگر ظالم ہیں تو میری طرف التجا کرو تم ٹھیک ہوجاؤ گے، تو تمہارے حاکموں کو بدل دوں گا۔"

اور بیہقی کی روایت میں ہے کہ: "کَمَا تَکُوْنُوْنَ کَذٰلِکَ یُؤَمَّرُ عَلَیْکُمْ۔" (مشکوٰۃ ص:۳۲۳) تم جیسے ہوگے ویسے امیر اور حاکم سپرد کئے جائیں گے، ظالم کو اس کے ظلم کا بدلہ ضرور ملتا ہے۔ اسی طرح ایک اور حدیث شریف میں ہے:

"اِنَّ اللهَ تَعَالٰی لَیُمْلِیَ الظَّالِمَ حَتّٰی اِذَا اَخَذَهٗ لَمْ یَفْلِتْهُ۔" (مشکوٰۃ ص:۴۳۴)

ترجمہ:......"اللہ تعالیٰ ظالم کو ڈھیل دیتے ہیں، یہاں تک کہ جب اس کو پکڑتے ہیں تو پھر اس کو چھوڑتے نہیں ہیں۔"

دیکھنے والوں کو ان پر ترس آتا ہے، لیکن اللہ تعالیٰ کی گرفت سے وہ بچ نہیں سکتے۔

عذابِ الٰہی سے بچاؤ کی صورت:

اصل چیز تو ہمارے لئے لائق توجہ اور لائق اعتماد یہ ہے کہ ہم اپنے اعمال کو ٹھیک کریں، چنانچہ قرآن کریم میں ہے:

"فَلَوْ لَا کَانَتْ قَرْیَةٌ اٰمَنَتْ فَنَفَعَهَآ اِیْمَانُهَآ اِلَّا قَوْمَ یُوْنُسَ، لَمَّآ اٰمَنُوْا کَشَفْنَا عَنْهُمْ عَذَابَ الْخِزْیِ فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا وَمَتَّعْنٰهُمْ اِلٰی حِیْنٍ۔" (یونس:۹۸)

ترجمہ:......''پھر ایسا کیوں نہ ہوا؟ کہ کوئی بستی ایمان لے آئی ہوتی اور اس کے ایمان نے اس کو نفع پہنچایا ہوتا سوائے یونس علیہ السلام کی قوم کے، جب وہ ایمان لے آئے تو ہم نے ان کو دنیا کی زندگی میں نفع پہنچایا، (آیا ہوا عذاب ٹال دیا کیونکہ سچے دل سے مسلمان ہوگئے تھے)۔''

حضرت یونس علیہ السلام تو یہ کہہ کر بستی سے نکل گئے کہ اتنے دن کے بعد تم پر عذاب آجائے گا، کافر مذاق اڑاتے رہے اور حضرت یونس علیہ السلام نے جو وقت مقرر کیا تھا، ہر چند کہ اپنے اجتہاد سے کیا تھا، وحی الٰہی سے نہیں، لیکن اللہ تعالیٰ اپنے نبیوں کی لاج رکھتے ہیں، ان کے منہ سے نکلی ہوئی بات غلط نہیں ہونے دیتے، چنانچہ عین اس دن جس دن حضرت یونس علیہ السلام نے کہا تھا کہ تم پر عذاب آجائے گا، عذاب آیا، جب عذاب کے آثار نمودار ہوئے تو پوری قوم کو اس طرف توجہ ہوئی کہ یہ تو عذابِ الٰہی ہے، حضرت یونس علیہ السلام ٹھیک کہتے تھے، پریشان ہوئے، اپنے بڑے بوڑھوں سے پوچھا، انہوں نے کہا کہ حضرت یونس علیہ السلام کو تلاش کرو، حضرت یونس علیہ السلام بستی سے جاچکے تھے، بالآخر ان بڑے بوڑھوں نے کہا کہ اگر حضرت یونس علیہ السلام نہیں ہیں تو سچی توبہ کرلو! سارے لوگ، کیا مرد کیا عورتیں، کیا بچے، میدان میں نکل گئے اور سب کے حقوق معاف کروائے حتیٰ کہ اگر کسی نے کسی کا شہتیر اپنی چھت میں لگایا ہوا تھا وہ اکھاڑ کر اس کو واپس کردیا، تمام مظالم سے تائب ہوگئے اور حضرت یونس علیہ السلام کے حق میں جو بے ادبیاں کی تھیں، ان سے تائب ہوگئے، سچی توبہ کرلی، اللہ تعالیٰ نے ان کی سچی توبہ قبول فرماتے ہوئے ان سے عذاب ٹال دیا، ''لَمَّآ اٰمَنُوْا كَشَفْنَا عَنْهُمْ عَذَابَ الْخِزْیِ فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا'' جب وہ ایمان لے آئے تو ہم نے ان سے رسوائی کا عذاب ٹال دیا اس دنیا کی زندگی میں۔

قومِ یونس کی سی دانش مندی کی ضرورت ہے:

اے کاش! کہ کراچی والے حضرت یونس علیہ السلام کی قوم جیسی دانش مندی کا مظاہرہ کرتے اور اپنے گناہوں سے تائب ہوجاتے، جس نے جس پر کوئی ظلم و زیادتی کی ہے، اس ظلم و زیادتی سے تائب ہوجائیں اور معافی مانگیں! خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ آج عذاب ٹل سکتا ہے، اللہ تعالیٰ کی عنایت حضرت یونس علیہ السلام کی قوم کے ساتھ تم سے اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ نہیں ہے، ارشاد الٰہی: ”كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ“ کے مصداق تم خیر امت ہو اور خیر رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی خیر الامم ہو۔

توبہ نہ کی تو ہلاک ہوجائیں گے:

لیکن جب توبہ ہی نہ کرو اور اپنی اصلاح ہی نہ کرو، اپنی روش ہی نہ بدلو، تو پھر تم کو تمہارے ہاتھوں سے ہلاک کروائیں گے۔ اللہ تعالیٰ اپنی پناہ میں رکھے، ہمارے اعمال اتنے بگڑ گئے ہیں کہ کسی کی سمجھ میں نہیں آتا اور کسی کی بھی عقل میں نہیں آتا کہ کیا کریں؟ بے نظیر بھٹو کہتی ہے کہ معاملہ میرے قابو سے باہر ہے، اور دوسرے لوگ جو ذمہ دار ہیں وہ سب عاجز آچکے ہیں، کسی کی سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کریں؟ عذابِ الٰہی کے سامنے کسی کی پیش نہیں چلے گی، یہ عذابِ الٰہی ہے!

کراچی عذاب کیوں؟

تم کہو گے کہ عذاب صرف کراچی والوں کے لئے ہے، باقی دنیا بھی تو ایسی ہے؟ تمہیں معلوم نہیں ہے کہ کراچی پاکستان کا دل ہے، دل پر گولی چلادی جائے تو آدمی ختم ہوجاتا ہے، اس پورے ملک کا دوتہائی خرچ یہ تنہا کراچی اٹھا رہا ہے، اور اس

شہر کے بارے میں مشہور تھا کہ بھوکوں، ننگوں کا مائی باپ ہے۔ جس کو روزگار نہیں ملتا تھا، وہ یہاں آجاتا تھا، اللہ تعالیٰ کچھ نہ کچھ روزگار اس کو عطا فرما ہی دیتے، چند ہی سالوں میں اس کی آبادی پچاس لاکھ سے بڑھ کر ایک کروڑ سے اوپر ہوگئی ہے۔

یہ گوشمالی ہے:

لیکن جب کسی کو امن اور عیش پسند نہ آئے اور وہ جامے سے نکل جائے، تو پھر اللہ تعالیٰ تھوڑی سی گوش مالی فرماتے ہیں، تھوڑی سی سزا دیتے ہیں، اور اب یہ سزا شاید ایسی ہوچکی ہے کہ خاکم بدہن! شاید یہ شیاطین مغرب نے ہمارے اس ملک کے توڑنے کا فیصلہ کرلیا ہے اور تمہارے ہاتھوں سے کروا رہے ہیں، کون سنتا ہے بول درویش! مشہور ہے درویش کی بات کون سنتا ہے؟

اس بندر بانٹ کا نتیجہ؟

یہ پیپلز پارٹی والے ہوں، ایم کیو ایم والے ہوں یا حقیقی والے ہوں یا مجازی والے ہوں یا اور کوئی دوسرے تیسرے ہوں، میں آج انتباہ کرتا ہوں سب کو کہ تمہاری اس بندر بانٹ کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ یہ روٹی تمہارے ہاتھ سے نکل جائے گی، تم آپس میں لڑتے رہو گے، قربانیاں تمہاری ہوئیں، ڈیڑھ سال میں سولہ سو آدمی قتل ہوچکے ہیں، یہ اخباری رپورٹ ہے، ورنہ مرنے والوں کی تعداد اس سے کہیں زیادہ ہے، کتنے بھوکے مرے، لوگوں کو کتنی اذیتیں پہنچائی گئیں، کوئی حد ہے؟

کسی کو کچھ نہ ملے گا:

تم لڑتے رہو، ایک دوسرے کو مارتے رہو اور اپنے حقوق کی جنگ لڑتے رہو، نتیجہ یہ ہوگا کہ کسی کو بھی کچھ نہیں ملے گا، بلکہ کوئی اور لے کر چلا جائے گا، سازشوں کے پلان تیار ہوچکے ہیں، منصوبے بنائے جاچکے ہیں، نقشے مرتب ہوچکے ہیں، اور تمہیں دست وگریباں کردیا گیا ہے کہ تم آپس میں لڑو۔

ملک ہوگا تو حقوق ملیں گے:

میں کہتا ہوں کہ ملک ہوگا تو تمہیں حقوق بھی ملیں گے، زیادہ نہ ملے تھوڑے تو مل ہی جائیں گے، چلو نہ ملے، نہ سہی، ملک تو رہے گا، خدا کے لئے اس لڑائی کو بند کرلو، یہ جتنے متعلقہ طبقے ہیں، میں ایک ایک فرد سے کہتا ہوں، حکومت سے لے کر نیچے والوں تک، ایک وقت آئے گا تم کہو گے کہ ٹھیک کہتا تھا، آج شاید تم لوگوں کو میری بات بری لگے، شاید تمہاری سمجھ میں نہ آئے، کل کو تم بھی کہو گے: ’’قلندر ہرچہ گوید دیدہ گوید!‘‘ قلندر جو کچھ کہتا تھا، ٹھیک کہتا تھا۔

بھائی بھائی بن جاؤ:

خدا کے لئے سارے کے سارے تائب ہوجاؤ اور آپس میں ایک دوسرے سے جو زیادتیاں ہوئی ہیں، معاف کروالو، آج بھی یہ عذابِ الٰہی ٹل سکتا ہے، ورنہ کوئی تدبیر، کوئی قوت، کوئی بھی پولیس، کوئی بھی فوج اس عذاب کو نہیں ٹال سکتی، صرف ایک ہی راستہ ہے اور یہ تمہیں سمجھ میں نہیں آتا، اللہ کرے کہ یہ تمہاری سمجھ میں آجائے۔ اقتدار کی ہوس یا حقوق کی جنگ یا بڑے چھوٹوں کا ہوّا کھڑا کیا ہوا ہے، اس کو چھوڑ دو خدا کے لئے! جس نے کسی پر زیادتی کی ہے، ظالم معافی مانگ لیں مظلوم سے، اور آپس میں گلے مل جاؤ، بھائی بھائی بن جاؤ اور اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں تائب ہوجاؤ، یہ عذابِ الٰہی ٹل جائے گا۔

اشتعال دلانا آسان ہے، آگ بجھانا مشکل ہے:

تو ہمارے لئے تو اس تاریخ کے آنے سے یہ عبرت ہے کہ ہم اپنے اعمال کو دیکھیں، انفرادی اعمال کو بھی اور اجتماعی اعمال کو بھی، جذبات کو اشتعال دلانا بڑا آسان ہے، لیکن لگی ہوئی آگ کو بجھانا بڑا مشکل ہے، اپنی جان پر کھیل کر خدا کے

لئے اس عذاب کو، اس آگ کو بجھاؤ! مزید تیل چھڑکنے کی کوشش نہ کرو! تو دوستوں کی فرمائش پر اتنے کلمات کہتا ہوں، اس سے زیادہ نہیں، یہ بھی میں نے دکھی دل کے ساتھ کہہ دیئے ہیں، ورنہ سنتا کوئی نہیں ہے۔

ہم کہتے ہیں پاکستان نہ توڑو:

میرے حضرت امیر شریعت سید عطاءُ اللہ شاہ بخاری نور اللہ مرقدہٗ منبر پر بیٹھ کر فرماتے تھے، بھرے جلسے میں تقریباً ایک لاکھ کے جلسے میں کہ سنو! آج ہم کہتے ہیں کہ نہ بناؤ پاکستان، کانگریسی کہہ دو، احراری کہہ دو، تم جو گالی دینا چاہتے ہو دے دو، لیکن پاکستان نہ بناؤ۔ ان کو سب کچھ نظر آرہا تھا، ان کو اللہ تعالیٰ نے چشمِ بصیرت عطا فرمائی تھی، ارشاد فرمایا تھا کہ سن لو! آج ہم کہتے ہیں کہ نہ بناؤ، تم ہماری نہیں سنتے ہو۔ کیونکہ اس وقت ہم نعرہ لگاتے تھے ”لے کر رہیں گے پاکستان، دینا پڑے گا پاکستان“ وغیرہ، علمأ کو گالیاں دی جاتی تھیں، یہ دشمن ہیں، ہندوؤں کے ایجنٹ ہیں، نہ معلوم جتنی گالیاں تمہاری لغت میں تھیں وہ بھی، اور جو تم ایجاد کرسکتے تھے وہ بھی تم نے دے ڈالیں، ان کا قصور صرف اتنا ہی تھا کہ وہ کہتے تھے کہ یہ تم سے نہیں سنبھلے گا، خدا کے لئے نہ بناؤ، خیر بن گیا، یا بنالیا۔ تو حضرتؒ نے فرمایا تھا کہ ایک وقت آئے گا ہم کہیں گے نہ توڑو! خدا کے لئے نہ توڑو! تم ہماری یہ باتیں نہیں سنو گے، آج ہم کہہ رہے ہیں نہ بناؤ، تم ہماری نہیں مانتے، ایک وقت آئے گا ہم کہیں گے خدا کے لئے اس کو نہ توڑو! تم ہماری نہیں سنو گے۔

تم نے سقوطِ ڈھاکہ کے وقت ہماری نہ سنی:

۱۹۷۱ء میں ہم نے کہا تھا کہ خدا کے لئے نہ توڑو! تم نے ہماری نہیں سنی، آج پچیس سال کے بعد پھر وہی واقعہ پیش آرہا ہے، تم ہماری نہیں سنتے ہو، اپنی خواہشات کی پٹی تمہاری آنکھوں پر بندھی ہوئی ہے، تمہیں نظر ہی نہیں آرہا۔

سلگتی آگ نظر آ رہی ہے:

الحمدللہ ہماری کوئی خواہش نہیں، ہم اپنی خواہشات کے ساتھ بات نہیں کرتے، اپنے کسی مفاد کے لئے بات نہیں کرتے، ہمیں آگ لگی ہوئی نظر آ رہی ہے، ابھی تم دیکھو گے کہ کیا بنے گا؟

پچھلے دنوں میں معصوم بچوں کا دودھ نہیں ملا، ایسا دل جلا، دکان پر آیا ہوا دودھ یا تو خراب کروادیا گیا یا گرادیا گیا، تمہاری دودھ کی دکانوں پر دودھ نہیں ملے گا تو بچے کہاں سے دودھ پئیں گے؟ تم بیماروں اور بچوں کا تو کچھ خیال کرو! خدا کے لئے اس سے باز آجاؤ! اس کو نہ توڑو! توڑنے والے تمہارے ہاتھ سے تڑوا رہے ہیں، اور اپنے نقشے بنا رہے ہیں، تمہیں پتہ نہیں ہے، تم ان چھوٹی چیزوں پر لڑ رہے ہو، روٹی ہے، میرا مالک دیتا ہی رہے گا، کسی کو تھوڑی مل جائے گی، کسی کو زیادہ مل جائے گی، ایک دوسرے سے مظالم کی معافی لے لو، ایک دوسرے کو معاف کردو، اور حق و انصاف پر قائم ہوجاؤ، اور اللہ کی بارگاہ میں توبہ کرلو، آج عذاب ٹل جائے گا، اور اگر ایسا نہیں کروگے تو اس کو کوئی نہیں ٹال سکتا۔

دوزخ سے بھاگنے والے سو رہے ہیں:

امیر المؤمنین حضرت علی کرم اللہ وجہہ فرماتے ہیں کہ میں نے جنت جیسی کوئی چیز نہیں دیکھی جس کے طلب کرنے والے سو رہے ہوں اور دوزخ جیسی کوئی چیز نہیں دیکھی، جس سے بھاگنے والے سو رہے ہوں۔ یہ الفاظ تو حدیث نبوی کے ہیں، حضرت امیر المؤمنین نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظ نقل کئے ہیں۔

سب سے بڑی کمائی؟

لیکن ایک تیسرا فقرہ ساتھ ملایا، وہ ان کا اپنا ہے، وہ حدیث میں نہیں آیا کہ میں نے کسی کو اس سے زیادہ کمائی کرنے والا نہیں دیکھا جو شخص کہ کوئی چیز ایسے دن

کے لئے کمالے جس میں ذخائر جمع کئے جائیں گے، جس میں سرائر یعنی بھید کھول دیئے جائیں گے، اور جس میں تمام کبائر جمع کردیئے جائیں گے۔ مطلب یہ کہ کسی نے آخرت کے لئے کوئی چیز کمالی تو واللہ! اس سے بڑی کوئی کمائی کسی کی نہیں ہے، سب سے بڑی کمائی یہ ہے کہ کوئی آدمی آخرت کے لئے چاہے تھوڑی سی چیز اس نے کمائی ہو، آخرت کے لئے کوئی چیز کمالے۔

اشراق کا ثواب:

ایک صحابی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کہنے لگے: یا رسول اللہ! خیبر کے فتح ہونے کے بعد وہاں چیزوں کی خرید وفروخت کا بازار لگ گیا، جس کے حصے میں جو چیزیں آئیں اور اس کی ضرورت سے زائد تھیں تو اس نے بیچ دیں، اور کسی نے ضرورت کی چیز خرید لی تو میں اس سوداگری میں مشغول ہوگیا (جیسے کہ میمن لوگ سوداگر ہوتے ہیں) اس سے بڑا نفع کمایا۔ آج ایک دن میں میں نے بہت ہی نفع کمایا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کتنا کمالیا؟ معلوم نہیں مجھے اس وقت یاد نہیں رہا، غالباً اس صحابی نے کہا تین سو درہم کمالئے۔ کہنے لگا: اے اللہ کے رسول! ایک سے چیز لیتا تھا، دوسرے کو بیچ دیتا تھا، ایک سے لی، دوسرے کو بیچ دی۔ حدیث شریف میں ہے کہ اس پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: کیا میں تجھے اس سے زیادہ نفع بخش چیز نہ بتلاؤں؟ اس نے کہا: ضرور! پھر فرمایا:

”قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: مَنْ قَعَدَ فِيْ مُصَلَّاهُ حِيْنَ يَنْصَرِفُ مِنْ صَلٰوةِ الصُّبْحِ حَتّٰى يُسَبِّحَ رَكْعَتَيِ الضُّحٰى لَا يَقُوْلُ اِلَّا خَيْرًا غُفِرَ لَهٗ خَطَايَاهُ وَاِنْ كَانَتْ اَكْثَرَ مِنْ زَبَدِ الْبَحْرِ.“ (مشکوٰۃ ص:۱۱۶)

ترجمہ:......”آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر

کوئی شخص فجر کی نماز کے بعد وہیں بیٹھا رہے، اللہ تعالیٰ کا ذکر کرتا رہے، یہاں تک کہ اشراق کا وقت ہوجائے، اشراق پڑھ کر اٹھے تو اس کے تمام گناہ معاف کردیئے جاتے ہیں، چاہے سمندر کی جھاگ سے زیادہ ہوں۔‘‘

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اگر تو فجر کی نماز کے بعد وہیں بیٹھا رہتا، اللہ تعالیٰ کا ذکر کرتا رہتا، یہاں تک کہ اشراق کا وقت ہوجاتا، اشراق پڑھ کر اٹھتا تو تیری اس کمائی سے زیادہ تھا۔

قرآن کی دو آیتوں کا ثواب:

ایک حدیث شریف میں فرمایا:

’’عَنْ عُقْبَةَ بْنِ عَامِرٍ رَضِیَ اللهُ عَنْهُ قَالَ: خَرَجَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّی اللهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ وَنَحْنُ فِی الصُّفَّةِ، فَقَالَ: اَیُّكُمْ یُحِبُّ اَنْ یَّغْدُوَ كُلَّ یَوْمٍ اِلٰی بُطْحَانَ اَوِ الْعَقِیْقِ، فَیَأْتِیْ بِنَاقَتَیْنِ كَوْمَاوَیْنِ فِیْ غَیْرِ اِثْمٍ وَلَا قَطْعِ رَحِمٍ؟ فَقُلْنَا: یَا رَسُوْلَ اللهِ! كُلُّنَا نُحِبُّ ذَالِكَ! قَالَ: اَفَلَا یَغْدُوْ اَحَدُكُمْ اِلَی الْمَسْجِدِ فَیُعَلِّمَ اَوْ یَقْرَءَ اٰیَتَیْنِ مِنْ كِتَابِ اللهِ خَیْرٌ لَّهٗ مِنْ نَاقَتَیْنِ، وَثَلٰثٌ خَیْرٌ لَّهٗ مِنْ ثَلٰثٍ، وَاَرْبَعٌ خَیْرٌ لَّهٗ مِنْ اَرْبَعٍ، وَمِنْ اَعْدَادِهِنَّ مِنَ الْاِبِلِ۔‘‘ (مشکوٰۃ ص:۱۸۳)

ترجمہ:......’’کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم گھر سے باہر تشریف لائے، ہم صفہ میں تھے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کیا تم میں سے کوئی شخص اس بات کو پسند کرتا ہے کہ بطحان یا عقیق جنگل میں چلا جائے اور وہاں سے بغیر گناہ اور غصب کے

اور بغیر ظلم کے دو عمدہ اونٹ لے آئے اور نہ کسی پر ظلم ہوا ہو۔ صحابہ کرامؓ نے کہا: یا رسول اللہ! یہ تو ہر شخص چاہے گا۔ فرمایا: مسجد میں چلے جاؤ، دو آیت قرآن کریم کی سیکھ لو یا پڑھ لو یہ تمہارے لئے ان دو اونٹنیوں سے بہتر ہے، تین آیت کا سیکھنا یا پڑھنا تین ناقہ سے بہتر اور چار آیت کا سیکھنا یا پڑھنا چار اونٹنیوں سے بہتر اسی طرح اور ایسے اتنے اونٹوں سے بہتر۔''

آخرت کی کمائی کی اہمیت:

آخرت کی کمائی کو ہم اہمیت نہیں دیتے، دنیا کی کمائی کو اہمیت دیتے ہیں، آج اگر کسی کو ایک ہزار روپے بغیر کسی تاب کے، بغیر کسی گناہ کے مل جائیں تو وہ خوش ہوگا، خوش ہونا چاہئے، حلال کا پیسہ ہے، حلال طریقہ سے مل جائے تو بہت خوش ہوگا، لیکن دو رکعت پڑھنے کی توفیق ہوگئی تو اس پر خوش نہیں، اس پر اتنی خوشی نہیں ہوتی، اس حقیقت کو امیرالمؤمنین سمجھا رہے ہیں کہ میں نے کوئی کمانے والا اس سے زیادہ کوئی کمانے والا، اس سے زیادہ نفع اور اس سے زیادہ بہتر کمائی کرنے والا نہیں دیکھا جو شخص کہ اس دن کے لئے کچھ کمالے، تھوڑی سی چیز ہی کمالے، جو تمہیں کل قیامت کے دن کام دے، جس دن کہ تمام ذخائر جمع کر دیئے جائیں گے، آنجناب کی اتنی زندگی ہوئی اور جناب نے اتنا کل ذخیرہ یہاں جمع کروایا ہے، آپ کا اکاؤنٹ اتنا ہے، اور دل کے تمام کے تمام بھید، اندر کی نیتیں اور اندر کے ارادے، اندر جو کچھ چھپا ہوا ہے، سب باہر کر دیئے جائیں گے، جیسے اسکرین میں نظر آتے ہیں، اعضائ نظر آتے ہیں، اندر کی نیتیں نظر آنے لگیں گی، اور اس میں تمام کبائر جمع ہو جائیں گے، آج تو ہم نے کام کیا ہے، کرکے بھول گئے، لیکن وہ دن ہوگا کہ زندگی کے تمام کے تمام کبائر ہمارے سامنے آجائیں گے، اکٹھے کر دیئے جائیں گے، اور وہ نقشہ دکھا دیا جائے گا کہ

مکر نہ سکیں، اس دن کی کمائی کے لئے کوئی چیز کس نے کمائی؟ اس دن کام دینے والی کوئی نیکی کمائی تو وہ بہت بڑا کمانے والا ہے، اس سے زیادہ کمانے والا میں نے کسی کو نہیں دیکھا۔

حق نفع نہ دے تو باطل نقصان دے گا:

حضرت علی کرم اللہ وجہہ فرماتے ہیں کہ بات یہ ہے کہ جس شخص کو حق نفع نہ دے تو باطل نقصان دیتا ہے۔ دو ہی صورتیں ہیں، یا آپ حق پر ہوں گے یا باطل پر ہوں گے، اگر حق پر ہیں، حق آپ کو نفع پہنچا رہا ہے تو مبارک ہو، ورنہ یہ یقین رکھئے کہ باطل کو اختیار کرنے کے بعد آپ نقصان سے نہیں بچ سکتے، اور جس شخص کو ہدایت سیدھا نہ کرسکے، اس کو گمراہی کھینچ کر لے جاتی ہے۔ ہدایت اور گمراہی یہ دونوں بھی متقابل ہیں۔ سورۂ فاتحہ میں فرمایا: ”اِهۡدِنَا الصِّرَاطَ الۡمُسۡتَقِيۡمَ“ اللہ تعالیٰ سے مانگی ہدایت کہ ہمیں ہدایت دے صراط مستقیم کی، ”صِرَاطَ الَّذِيۡنَ اَنۡعَمۡتَ عَلَيۡهِمۡ“ راستہ ان لوگوں کا جن پر آپ نے انعام فرمایا اور یہ چار فریق ہیں: نبیین، صدیقین، شہدا اور صالحین۔ بہت ہی مبارک ہے وہ بندہ جس کو ان کے راستے پر چلنے کی توفیق ہوگئی، یہ اللہ تعالیٰ کے انعام یافتہ بندے ہیں۔ ”غَيۡرِ الۡمَغۡضُوۡبِ عَلَيۡهِمۡ وَلَا الضَّآلِّيۡنَ۔“ نہ ان پر غضب ہوا اور نہ وہ گمراہ ہوئے۔ جن پر غضب ہوا وہ یہودی ہیں، اور جو گمراہ ہوئے وہ نصرانی ہیں۔ یہ گمراہی کا راستہ ہے، آپ یا ہدایت پر ہیں یا گمراہی پر ہیں، جس شخص کو ہدایت سیدھے راستے پر نہیں چلاتی، گمراہی اس کو کھینچ کے لے جاتی ہے۔ اور جس کو یقین نفع نہیں پہنچاتا، شک اور تردد اس کو نقصان پہنچاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی ارشاد فرمائی ہوئی تمام باتیں برحق ہیں، ہمارا ان پر ایمان و یقین ہے، ہم نے چونکہ کلمہ پڑھا ہے: لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ اس لئے ہمیں، اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی فرمائی ہوئی ایک ایک بات پر

یقین ہے، اور اتنا یقین مؤمن کو ہونا چاہئے۔ چنانچہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ فرمایا کرتے تھے کہ اگر غیب کا پردہ ہٹادیا جائے اور تمام رکاوٹیں ہٹادی جائیں تو میرے یقین میں کوئی اضافہ نہیں ہوگا، کیونکہ مجھے آج بھی اتنا ہی یقین ہے جتنا مشاہدہ سے ہوگا۔

ما بعد الموت کا یقین:

جنت اور دوزخ کی بات سنتے ہو، عذاب قبر کی بات سنتے ہو اور دوسرے تمام حقائق غیبی کی بات سنتے ہو، تو آج بھی اتنا ہی یقین ہونا چاہئے کہ گویا جنت ہمارے سامنے اپنی تمام دلفریبیوں کے ساتھ حاضر ہے، دوزخ کی بات سنتے ہیں تو اتنا یقین ہونا چاہئے کہ گویا دوزخ کو آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں، اس کے عذاب کو دیکھ رہے ہیں، قبر کی بات سنتے ہیں تو وہاں کے بچھو اور سانپ گویا کہ ہمارے سامنے پھر رہے ہیں، اتنا یقین ہونا چاہئے۔ اور یقین سے مقصود یہ ہے کہ اپنی زندگی کو اس یقین کے مطابق ڈھالو، اپنی زندگی کو یقین کے مطابق بناؤ۔

تردد کا نقصان:

حضرت فرماتے ہیں کہ جس شخص کو یقین نفع نہیں دیتا، شک اس کو نقصان دیتا ہے۔ اگر ایک بات میں بھی تردد کیا کہ پتہ نہیں ٹھیک ہے کہ نہیں؟ پٹڑی سے اتر گیا، نہ اس کے کلمے کا اعتبار، نہ اس کے حج وزکوٰۃ کا، اور نہ اس کی نماز کا، نہ صدقہ و خیرات کا اعتبار، ایک بات میں بھی شک وتردد ہوجائے جو بات کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائی ہے، ہلاک ہوگیا۔ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی تمام باتوں کو یقین کے ساتھ سمجھو اور یقین کو دل میں بٹھاؤ اور اس یقین کا استحضار کرو اور اس یقین کے ساتھ اپنی زندگی کو بناؤ، ورنہ یہ شک وارتیاب تمہیں نقصان دے گا۔

ہمارے یقین کی کمزوری:

قرآن کریم میں کافروں کا مقولہ اللہ تعالیٰ نے نقل کیا ہے کہ:
”اِنْ نَّظُنُّ اِلَّا ظَنًّا وَّمَا نَحْنُ بِمُسْتَيْقِنِيْنَ۔“ (الجاثیہ:۳۲) کچھ کچھ خیال تو ہم بھی رکھتے ہیں، یہ جو جنت، دوزخ کی بات کرتے ہیں، آخرت کی بات کرتے ہیں، کچھ کچھ خیال تو ہمیں بھی آتا ہے، لیکن ہمیں یقین نہیں آتا، یقین ہمیں نہیں ہے۔ مسلمان بھی ان باتوں کو سنتا ہے، تو آج کچھ وہی کیفیت ہوگئی ہے، اللہ تعالیٰ ہمیں معاف فرمائے، یقین اتنا کمزور ہوگیا ہے کہ کچھ کچھ خیال تو ہمیں بھی آتا ہے کہ شاید ہونے والا ہوگا ایسا، لیکن یقین نہیں آتا، کوئی دجال آکر کہہ دے تمہارے سامنے کہ نہیں! مولویوں نے ایسے ہی باتیں بنائی ہوئی ہیں، تم کہتے ہو کہ ٹھیک کہتا ہے، نعوذ باللہ! ثم نعوذ باللہ!

حاضر سے عبرت نہیں تو پوشیدہ سے کیسے ہوگی؟

اور فرماتے ہیں کہ جس کو اس کا حاضر نفع نہیں دیتا تو جو چیز اس سے پوشیدہ ہے، وہ اس سے زیادہ اندھا ہوگا، اور جو چیز کہ اس سے غائب ہے اس کے معاملہ میں زیادہ عاجز ہوگا، جب تم سامنے کے واقعات کو دیکھ کر عبرت نہیں پکڑتے تو جو چیز تمہارے سامنے نہیں ان سے کیسے عبرت پکڑوگے؟ بیمار پڑتے ہیں، ایک بے بسی کا تماشا نظر آتا ہے، پھر عبرت نہیں اور تکلیفیں آتی ہیں، مصائب آتے ہیں، پھر عبرت نہیں، اور پریشانیاں آتی ہیں، عذاب آتے ہیں، ان سے عبرت نہیں، جب تمہیں سامنے کی چیزوں سے عبرت نہیں، تو جو چیزیں تمہاری نظر سے غائب ہیں، ان کو سن کر تمہیں کیسے عبرت ہوگی؟

کوچ کا نقارہ بج چکا!

اور ارشاد فرمایا کہ دیکھو تمہیں کوچ کرنے کا حکم ہوچکا ہے، یعنی کوچ کا نقارہ بجایا جاچکا ہے۔ پرانے زمانے میں جب بہت بڑا قافلہ چلتا تو نقارہ بجاتے تھے،

مطلب یہ ہوتا تھا کہ چلو بھئی اپنا اپنا سامان باندھو اور چلو، اب اتنے بڑے قافلے کے چلنے میں بھی دیر لگتی ہے، ایک دم سے تو سارے لوگ نہیں چل پڑتے، اور بھئی اپنا سامانِ سفر بھی ساتھ لے جاؤ، جتنا تمہاری ضرورت کا ہے، سامان سفر کو زاد کہتے ہیں، اب منیٰ سے عرفات میں جاتے ہیں، عرفات ایک دن ٹھہرنا ہوتا ہے، اسی دن شام کو غروب کے بعد مزدلفہ آجاتے ہیں، مزدلفہ رات گزار کر پھر منیٰ آگئے، تو حاجیوں کا قافلہ بیس لاکھ ہو، تیس لاکھ کا ہو منیٰ سے عرفات کو چلتا ہے، بہت رش ہوتا ہے، چلتے چلتے بھی دیر ہوجاتی ہے، لیکن کوچ کا نقارہ بج چکا ہے کہ چلنا ہے بھئی کیونکہ اگر آج عرفات کے میدان میں نہیں پہنچے تو حج فوت ہوجائے گا اور حج نہیں ملے گا، جیسا کیسا کرکے آدمی پہنچتا ہے اور وہاں سے پھر شام کو چلنا ہے۔

تو حضرت امیرالمؤمنینؓ فرماتے ہیں تمہیں کوچ کا حکم کیا جاچکا ہے، اور اس کا نقارہ بجایا جاچکا ہے کہ چلو بھئی آخرت کی طرف چلو، اور تمہاری راہنمائی کردی گئی ہے کہ یہ توشہ تمہیں ساتھ لے کر جانا ہے، تم تو سامان سمیٹنے کی کرو، میاں! اپنا سامان سمیٹنے کی کرو، محاورے کی زبان میں بوریا بستر گول کرنے کی کوشش کرو، اور دیکھ لو کہ تمہیں ان ان چیزوں کی ضرورت پیش آجائے گی، جلدی جلدی لے لو۔

سب سے خطرناک چیزیں؟

اس کے بعد فرمایا کہ سنو! سب سے زیادہ خطرناک چیز میرے نزدیک تمہارے حق میں دو ہیں: لمبی لمبی امیدیں اور خواہشات کی پیروی۔ دنیا کی حرص میں مبتلا ہوگئے، کوچ کو بھول گئے اور یہاں سے بڑی بڑی، لمبی لمبی امیدیں وابستہ کرلیں تو اگلے جہاں کے لئے اور اپنے سفر کے لئے توشہ لینا یاد نہیں رہا، یہاں کے معاملات میں ایسے الجھ گئے۔ بس اس کو پھر ذکر کروں گا۔

وآخر دعوانا ان الحمدللہ رب العالمین